ادبی اور قومی تذکرے

کشن پرشاد کول

پبلیشر:-

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڈھ

سنہ ۱۹۵۱ء

قیمت ۶/۸

طباعت زیر اہتمام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

تعداد طبع ۱۰۰۰

مطبع نعمانی دہلی

فہرست مضامین

ادبی

قومی

پیش لفظ

اس جلد میں دو قسم کے تذکرے ہیں۔ ایک ادبی اور دوسرے قومی۔ ان میں سے کچھ نئے ہیں اور کچھ پرانے۔ ان کے انتخاب میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یعنی چند تو ایسے مسئلوں کے تذکرے ہیں۔ جن کا ہمیں آئے دن سامنا رہتا ہے اور جو ہر کس و ناکس کی زبان پر چڑھے رہتے ہیں لیکن جن گتھیوں کو ہم ابھی تک سلجھا نہیں سکے ہیں چند ایسے ہیں کہ جن کا تعلق ہماری قومی زندگی کی نشو و نما سے ایک عرصہ دراز سے چلا آتا ہے اور ابھی کافی عرصہ تک چلا جاتا رہے گا۔ یہ محض وقتی نہیں بلکہ ہماری زندگی کی تعمیری اور بنیادی ضرورتوں سے وابستہ ہیں کہ جن پر توجہ دینا ہمارے لئے لازمی ہے۔

ان میں سے دو مضمون ارباب ذوق کی مخصوص مجلسوں میں پیش کیے گئے تھے۔ اور پھر رسالوں میں شائع ہوئے۔ دو آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن سے نشر ہوئے اور "ہماری زبان" اور "قومی آواز" میں شائع ہوئے۔ "راجہ رام موہن رائے" "سوامی دیانند سرستی" اور "رشی رانا ڈے" والے مضمون رسالہ "زمانہ" میں شائع ہوئے۔ "مہاتما ریلو دیو شنری کے روپ میں" "اطلاعات لکھنؤ" کے گاندھی جینتی نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔ اور "دیر و حرم کے قصّے"، "صداقت لکھنؤ" کے لئے "ہمارا پرانا اور نیا کلچر"، "لکھنؤ کا ایک لطیفہ اور ابیلار

ایلوئی''، کے خطوط رسالہ "اردو دہلی" میں شائع ہوئے۔ "سر سید احمد خاں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" اور "اکبر الہ آبادی اور اُن کی شاعری" کے تذکرے اسی سال لکھے گئے ہیں اور ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ گو آخر الذکر کے "علی گڑھ اردو میگزین" کے "اکبر نمبر" میں عنقریب شائع ہونے کی اُمید ہے۔ "نیا ادب" رسالہ "ایشیا"، بمبئی کی دو اشاعتوں میں نکلا تھا۔

ان تذکروں کے یہاں پیش کرنے کا مقصد و غرض صرف اتنی ہے کہ ناظرین کو اپنی دماغی اُلجھنوں اور کاوشوں سے یکسوئی حاصل کرنے میں شاید ایک حد تک مدد ملے اور احباب اپنے ادبی ذوق کی ان سے کچھ تسکین پاسکیں و بس۔

کشن پرشاد کول

لکھنؤ۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۰ء

ہندی - اُردو یا ہندستانی

ہندستانی زبان کے کنونشن کی استقبالیہ یا سواگت کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے میں آپ بھائیوں کا جو دور دراز کے سفر کی تکلیفیں اُٹھا کر آج ہمارے یہاں شریک ہونے آئے ہیں، لکھنؤ نواسیوں کی طرف سے سواگت کرتا ہوں۔ جہاں مجھے آپ کے خیر مقدم کرنے کی خوشی حاصل ہے وہیں اس بات کی شرمندگی بھی ہے کہ کمیٹی آپ کے ٹھیرانے، رہنے اور کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں کر سکی اور مہمان داری و خاطر تواضع کا وہ فرض نہیں ادا کر سکی جو اس پر واجب تھا۔ مکانوں اور نوکروں کا نہ ملنا۔ کھانے پینے اور تمام چیزوں کی بیحد مہنگائی اور اسی کے ساتھ پھر پیسے کی کمی ہمارا عذر ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس کے لئے ہمیں معاف کریں گے۔ ہمارے اس کنونشن کا لکھنؤ میں ہونا کچھ معنی رکھتا ہے یعنی اسے لکھنؤ ہی میں ہونا چاہیئے تھا اور اچھا ہوا کہ لکھنؤ میں ہوا۔ ہندستانی زبان اس پانچ سو برس پرانے زمانے کی جیتی جاگتی یادگار ہے کہ جب پہلے پہل زندگی کی ضرورتوں کی مجبوریوں نے ہندو مسلمانوں کے میل جول اور اپنایت کی شاہی درباروں میں نہیں بلکہ فوج سے

لہ یہ ایڈریس چیرمین استقبالیہ کمیٹی کی حیثیت سے ہندستانی زبان کے کنونشن ۱۹۴۶ء کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔

لشکر، گاؤں، شہروں اور ہاٹ بازاروں میں گہری بنیاد ڈالی تھی،
اور جسے زندگی کے مکروہ حادثے اور خونی وارداتیں بھی جو زندگی میں
ہمیشہ پیش آیا کرتی ہیں مٹا نہیں سکیں۔ خاص کر ہمارا لکھنؤ اس میل جول، رواداری
اور اپنایت کا بڑا اچھا نمونہ ہے پچھلے برس آپس کی نفرت، دشمنی،
خانہ جنگی و خوں ریزی کا جو بڑا بھاری طوفان ہمارے دیس میں اُٹھا
تھا اور خون خرابے کی جو آگ اس ملک میں لگی تھی اُس کی یاد سے آج بھی
دل دہلتے ہیں۔ اس نے لاکھوں کے گھر خاک کر دئیے اور اس خاک میں
اب بھی کچھ چنگاریاں دکھائی دیتی ہیں لیکن میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں یہ فخر لکھنؤ ہی کو حاصل
ہے کہ جس وقت اس آگ کے شعلے ہمارے چاروں طرف سے
اُٹھ رہے تھے اور اس کی جھلس اور تپش نہ صرف ہمارے بدن
بلکہ روح اور آتما کو بھی کھلائے دیتی تھی۔ ہمارے میل جول
رواداری اور اپنایت میں ایک دن کے لئے بھی فرق نہ پڑا
اور ہمارے شہر میں آج تک اس ہنگامے میں کسی ہندو یا مسلمان
کا بال بیکا نہ ہوا۔ میں اس سچی رواداری، اپنایت اور پیار و اخلاص
کا نذرانہ لکھنؤ نواسیوں کی طرف سے آپ کے سامنے پیش کرتا
ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ نہ صرف اسے قبول کریں گے بلکہ
اس کی قدر کریں گے۔ اس لحاظ سے بھی ہمارے اس کنونشن کا لکھنؤ
میں ہونا بہت کچھ معنی رکھتا ہے کہ اس سیدھی سادی ہندوستانی زبان
کو جس نے شاہی لشکر اور ہمارے ہاٹ بازاروں میں جنم لیا۔ دکن
پہونچ کر جو سادھو سنتوں اور درویش قلندروں کی گودوں

میں پلی۔ دلی واپس بلا کر جسے پہلے مظہر جان جاناں نے کنگھی چوٹی سے سنوار کر اور پھر ناسخ نے لکھنؤ میں اس کے سولہ سنگھار کر کے دلہن بنایا اور راج محلوں اور درباروں میں رانی بنا کر یا آپ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ باندی بنا کر رکھا جو ہندی۔ ہندوی۔ ریختہ اور اردو کے ناموں سے پکاری گئی اور جس نے اُردوئے مُعلّٰی کا خطاب پایا۔ آج پھر لکھنؤ میں ہی چولا بدل کر اپنے اصلی ہندستانی روپ میں آپ کے سامنے آرہی ہے۔ راج محلوں اور درباروں سے نکل کر اس جمہوری دور میں جنتا کا ساتھ دیتی اور اس دیس کے عام لوگوں کی زبان ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ نہ معلوم کتنی سلطنتیں اور حکومتیں بنیں اور بگڑیں ان پچھلی صدیوں میں کتنے انقلاب ہمارے سروں سے گزر گئے لیکن دلی کی حیثیت اور مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ دلی اور لکھنؤ میں جو بات آج ہوتی ہے جو آواز آج یہاں سے اُٹھتی ہے وہ سارے دیس میں گونج کر پھیل جائے گی اور ہو کر رہے گی۔ اس لحاظ سے بھی ہندستانی کنونشن کا پہلی دفعہ لکھنؤ میں ہونا ہماری اور آپ کی ہمت اور حوصلے کو بڑھاتا اور بہت کچھ معنیٰ رکھتا ہے۔

اُردو اور ہندی کا جھگڑا تو خواہ مخواہ کا جھگڑا ہے دونوں ایک ماں کی جائی ہیں اور سگی بہنیں ہیں لیکن ہمارے فرقہ وارانہ تعصب اور جوش نے سوتیلے پن کا برتاؤ شروع کر کے نئی ہندی اور اُردو یا ہندستانی میں غیریت پیدا کر دی ہے۔ اُردو والے اور نئی ہندی والے دونوں اس میں قصوروار ہیں۔ اور جب تک ہم اس سوال پر ہندو یا مسلمان کی فرقہ وارانہ ہٹ سے نظر ڈالتے رہیں گے

کبھی اس دلدل سے نکل نہیں سکتے۔ اگر ہمیں اُردو، ہندی یا ہندستانی کے سوال کو سمجھ کے طے کرنا ہے تو اس سوال کو زبانوں کے علم اور تاریخ کی نگاہ سے دیکھنا پڑے گا۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو جھگڑا آسانی سے مٹ جائے گا۔ میرے لئے یہاں یہ تو ممکن نہیں کہ میں زبانوں کے علم اور تاریخ سے بحث کروں لیکن دو چار موٹی موٹی باتیں اس کے متعلق ضرور کہنا چاہتا ہوں۔

چار پانچ ہزار برس بیتے کہ پراچین آریہ ورت کے آریوں کی بھاشا سنسکرت تھی یہی زبان دیس میں بولی جاتی اور لکھی پڑھی جاتی تھی اسی میں ہمارا ادب یا ساہتیہ بھی ترقی کرتا رہا۔ ہمارے وید۔ دھرم شاستر۔ کرم کانڈ۔ ہمارا یوگ۔ فلسفہ اور دوسرے علم اور ہنر سب اسی میں لکھے گئے۔ اور سنسکرت بھاشا کا ایسا بھرپور خزانہ جمع ہو گیا جو اپنے زمانہ میں آپ اپنی مثال تھا اور آج بھی اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ لیکن سنسکرت جوں جوں اونچے زینے چڑھتی گئی عام لوگوں سے اس کا ناتا ٹوٹتا گیا اور وہ پروہتوں پنڈتوں اور برہمن ودیا رتھیوں کی زبان ہو کر رہ گئی۔ پانینی کا زمانہ سنسکرت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اس کے بعد سے اس کی کلا گھٹنے لگی اور بودھ مت کے پرچار کے جگ میں سنسکرت کی جگہ ان پراکرتوں نے لی جو عام لوگوں میں بولی جاتی تھی یعنی پالی، مگدھی، اردھ مگدھی اور سورسینی۔ ایک ہزار برس تک ان پراکرتوں کا دور دورہ رہا۔ ان میں اونچے درجے کا ساہتیہ یا ادب بھی پیدا ہوا اور یہی تمام دیس کی زبانیں تھیں۔ یہ دور بھی ختم ہو گیا اور آٹھویں صدی عیسوی سے یہ

پراکرتیں علم و ادب کے خزانوں سے خالی ہوکر جنتا کی بگڑی ہوئی بولیاں
رہ گئیں اور اُنہیں اپ بھرنش کہا گیا۔ انہیں اپ بھرنشوں سے موجودہ
ہندستان کی وہ تمام زبانیں نکلی ہیں جو آج بنگالی، مرہٹی، پنجابی، گجراتی
اور ہندی۔ اُردو یا ہندستانی کے ناموں سے مشہور ہیں۔ ہندستان کے
مدہ دیس کو دو حصّوں میں بانٹا جاسکتا ہے ایک پوربی اور دوسرا پچھمی۔ پوربی
حصّہ، یعنی اودھ اور بہار میں اودھی، میتھلی اور بھوجپوری بولیاں رائج
تھیں جو اردھ مگدھی اپ بھرنش سے نکلی تھیں لیکن ہندی اُردو یا
ہندستانی کی بحث میں ہمیں سورسینی اپ بھرنش سے واسطہ پڑتا
ہے کیونکہ اترکھنڈ کے اس پچھمی حصہ میں جو بولیاں بولی جاتی تھیں وہ
سب سورسینی اپ بھرنش سے ہی نکلی تھیں یعنی ستلج پار پوربی پنجاب
میں پنجابی کا رواج تھا۔ ستلج کے کنارے سے لے کر روہیلکھنڈ تک
یعنی دلّی اور میرٹھ کے ارد گرد کھڑی بولی اور آگرہ متھرا بلکہ آس پاس
کے راجستانی علاقوں میں بھی برج بھاشا بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان
ہندستان میں آئے اور پھر یہاں آکر بسنے لگے تو ان کو پہلے پنجابی اور بالآخر
کھڑی بولی سے سابقہ پڑا، لشکر اور ہاٹ بازاروں میں آئے دن کی ضرورتیں
پورا کرنے کے لئے انہیں کھڑی بولی سے ہی کام لینا پڑا اس میل جول کا
لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کھڑی بولی میں فارسی اور عربی کے لفظ داخل ہونے
لگے۔ یہ کیفیت صدیوں اور جگوں تک جاری رہی اور ایک کھچڑی زبان
پیدا ہوگئی جس نے اُردو یا ہندستانی کا نام پایا۔ مغلوں کے دربار
میں درباری زبان فارسی تھی لیکن ان باہر والوں نے جب ہندستان
کو اپنا دیس مان لیا اور یہیں مرنے اور جینے لگے تو دیس کی بھاشا و بولی

کو بھی اپنایا۔ انہیں مغلوں کے زمانہ میں اودھی اور برج بھاشا کا بول بالا ہوا شاہی دربار سے ہندی کے نامی لکھنے والوں نے مثل سور، گنگ، بانا، کیشو سر، سبھج سینھی، سندر۔ شرومانی بنارسی داس، ماتی رام اور آنند گھن نے انعام اور خلعت پائے اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نہ صرف یہی بلکہ اودھی اور برج بھاشا کے اُن نورتنوں میں جن کے نام ادبی دنیا میں سدا امر رہیں گے۔ کبیر اور تلسی داس کے ساتھ ہی ساتھ ملک محمد جائسی اور سور اور میرا کے ساتھ رسکھان اور رحیم کے نام برابر سے لئے جاتے ہیں کس کی ہمت ہے کہ ان کو غیر ملکی بتا کر ہندی ساہتیہ کے دائرہ سے خارج کر سکے۔ مغلوں کے دربار میں اودھی اور برج بھاشا کی بڑی قدر ہوئی۔ لیکن کھڑی بولی یا ہندستانی کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ اس نے اپنا دیس چھوڑ کر دکن میں پناہ لی اور سادھو سنتوں اور صوفیوں اور درویشوں کی گود میں پلی ٹھیٹ ہندستانی ادب کے شروع دور کے لکھنے والوں میں امیر خسرو اور خواجہ گیسو دراز، بندہ نواز کے نام پہلے پہل سُنے جاتے ہیں بعد میں ولی دکنی نے اس ادب میں اونچا درجہ پایا۔

. رشی راناڈے نے اپنے (Hindu Protesmt antran) والے ایڈریس میں ایک جگہ کہا ہے کہ ٹکارام اور نام دیو مرہٹی زبان کے ساتھ ہی ساتھ اُردو میں بھی شاعری کیا کرتے تھے یہاں غالباً مراد دکنی اُردو یا ہندستانی سے ہے۔

کھڑی بولی میں فارسی اور عربی لفظوں کے میل جول سے ہندستانی زبان بنی اور جو ادب شروع شروع میں دکن میں پیدا ہوا وہ شکل و

صورت میں بھونڈا تھا۔ اس کے نوک پلک ٹھیک نہیں تھے، اس کی زبان میں صفائی اور ستھرائی نہیں تھی۔ جب دلّی میں مغلوں کا راج آخری دم بھر رہا تھا۔ برج بھاشا اور اودھی کا چمتکار مدھم پڑ چکا تھا تو ہندستانی دکن سے لوٹ کر پھر دلّی آئی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ دلّی میں مظہر جانِ جاناں نے اس کا چولا بدل کر نوک پلک سے ٹھیک کر کے اسے اُردو کا جامہ پہنایا اور لکھنؤ میں ناسخ نے اسے دلہن بنا کر دربار چڑھایا۔ اب اُردو کی جوانی اپنی پوری بہار پر آکر نکھر رہی تھی۔ گو مغلوں کا زمانہ اب بگڑ چکا تھا لیکن ہمارے کلچر پر اسلامی رنگ بڑا گہرا چڑھ چکا تھا، فارسیت کا رنگ زبان پر بھی چوکھا آیا تھا، سامنت کال کا زمانہ تھا۔ ریاست اور شرافت دونوں کے ایک ہی معنی تھے۔ پڑھے لکھے شریف گھرانوں سے ہی ہماری دُنیا آباد تھی جمہور اور جنتا کی اس وقت تک کوئی حقیقت نہ تھی، اُردو ہی پڑھے لکھے شریفوں کی زبان تھی اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی۔ جہاں اُردو اسلامی روایتوں کے رنگ میں رچی ہوئی تھی وہاں اس میں اپنشد، بھاگوت گیتا اسمرتیوں، رامائن، مہابھارت اور پرانوں کے ترجمے بھی ہو چکے تھے اُردو میں نظم و نثر لکھنے والوں میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی چوٹی کے لکھنے والوں میں کافی ملتے ہیں۔ دیا شنکر نسیمؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، سرورؔ جہاں آبادی، اور چکبستؔ ایسے نام ہیں جن کا سکہ اُردو زبان پر بیٹھا ہوا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُردو کے ہندو مسلمان پارسی، عیسائی، یہودی اور اینگلو انڈین اتنے شاعر اور لکھنے والے پیدا ہو گئے کہ ان کی پوری فہرست بھی نہیں بنائی جا سکتی۔

بقول ڈاکٹر تاراچند کے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اُردو یا ہندستانی ہی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی۔ نہ صرف ڈاکٹر تاراچند بلکہ بھارتیندو ہریش چندر نے بھی جو نئی ہندی کے بڑے نامی لکھنے والے ہوئے ہیں اس بات کو مانا اور اس کا اقرار کیا ہے کہ نہ صرف کشمیری پنڈتوں اور کایستھوں میں ہی بلکہ اگروالوں میں بھی پڑھے لکھے شریف گھرانوں کی زبان اُردو ہی مانی جاتی تھی۔ گارساں دتاسی، بیمز، گلکرائسٹ اور راجہ شیو پرشاد ان سب نے بھی اسی بات کو مانا ہے۔ آج بھی یہی ہندستانی سارے دیس میں سمجھی جاتی اور ہمارے شہروں اور گاؤں میں بولی جاتی ہے۔ لہجہ کا فرق البتہ ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی سورسینی خاندان میں پیدا ہوئی کھڑی بولی نے اسے جنم دیا۔ سادھو سنتوں صوفیوں اور درویشوں کی گودوں میں پالی پوسی گئی۔ بڑھ کر جب اس نے روپ رنگ نکالا تو اُردو نام پاکر نکھری اور راج محلوں میں جگہ پائی۔ ہندو مسلمان کے میل جول سے اس کی شہرت ہوئی اور دونوں نے اسے ایسا اپنایا کہ پھیل کر سارے دیس میں بولی اور سمجھی جانے لگی۔ اگر کوئی زبان اس وقت جائز طور پر سارے دیس کی زبان ہونے کا حق رکھتی ہے تو بلاشبہ وہ ہندستانی ہے۔ شری سمپورنانند جی اور ڈاکٹر جھا کا اسے بدیسی زبان بتانا اصلیت پر خاک ڈالنا ہے۔ پروفیسر امرناتھ جھا نے فرہنگ آصفیہ کی جلدوں کو چھان کر ہمیں یہ تو بتایا کہ اس میں تیرہ ہزار لفظ فارسی اور عربی کے ہیں لیکن مصلحتاً یہ کہنا بھول گئے کہ اس ڈکشنری میں کل لفظوں کی تعداد ۵۴ ہزار ہے اگر اُردو میں چوتھائی لفظوں

کی تعداد فارسی اور عربی کی ہے تو اس بناء پر اُردو کو کون بدیسی زبان کہنے کا حق رکھتا ہے لہذا ہمارا یہ کہنا کہ سیدھی سادی ہندستانی جو آسانی سے جنتا میں بولی اور سمجھی جا سکے اور جسے فارسی اور ناگری دونوں حرفوں میں رواج دیا جائے سارے دیس کی زبان ہونی چاہیئے کس طرح بے جا ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی ہندی اردو کے جھگڑے کا یہی سمجھوتہ کیا اور انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اسی کو مانا ہے۔

اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے بڑا تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہی کانگرسی لیڈر جن کی عمریں مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے گزریں جنہوں نے کانگرس اور آزادی کے لئے اپنا تن من دھن سب نچھاور کر دیا اور جنہوں نے کانگرس کے اصول اور ایمان کی خاطر سب کچھ تج دیا یہی نہیں بلکہ جو آج بھی ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کی سب سے بڑی یادگار یہی قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اُن کے نقش قدم پر چلیں اور وہ جن کاموں کو ادھورا چھوڑ گئے ہیں اُن کو پورا کریں۔ وہی لیڈر مہاتما گاندھی کے اصول اور ایمان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ زبان کے مسئلے کے سلسلے میں اپنے ہی صوبے کے تین نام یعنی راج رشی پرشوتم داس جی ٹنڈن۔ شری سمپورنانند جی اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو صاحب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ٹنڈن جی نے تو مہاتما گاندھی کی زندگی میں ہی نہ صرف زبان کے معاملے میں بلکہ اور بھی کانگرس کے بنیادی اصولوں کے خلاف مخالفت کا جھنڈا اٹھایا تھا اور خیال تھا کہ وہ اب ہندو مہاسبھا میں شریک ہونے والے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا کیوں نہیں ہوا کچھ نہیں کہا جا سکتا اس لئے مجھے ٹنڈن جی کے بارے

میں تو کچھ کہنا نہیں ہے البتہ ڈاکٹر کا ٹجو اور شری سمپورنانند جی کے خیالوں
اور رائیوں پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر کاٹجو
کانگرس کے بڑے نامی لیڈروں میں ہیں۔ بنگال کے صوبہ کی گورنری کے
سنگھاسن پر بیٹھنا اُن کی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔ کاٹجو صاحب نے شروع
تو کیا تھا سنسکرت یونیورسٹیوں کی حمایت سے لیکن اب آپ بڑے
زور سے اس کوشش میں سرگرم ہیں کہ سارے دیس میں قومی زبان
سنسکرت ہی ہونی چاہیئے۔ اس بحث کے سلسلے میں چند سوال سامنے
آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سنسکرت زبان اور علم ادب میں
ہمارے فلسفے، یوگ اُور کرم کانڈ کی رسموں اور ریتوں کا بہت بڑا خزانہ
دفن پڑا ہے جس کی ہم کو عزت اور حفاظت کرنی چاہیئے۔ لیکن اسی کے
ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سنسکرت زبان آج زندہ زبانوں
میں نہیں گنی جاتی کیونکہ وہ دیس کے کسی حصّہ یا جاتی میں بولی نہیں جاتی۔
آج سے نہیں بلکہ ڈھائی ہزار برس ہونے آتے ہیں کہ سنسکرت مرچکی
مردہ جسم میں جان نہیں ڈالی جا سکتی، ہزاروں برس پُرانی سبھیتا
بھاشا اور کلچر کو آج اس بیسویں صدی میں اس کی اصلی اور پرانے روپ
میں جیتا جاگتا کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ بات اَن ہونی ہے ہو نہیں سکتی۔ یہ
بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اُس تہذیب اور کلچر کی بنا جس میں
ہم نے پرورش پائی ہے سینکڑوں برس پرانی ہے اس کی داغ بیل
ہزار برس ہونے آئے جب ڈالی گئی تھی، پراچین بھارت ورش کی پرانی
سبھیتا میں اسلامی دور کی تہذیب اور کلچر خلط ملط ہو کر اس طرح گھل مِل
گیا ہے کہ ہمارے دل و دماغ نے اس ملواں کلچر کو اس طرح قبول کیا ہے

کہ وہ ہماری نس نس میں بس گیا ہے۔ پچھلے دو سو سال میں انگریزی حکومت کے زمانے میں نئی روشنی اور مغربی تہذیب و تعلیم نے بھی اس پر ایک اور ایسا گہرا رنگ چڑھا دیا ہے اور ہم نے اس کے اثروں کو اس طرح قبول کیا ہے کہ وہ نسلوں پھیکا نہیں پڑ سکتا اس لئے موجودہ اور آیندہ زمانے کی تہذیب اور کلچر اور زبان بھی گنگا جمنی ہی ہو کر رہے گی۔ تاریخ کے صفحے سادہ اور خالی نہیں پڑے ہیں کہ ہم من مانا جو چاہیں لکھ دیں، پچھلے ہزار برس کی تاریخ نے جو کچھ ہمارا مقدر کیا ہے اس کو حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جا سکتا، ڈھائی ہزار برس کی مردہ تہذیب کلچر اور زبان کو جیتا جاگتا نہیں بنایا جا سکتا۔ پھر یہ بھی بھلا دینے کی بات نہیں کہ اصلاح اور انقلاب کے سورما جو زندگی اور زمانے کے دھارے کو الٹ پلٹ دینے کی ہمت رکھتے ہیں اُن کی نگاہیں اونچی رہتی اور قدم آگے ہی بڑھتے ہیں، وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے نہ اُن کے قدم ہی پیچھے ہٹتے ہیں۔ قدامت پرستی اور انقلاب کا بیر ہوتا ہے۔ آرِفرمینشن کے زمانے میں یورپ میں کیا ہوا، لوتھر اور کالون نے جب عیسائی مذہب کے سدھارنے کا بیڑا اُٹھایا تو رومن کیتھولیزم کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا پہلا وار لیٹن زبان پر ہوا اُنھوں نے عالموں اور پنڈتوں کی زبان کو طاق پر اٹھا کر رکھ دیا اور اُن بولیوں اور زبانوں کو اپنایا جو عام لوگوں کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں اور جو کچھ کیا صحیح کیا کیونکہ سدھار اور انقلاب کو عام لوگوں سے طاقت ملتی ہے۔ اونچے طبقے والوں سے نہیں۔ یورپ کو جانے دیجئے اپنے ہی دیس کے اتہاس پر نظر ڈالئے مہاتما بودھ نے جب برہمنوں کی عظمت سے انکار کر کے اور اُن کے

رنجے ہوئے کرم کانڈ کی ریتوں اور رسموں سے تنگ آکر بودھ مت کا پرچار شروع کیا تو سنسکرت کا سہارا نہیں ڈھونڈا بلکہ اپنے مت کا پرچار اس پراکرت میں کیا جو جنتا کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھی۔ اور ان کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھی۔ بودھ مت کے پھیلنے کے ساتھ ہی ساتھ پالی پراکرت کے بھی دن پھرے۔ اشوک نے اپنے احکام اور کتبوں کی اشاعت پالی اور مگدھی میں کی سنسکرت میں نہیں جین مت نے بھی سنسکرت کا سہارا نہیں لیا بلکہ اردھ مگدھی کو اپنایا۔ بودھ مت کی کلا گھٹنے کے بعد جب شنکراچاریہ نے ویدانت کے گیان اور اوتاروں کی پوجا پاٹ کی رچنا کر کے پھر ایک مرتبہ برہمنوں کی پدوی بڑھانے کی کوشش کی تو اس کے خلاف جو آواز اٹھائی گئی جس کو فی زمانہ ہندو پروٹسٹنٹزم کا دور کہتے ہیں تو اس کی خصوصیت بھی یہی تھی کہ پہلا وار ذات پات اور چھوت چھات کے مت بھید اور سنسکرت پر پڑا۔ اس دور کے سادھو سنتوں میں نانک، کبیر، رام داس، نام دیو، تکارام اور ایک ناتھ وغیرہ کے نام بڑی پدوی رکھتے ہیں، ان سبھوں نے ہی سنسکرت سے منہ موڑ کر جنتا کی بول چال کی زبانوں میں ہی اپنے اپدیش کا پرچار کیا، رام بھگتی اور کرشن بھگتی کی لہر اٹھ کر جب سارے دیس میں پھیلی تو چیتنیہ، تلسی داس، سورداس اور میرا نے برج بھاشا اودھی اور بنگالی کا سہارا ڈھونڈا۔ لیکن سنسکرت کی طرف کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ سنسکرت صرف پنڈتوں، پروہتوں اور برہمن ودیارتھیوں کی زبان تھی اور وہ بھی مردہ زبان جس کو جمہور جنتا سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

آج کل کے زمانہ میں کانگرس کی تحریک پیدا تو ہوئی اصلاحی فضا میں لیکن پروان چڑھی انقلابی دور میں اس نے جنتا کو بڑی گہری نیند سے جگایا اور جنتا نے اسے قوت بخشی۔ مہاتما نے جو اس بھید سے واقف تھے اسی لئے انگریزی سے اس کا پنڈ چھوڑا کر ہندستانی کا سہارا ڈھونڈا اور عام لوگوں کی ہندستانی زبان کانگرس کی زبان ہو گئی یعنی وہ زبان جس کو جنتا بولتی چالتی اور سمجھ سکتی ہے جو کسان اور مزدور کی زندگی کے دھارے سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہندی اُردو کا جھگڑا ہندستانی سے چکایا۔ فارسی اور ناگری دونوں طرح کے حرفوں میں ہندستانی لکھ کر اور اُسے قبول کر کے ہندو اور مسلمان دونوں کی تسکین کی لیکن پچھلے برس ہندو مسلم میل جول کی فضا کے بگڑنے اور خوں ریزی کے بازار گرم ہونے سے بعض کانگرسی لیڈروں کے دماغ کا طبقہ بھی اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ ڈاکٹر کاٹجو سنسکرت کو سارے دیس کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں اور شری سمپورنانند جی اور نئی ہندی کے شوقین ایسی زبان کو رواج دینا چاہتے ہیں کہ جس کا ڈھانچہ تو ہندستانی ہو لیکن جس کا گوشت پوست رنگ روپ اور نوک پلک سب سنسکرت ہو یعنی سائنس کے اس دور میں جب جمہوریت اور اشتراکیت کا ڈنکا بج رہا ہے ہم سے امید کی جاتی ہے کہ ہم پُرانے فلسفے کی گتھیوں میں اُلجھ کر اور پروہتوں کے کرم کانڈ کے جال میں پھنس کر پھر ایک مرتبہ برہمنوں کے پدوی بڑھانے کا ڈھنڈورا پیٹیں۔ سنسکرت یا نئی ہندی کے قومی زبان بنانے کے اور کوئی معنی نہیں۔ یہ تو میں نہیں مانتا کہ ڈاکٹر کاٹجو اور سمپورنانند جی تاریخ کے ان معمولی واقعوں یا نئے دور کے ان حادثوں سے کہ جن کا

ہیں نے ذکر کیا ہے واقف نہ ہوں گے البتہ سنسکرت اور سنسکرت سے رچی ہوئی ہندی کے شوق اور دھن میں اُنہوں نے ان باتوں کا بھلا دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے ان کا حوالہ ان کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے یہاں دیا ہے ورنہ بات بڑھانی منظور نہ تھی۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اردو ہندی کا جھگڑا بیکار کا جھگڑا ہے کیونکہ دونوں ایک ماں کی جائی اور سگی بہنیں ہیں، فرق صرف نام کا ہے اور چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا ہے۔ ہندوستانی کھڑی بولی سے نکلی اس میں فارسی عربی اور ہندی کے ایسے لفظ شامل ہو گئے جو سینکڑوں برس سے ہر ایک کی زبان پر چڑھے ہیں اب اس میں انگریزی لفظ بھی ضرورۃً کثرت سے شامل ہوتے جاتے ہیں۔ زبان تو ایک ہی ہے کیونکہ دونوں کے زبان بنانے کے قاعدے اور صوتی عنصر ایک ہی ہیں، لفظ بھی دونوں میں عربی فارسی ہندی اور انگریزی کے برابر شامل ہیں، زبان ہندستانی ہے مگر چونکہ دو خطوں میں لکھی جاتی ہے یعنی فارسی اور ناگری میں تو اس لئے دو زبانیں کہلانے لگیں اس میں کوئی حرج نہ تھا مگر فرقہ وارانہ تعصب نے بے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل نئی ہندی کی بنیاد اس طرح ڈلوائی کہ للولال جی سے پریم ساگر ایسی ہندی زبان میں لکھوائی گئی جس کا تعلق نہ اودھی سے تھا نہ برج بھاشا سے بلکہ کھڑی بولی اور ہندستانی سے تھا۔ فرق یوں پیدا کیا گیا کہ اس میں سنسکرت لفظ کثرت سے داخل کئے گئے اور یہ قرار دیا گیا کہ جس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ ہندی الفاظ کے ساتھ کثرت سے ہوں وہ اُردو ہے اور مسلمانوں کی زبان ہے

بنیاد تو نئی ہندی کی اس طرح پڑ گئی لیکن بہت عرصہ تک یہ پنپی نہیں، ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے اس نئی ہندی میں کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں اور جوں جوں ہندو اور مسلمانوں میں قومی اور سیاسی اختلاف بڑھتا گیا نئی ہندی اس جوش میں اُبھرتی گئی، فارسی اور عربی کے وہ لفظ جو زبان کی روزمرہ ہو گئے تھے، نکالے جانے لگے۔ اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھاری بھاری لفظ داخل کئے جانے لگے پچھلے برس کی خانہ جنگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مہاتما کے اصول اور ایمان کے خلاف ہمارے صوبہ کی کانگرس گورنمنٹ نے نئی ہندی کو سرکاری اور صوبہ کی زبان قرار دیا اور آج یہ کوشش زور شور سے ہو رہی ہے کہ روزمرہ کی زبانوں پر چڑھے ہوئے نہ صرف فارسی اور عربی لفظ بلکہ ہندی اور انگریزی لفظ بھی نکالے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ایسے سنسکرت لفظ داخل کئے جا رہے ہیں کہ جن کو سوائے ناگری پرچارنی سبھا کے وِدوان پنڈتوں اور نئی ہندی کے کچھ جوشیلے برہمنوں کے عام لوگوں میں نہ کوئی سمجھتا ہے نہ بولتا ہے۔ سمپورنانند جی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر خود ہی انصاف لگتی بات کہیں کہ ہمارے ہاٹ بازاروں، گاؤں اور شہروں میں مزدور کسان، کاریگر اور عام لوگوں میں کون ایسا ہے جو ماں باپ لڑکا لڑکی ہوا پانی۔ زمیں دار و مال گزاری دیوالیہ مقدمہ ٹیکس ووٹر عدالت جج منصف موٹر۔ لاری۔ کونسل قسط۔ سود۔ اوزار۔ قانون مجسٹریٹ۔ اخبار۔ نوٹس۔ سمن۔ گواہ وغیرہ نہیں سمجھتا اور بولتا ہے کہ جن کی جگہ آج ایسے سنسکرت لفظ گڑھے جا رہے اور دفتروں اور خط و کتابت میں جاری کئے جا رہے ہیں کہ جن کا سمجھنا معمولی آدمی کے لئے غیر ممکن ہے۔

سنسکرت میں رچی ہوئی نئی ہندی کو سارے دیس کی زبان قرار دینے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ اس میں سنسکرت کا رنگ گہرا اور پکا ہوگا تو بنگالی، گجراتی اور مرہٹی لوگوں اور دراوڑی قوموں کو اس کے سمجھنے میں آسانی ہوئی کیونکہ ان کی زبانوں میں سنسکرت کے لفظ کافی پائے جاتے ہیں۔

جہاں تک کہ بنگالی۔ گجراتی اور مرہٹی کا تعلق ہے تو ان زبانوں میں اگر سنسکرت کے ہزاروں لفظ شامل ہیں تو فارسی اور عربی کے بھی کم از کم سینکڑوں لفظ تو ضرور ملتے ہیں۔ ہاں مدارس کی دراوڑی زبانوں کے بولنے والوں کو سنسکرت کی رچی ہوئی نئی ہندی سے ضرور سہولت ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سوچنا تھا کہ انڈین یونین کے ۴½ کروڑ مسلمانوں کو جو سنسکرت سے بالکل ناواقف ہیں کس مصیبت کا سامنا ہوگا۔ کیا مسلمانوں کو زبردستی سنسکرت سیکھنے پر مجبور کرنا ہندو مسلمانوں کے میل جول کی بنیاد کو مضبوط بنائے گا کہ جس کے لئے مہاتما گاندھی نے اپنی جان کی بازی لگائی تھی، کیا یہ انصاف ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مظہر جان جاناں اور ناسخ کو یہ ارمان تھا کہ فارسیت کے گہرے رنگ میں رنگی ہوئی ایسی اردو زبان دہلی اور لکھنؤ کی گلیوں میں رواج پا جائے کہ لکھنؤ اور اصفہان کا فرق مٹ جائے۔ اُنھوں نے اس کی کوشش کی اور ہندستانی پر فارسیت کا نہایت گہرا رنگ چڑھا دیا۔ مانا کہ ٹھیک ہے۔ اُن کے لئے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سامنت کا ل تھا، بہادر شاہ اور واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ اُن کی دُنیا صرف لکھنؤ اور دہلی سے لے کر اصفہان تک محدود تھی۔ اس سے زیادہ آگے

ان کی نظر نہیں جاتی تھی۔ پڑھے لکھے اوسط درجہ کے شریف لوگوں سے ہی ان
کی دنیا بسی ہوئی تھی۔ عام لوگ کسی شمار قطار میں نہ تھے تو انہوں نے جو کچھ کیا
وہ ایک حد تک اس کے لئے مجبور تھے لیکن آپ کی ہمت اور ارادے تو
بہت بڑھے چڑھے ہیں، آپ کی نظریں تو بہت اونچی ہیں، دہلی سے نیویارک
ایک طرف اور نظر نہ لگے دہلی سے اسٹالن گراڈ تک دوسری طرف
آپ کو سب دنیا ایک ہی نظر آتی ہے۔ آپ اس ساری دنیا کی برادری
کو ایک ہی رشتہ کی لڑی میں پرو دیا چاہتے ہیں، آپ نہ صرف اس سائنس
اور جمہوریت کے دور کی پیداوار ہیں بلکہ اس میں دنیا کے نئے رہبر ہونے
کا ارمان رکھتے ہیں تو پھر آپ ہی ایمان لگتی بات کہئے کہ زبان پر انقلاب
زندہ باد کے نعرے اور دلوں میں پراچین بھارت ورش کے گڑے
مردے اکھاڑنے کے ارمان کہاں تک زیب دیتے ہیں۔ جب کلیوگ
آگیا جہاں کسان مزدور، ڈوم اور ہریجن کا راج اور حکومت ہوگی
اور آپ اس کلیوگ کے سواگت کرنے میں سب سے آگے رہتے ہیں تو
اس اندھیر نگری اور چوپٹ راج میں ست یگ کی بھاشا کیسے پنپے گی،
بات سوچنے اور سمجھنے کی ہے۔ جو زبان آج آپ اپنی راج ہٹ سے
رائج کرنا چاہتے ہیں وہ پنڈتوں پروہتوں اور برہمن ودیارتھیوں
کی بھاشا تو ضرور بن جائے گی لیکن جنتا سے اس کا ناتا نہیں جڑ سکے گا
وہ عوام کی زندگی کے دھارے سے اتنی ہی دور ہوتی جائے گی کہ جیسے
مظہر جان جاناں اور ناسخ کی اردوئے معلّٰی۔ سنسکرت میں رچی ہوئی نئی
ہندی دیس کی زبان بن نہیں سکتی۔

کہا جاتا ہے کہ ہم بولتے پڑھتے اور لکھتے تو اردو میں ہیں اور ڈنکا

پیٹتے ہیں ہندستانی کا ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں ہندستانی کے
نام سے اُردو کو پھیلاتے اور بڑھاتے ہیں۔ بات ایک حد تک صحیح ہے
لیکن الزام بالکل جھوٹا ہے۔ زبانوں کا چولا ایک دن میں بدلا نہیں
جاتا اس میں جگ لگتے ہیں اردو اور فارسی کی ترکیبیں اور محاورے
جو سینکڑوں برسوں سے ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں ایک دن
میں اُتار پھینکے نہیں جا سکتے۔ برسوں کی عادت ایک دن میں بدلی نہیں جا سکتی
یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے کا الزام جو
ہم پر لگایا جاتا ہے وہ سراسر غلط بلکہ جھوٹ ہے۔ ہم جو زبان سے
کہتے ہیں وہ دل سے مانتے ہیں۔ وہی کرتے بھی ہیں یہ بات دوسری ہے
کہ بات کے کہنے اور کرنے میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ فطرتی بات
ہے اس سے چھٹکارا نہیں آپ تو اردو کو بدیسی زبان جان کر اس سے
اس طرح دور بھاگتے ہیں کہ کہیں چھوت نہ لگ جائے لیکن اردو اور
ہندستانی کے پڑھنے اور سمجھنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے
ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے کی اردو سے معلّیٰ جو فارسیت کے گہرے
رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور غدر کے بعد کے اردو ادب میں زمین و
آسمان کا فرق ہے مظہر جان جاناں اور ناسخ کا دور اور ادب پرانا
تھا۔ سرسید مرحوم۔ محمد حسین آزاد اور حالی کا دور اور ادب نیا ہے
پرانے ادب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ رومانس میں رچا ہوا تھا اور
رومانس بھی ایران بغداد اور دمشق کا۔ اور لفظی رعایت اور جوڑ
توڑ بڑی فن کاری کی بات سمجھی جاتی تھی۔ نئے ادب نے ہندستانی
ماحول پیدا کیا، رومانس سے پنڈ چھڑا کر حقیقت نگاری پر توجہ کی

اور زبان میں بجائے آرائش اور زیبائش کے صفائی، ستھرائی اور سادگی کو رواج دیا۔ حالی کی مناجات بیوہ ٹھیٹ ہندستانی کا بہت ہی اچھا نمونہ ہے۔ چکبست کی اکثر نظمیں بھی ہندستانی فضا میں ہی گونجتی ہیں۔ سرشار کی زبان بھی روزمرہ کی اچھی مثال اور لکھنؤ کے گلی کوچوں کی بڑی خوبصورت تصویر ہے۔ یہ تو انیسویں صدی کے آخری زمانہ کا تذکرہ ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں کسانوں اور مزدوروں کی دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں اور ہمارے شہروں کے درمیانی طبقے کا جو نقشہ پیش کیا ہے اور جس ہندستانی زبان کو فارسی اور ناگری دونوں کے حرفوں میں رواج دیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ پرانے زمانے میں نظیر اکبرآبادی اور نئے دور میں آرزو لکھنوی کی شاعری ہندستانی زبان کے لئے بہت اچھا نمونہ پیش کرتی ہے پچھلے دس برس میں ہمارے نوجوان ترقی پسند دوستوں نے پریم چند کی پیروی کر کے ہندستانی زبان کو عوام کی زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ چلا کر اس طرف اور کئی قدم بڑھائے ہیں اور پچھلے پانچ سال سے مہاتما گاندھی نے ہندستانی پرچار سبھا کی بنیاد ڈال کر جس ہندستانی زبان کو پھیلانے کی کوشش کی ہے اس کا تو ذکر ہی کیا۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ اردو پر سے فارسیت کا پرانا رنگ رفتہ رفتہ اترتا جاتا اور پھیکا پڑتا جاتا ہے۔ حال کی کوششیں جو ٹھیٹ ہندستانی زبان کے پھیلانے کی کی جا رہی ہیں اور اب اردو جو ہندستانی کا چولا بدل رہی ہے وہ ہماری نیت اور ارادوں اور قول فعل کی ضامن ہے۔ چاہئے تو یہ تھا

کہ آپ بھی نئی ہندی کو ہندستانی کے قریب لاکر ہندستانی زبان کو ہمارے دیس کی زبان بنانے میں مدد کرتے لیکن آپ غریب ناسخ سے جیسے مرے ہوئے بھی ایک صدی گزر گئی بدلہ لینے کی دھن میں سنسکرت سے بھرپور رچی ہوئی نئی ہندی کو راج ہٹ کے زور اور دباؤ سے جاری کرکے ایک ایسی زبان پھیلا رہے ہیں کہ جس کا ناتا جنتا سے کسی طرح جڑ نہیں سکتا۔ روزمرہ بولتے تو ہم آپ دونوں اردو ہی ہیں مگر ہمارا کہنا اور کوشش یہ ہے کہ ہم اردو کو ہندستانی کا چولا دے کر جنتا سے قریب لائیں اور آپ کا کہنا اور ضد یہ ہے کہ سیدھی سادی ہندستانی کو سنسکرت میں بھرپور رچ کر جنتا سے جتنا بھی دور رکھ سکیں رکھیں۔ اور ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اردو اور نئی ہندی کو ہندستانی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اور اس کا چولا بدلنے کے لئے کن باتوں اور کون سی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی اس پر بھی تھوڑی دیر غور کرنا ہے۔ پہلی بات جس نے بڑی اُلجھن ڈال رکھی ہے اور جس کا صاف طور سے سمجھ لینا ضروری ہے یہ ہے کہ ہندستانی کے لفظ میں دو باتیں خلط ملط ہو گئی ہیں یعنی ایک تو وہ زبان جو روزمرہ بولی جاتی ہے۔ ہمارے ہاٹ بازاروں میں سوداگری کے بیوپار میں کام آتی ہے۔ نج کی خط و کتابت میں لکھی جاتی ہے اور جس کا ہمارے معمولی سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں رواج ہے۔ دوسری وہ علمی اور ادبی زبان جس میں ہمیں اپنے نوجوانوں کو یونیورسٹیوں میں اونچے درجہ کی تعلیم دینی ہے جس میں مختلف علموں اور فنوں میں اونچے پایہ کی کتابیں لکھنی ہیں جس میں ہمارے دیس کے قانون بنائے جائیں گے۔

جس میں ہم اپنا ادب یا ساہتیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک کہ روزمرّہ کی بول چال اور بیوپار کی زبان کا تعلق ہے وہ تو وہی سیدھی سادی ہندستانی ہو گی جو ہماری زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ ہزاروں فارسی عربی اور ہندی کے لفظ اپنا رنگ روپ بدل کر اور بغیر بدلے بھی ہماری زبانوں پر سینکڑوں برس سے چڑھے ہوئے ہیں اب پچھلے سو برس میں سینکڑوں ہی لفظ انگریزی کے بھی ہماری زبان میں داخل ہو گئے ہیں اُن کو چھانٹ چھانٹ کر نکال باہر کرنا اور اُن کی جگہ شدھ سنسکرت لفظ گڑھ کر قانون اور حکومت کے زور سے جاری کرنا عقل کی بات نہیں۔ ایسا کیا جاتا ہے اس کی دو چار مثال دیکھئے۔ کون ہے جو آج جج یا چیف جج کا لفظ نہ سمجھتا ہو اس کے لئے پردھان نیا سے ڈھنڈ گڑھا گیا ہے۔ سڑک۔ ڈگر۔ راستہ۔ شہروں اور گاؤں میں سمجھا اور بولا جاتا ہے اس کے لئے مارگ کا لفظ جاری کیا جارہا ہے۔ اسی طرح جلدی کی جگہ شیگرھ اور دھیرے دھیرے کی جگہ شنی شنی بولنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ سب ٹھیک نہیں۔ روزمرّہ کی زبان پر وہی لفظ رہنے چاہئیں اور رہیں گے خواہ وہ فارسی اور ہندی کے ہوں یا انگریزی کے۔ مثلاً لینٹرن کو ہم نے لالٹین بنالیا۔ کوٹ کو کوٹ ہی رکھا لیکن پٹلون کو پتلون کہہ کر اپنی زبان میں لے لیا۔ بوٹل کو بوتل اور بٹن کو بوتام کہہ کر شامل کرلیا۔ یہ لفظ ہندستانی زبان میں شامل ہو گئے ہیں ان کی جگہ سنسکرت کے لفظ گڑھنا محض ہٹ دھرمی بلکہ پاگل پن ہے۔ اردو والے بھی ایسا کرتے ہیں۔ حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی اسی طرح کی

کوشش کی ہے۔ مثلاً تھرمامیٹر کو مقیاس الحرارت بنایا گیا ہے۔ یہ بھی جنون ہے۔ مختصر یہ کہ روزمرہ کی زبان سے فارسی۔ اُردو۔ ہندی یا انگریزی کے زبانوں پر چڑھے ہوئے لفظوں کو خارج کرکے سنسکرت کے لفظوں کا جاری کرنا غلط ہے۔ یہ کام چلے گا نہیں سنسکرت سے رچی ہوئی زبان عام لوگوں کی زبان نہیں بن سکے گی۔ خاص طبقے کی زبان ہوکر رہ جائے گی۔ مگر علمی اور ادبی ہندستانی زبان کی صورت اس سے مختلف ہوگی۔ روزمرہ کی سیدھی سادی ہندستانی اس وقت اس قابل نہیں کہ علم و ادب کا بوجھ سہار سکے۔ اس میں ہمیں سنسکرت فارسی۔ عربی اور بڑی حد تک انگریزی کے لفظ شامل کرنے پڑیں گے اس سے نجات نہیں۔ جو لوگ زبان کے معاملہ میں اہلیت رکھتے ہیں اور جن کو اس سے خاص دلچسپی ہے ان کو ایک جگہ جمع ہوکر اصطلاحوں کی ایک ڈکشنری تیار کرنی ہوگی جس میں صرف سنسکرت سے ہی نہیں کہ جیسا آج کیا جارہا ہے بلکہ فارسی عربی اور انگریزی سے بھی اصطلاحیں لینی پڑیں گی اور ان کو زبان میں ان کے اصلی روپ میں یا ان کا چولا بدل کر شامل کرنا ہوگا۔ مثلاً ریاضی اور سائنس کے علموں کی اصطلاحیں یعنی کیمسٹری۔ فزکس۔ ذوالوجی۔ بوٹنی۔ اناٹومی جیولوجی وغیرہ میں ہم کو انگریزی کی اصطلاحیں لینی پڑیں گی۔ اسی طرح سے سوشیولوجی۔ اکنومکس۔ پالٹکس۔ جورسپروڈنس اور سائکولوجی وغیرہ میں بغیر انگریزی سے اصطلاحیں لئے ہمارا کام نہیں چل سکتا کیونکہ تقریباً یہ سب ہی علم اور مضمون ہمارے لئے نئے ہیں۔ ہمارے پُرانے علم و ادب میں خواہ سنسکرت ہو یا فارسی وعربی، نہ اتنی وسعت

ہے نہ نئے زمانے کی ایجادوں کا کوئی ذخیرہ۔ تاریخ۔ سفرنامے اور سوانح عمریوں کی کتابوں میں اصطلاحوں کا استعمال فارسی اور سنسکرت وغیرہ سے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔

جہاں تک محض ادب اور ساہتیہ کا تعلق ہے اس کے لئے پابندیاں نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں سوال لفظوں اور اصطلاحوں کا نہیں ہے بلکہ اسلوب اور اسٹائیل کا ہے لفظ سنسکرت کے بھی آئیں گے اور فارسی اور عربی کے بھی لیکن لکھنے کا وہی ڈھنگ عوام میں قبول ہوگا جو سادہ ہو اور عوام کی زندگی کے دھارے سے واسطہ اور رشتہ رکھتا ہو۔

اصطلاحوں کی ایسی ڈکشنری تیار کرنا سب سے مقدم اور پہلا کام ہے اس سے بھی زیادہ ضروری اور لازمی یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں یعنی یونیوسٹی کی تعلیم کے شروع ہونے سے پہلے کے تمام کورس میں اُردو اور ہندی دونوں کی تعلیم ہر طالب علم کے لئے لازمی قرار دی جائے اگر اس طرح سے اردو اور ہندی کا ملاپ ہوا تو ایک نسل بعد ہندستانی زبان نکھر کر اپنی پوری بہار پر آ جائے گی اور نہ صرف دیس کی تمام زبانوں کی برادری میں اس کا مرتبہ اونچا ہو جائے گا بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی برادری کا دعویٰ کر سکے گی۔ اردو والوں پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُنہوں نے اس پر فارسیت کا ایسا گہرا رنگ چڑھا دیا ہے کہ بعض اوقات اُردو اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ بالکل غلط نہیں ایک حد تک صحیح ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نئے دور کے نئے ادب

نے اس الزام کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے تاہم اُردو ادب کے چمنستان میں اب بھی بلبل شیراز کا نغمہ ہی سنائی دیتا ہے۔ گو ہمارے کان کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں کے زیادہ عادی ہیں اور ہمیں انہیں کی کوک زیادہ سہانی معلوم ہوتی ہے۔ عشق و محبت اور پیت و پریم کے متوالوں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔ ساوتری۔ ست دان۔ نل دمن ہیر رانجھا اور رادھا کرشن کی دلوں میں ٹیس پیدا کرنے والی کہانیاں اور پیت کے متوالوں کو مگن کرنے والے راگ ہمارے یہاں کافی ملیں گے تو پھر ہمارے ادیب اور لکھنے والے شیرین و فرہاد، یوسف و زلیخا، اور لیلیٰ مجنوں کو ایران، عرب اور مصر سے گھسیٹ کے کیوں لاتے ہیں؟ جمع بنانے کی عربی و فارسی ترکیبوں کی جگہ ہندستانی قاعدہ کیوں نہیں پوری طرح استعمال کیا جاتا۔ خیالات کی جگہ خیالوں۔ باغات کی جگہ باغوں ضروریات کی جگہ ضرورتوں۔ قوانین و ضوابط کی جگہ ضابطوں۔ قانونوں کے لفظوں کا استعمال کیا اور کیوں برار ہے گا۔ اسی طرح سے اضافی ترکیبوں کا بکثرت استعمال بھی ٹھیک نہیں۔ ہماری املا بھی اصلاح کی محتاج ہے۔ اور لفظوں کا تلفظ بھی۔ املا اور تلفظ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو ہمیں عوام سے قریب لائے نہ کہ دور لے جائے جیسا کہ اب تک پرانے ادب میں ہوتا رہا ہے۔

لپی یا رسم خط کا سوال بھی بحث میں اُلجھا ہوا ہے۔ میرے پاس نہ تو اتنا وقت ہی ہے اور نہ یہاں اس کی گنجائش کہ میں اس بحث میں پڑوں صرف اپنا خیال دو تین جملوں میں ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔

اصولی طور پر تو یہ بات ٹھیک ہے کہ اُردو اور ہندی کی جگہ جب ایک زبان ہندستانی ہوگی تو اس کا رسم خط بھی ایک ہی ہونا چاہیئے اور اگر یہ مان لیا جائے جیسا کہ ظاہراً معلوم بھی ہوتا ہے کہ ہندی لپی کا سیکھنا پڑھنا اور لکھنا بہ نسبت فارسی رسم خط کے آسان ہے تو ہندی ہی رسم خط ہونا چاہیئے لیکن یہ بات بحث کی ہے کہ کیا واقعی فارسی رسم خط پر ہندی کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے حال ہی میں ایک رسالہ اس مضمون پر لکھا ہے جس میں اُردو رسم خط کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ بحث کے بعض پہلو جنہیں انہوں نے اجاگر کیا ہے ضرور غور طلب ہیں اور ہماری توجہ کے قابل ہیں۔ میری رائے میں تو اس وقت دونوں ہی رسم خط کا جاری رہنا ضروری ہے۔ موجودہ فضا میں اگر ہم اُردو اور ہندی کی جگہ ہندستانی کو رواج دینا چاہتے ہیں تو دونوں رسم خط کے جاری رہنے سے اس میں مدد ملے گی اگر ناگری رسم خط واقعی فارسی رسم خط پر فوقیت رکھتا ہے تو ہندستانی زبان کے بننے اور نشو و نما کے ساتھ خود بخود ہی وہ فارسی رسم خط کی جگہ لے لے گا۔ زبردستی واجب نہیں اور زبردستی کی بھی کیسے جا سکتی ہے۔ سری نگر کشمیر سے لے کر دہلی اور دہلی کے قرب و جوار کے ضلعوں تک میں اس وقت بھی ہندی رسم خط کو کوئی نہیں پوچھتا صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ اکثر ہندوؤں میں بھی فارسی رسم خط رائج ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کے اخبار، رسالے اور کتابیں فارسی رسم خط میں چھپتی ہیں بلکہ آریہ سماج اور ہندو سبھا والوں کے اخبار بھی نہ صرف پنجاب بلکہ دہلی میں بھی اُردو

میں ہی شائع ہوتے ہیں آپ ان کو زبردستی کس طرح اُردو چھوڑنے اور ہندی قبول کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے فی الحال دونوں رسم خط کا جاری رہنے دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہی سمجھوتہ گاندھی جی نے بھی کیا اور مانا ہے۔

اُردو، ہندی یا ہندستانی کے مسئلے کے بعض پہلوؤں پر میں نے آپ کی توجہ دلائی ہے۔ لیکن اس بحث کی تہ میں بعض بنیادی سوال اُٹھتے ہیں کہ جن پر غور کرنا اور قطعی رائے قائم کرنا لازمی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سائنس اور جمہوریت کے دور میں ہم زمانے کے چلن کا ساتھ دے کر اپنے دیس کو ترقی کی طرف بڑھانا چاہتے ہیں یا پراچین آریہ ورت کی چار، پانچ ہزار برس پرانی سبھیتا کو واپس بلانے اور اس کی طرف لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے دیس کی حکومت ہندستان نواسیوں کی ہوگی جس میں ہندو مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی سب برابر کے حصہ دار ہوں یا یہاں ہندو راشٹر قائم کیا جائے گا۔ یعنی مرہٹوں، سکھوں اور راجپوتوں کا راج ہوگا۔ ہمیں اس سوال کا صاف صاف جواب دینا ہے کہ ہم مسلم لیگ اور پاکستان والوں کی طرح ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھتے ہیں یا ایک قوم کہ جس اصول اور ایمان کی خاطر مہاتما نے اپنی عمر بتائی اور بالآخر جس ایمان پر اُنھوں نے اپنی جان دی۔ مختصر یہ کہ ہمارا تمدن اور کلچر مشترکہ ہوگا یا محض اسلامی یا ہندوانی۔ یہ بنیادی سوال ہیں کہ جن پر ہم میں سے ہر فرد کو سوچ سمجھ کر سچائی اور ایمان داری کے ساتھ جواب دینا ہے۔ کلچر اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اُنہیں سوالوں کے جوابوں پر ہندستانی زبان کی قسمت کا فیصلہ بھی ٹھیرا ہے۔ جب تک ہم ان باتوں کا جواب

سچائی اور ایمان داری کے ساتھ نہیں دے سکیں گے ہندی اُردو کا جھگڑا کبھی نہیں چکے گا۔ دیکھنے میں جو کچھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے وہی بڑے بڑے لیڈر اور منسٹر جو پلیٹ فارم پر شدھ ہندی اور پراچین سبھتا کی قسمیں کھاتے ہیں رہتے سہتے اس طرح ہیں کہ ان کی کوٹھیاں اور بنگلے دیسی نہیں بلکہ وہی انگریزی وضع کے ہوتے ہیں کہ جن میں ہمارے انگریز حاکم رہا کرتے تھے، ان کی سجاوٹ بھی ویسی ہی انگریزی طرح کی ہوتی ہے کہ جیسی انگریز حاکموں کے وقت میں ہوا کرتی تھی۔ وہی سوفا سٹ وہی کرسیاں اور میزیں، وہی ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹائپ رائٹر۔ وہی موٹر اور ہوائی جہاز گھروں کے اندر غالباً چو کے برتن اور چھوت چھات کا پُرانا دستور ہوگا اور گھروں پر کرتا دھوتی ہی پہنتے ہیں لیکن باہر نکلتے ہیں تو چوڑی دار پائجامہ اور شیروانی اچکن۔ ملاقاتوں میں بات چیت بھی اگر ویسی ہی اُردو میں نہیں کہ جو ہم اور آپ یہاں بولتے ہیں تو کم از کم ایسی ہندستانی میں تو ضرور ہوتی ہے کہ جسے عام طور سے لوگ سمجھ سکیں۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی اسلامی شریعت اور اسلامی حکومت کا جذبہ بہت زوروں ہے۔ اخبار میں پڑھنے میں آیا تھا کہ کسی نوجوان ڈاکٹر کو جو پردے کی رسم کا قائل نہ تھا شریعت اسلامی کے زعم اور جوش میں سنگسار کر کے ختم کر دیا گیا۔ یہ شریعت اسلامی کے کہاں تک موافق ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ روز دیکھنے میں آتا ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم کی بیگم صاحبہ کریٹڈ ڈی شین اور شیفان کے لباس زیب تن کئے پاکستان کے شہروں اور بازاروں میں بے پردہ نکلتی ہیں اور آج لندن اور پیرس کے جگمگاتے ہوئے ہوٹلوں اور شاہی دعوتوں میں بے تکلف اور بے حجابانہ زینت افروز ہوتی ہیں اور وہاں کے جلسوں میں

پردہ کی رسم کے خلاف تقریریں کرتی ہیں۔ میں ان کی ہمت کا قائل ہوں اور
اور زیادہ قائل ہو جاؤں گا جب وہ پاکستان کے شہروں میں پردہ کے
خلاف پروپگنڈا کریں گی۔ میں کسی کو طعنہ نہیں دے رہا ہوں اور دے بھی
کیسے سکتا ہوں کیونکہ میں خود اُسی اصول اور چلن کا قائل ہوں کہ جسے ہمارے
یہ لیڈر عمل میں لاتے ہیں۔ شکایت صرف اس بات کی ہے کہ پلیٹ فارم
پر کسی مصلحت کی بنا پر شریعت اسلامی اور پراچین سبھیتا کی ہی قسمیں کھائے
بغیر ان سے نہیں بنتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب ہمارا کلچر اور ہماری زبان
خواہ پاکستان ہو کہ ہندستان، زمانہ کے چلن ہی کے سانچے میں ڈھلیں گے۔
اس سے مفر نہیں۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ دنیا کے تہذیب و تمدن کا اٹھان
اور اس کا چلن ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں بناؤ اور بگاڑ کی دونوں
باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لڑائی جھگڑا بھی ہوتا ہے اور پھر میل ملاپ
بھی ہو جاتا ہے۔ صحیح راستہ یہی ہے کہ بگاڑ کے عارضی راستوں کو بھلا کر
بناؤ اور سنوار کے چلن پر چلا جائے۔ جوشیلی طبیعتوں کو چھوڑ کر دل د
دماغ والے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور اگر ہمیں ترقی کے راستہ پر
چلنا ہے تو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ہمارے تمدن کی تاریخ کی جلدوں
میں اب صفحے اس طرح خالی نہیں پڑے ہیں کہ ہم من مانا جو چاہیں اُن میں
لکھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کا پڑانا واسطہ اور رشتہ اور پوربی
دیسوں اور پچھمی ولایتوں کی مڈبھیڑ ایسی تاریخی روائتیں ہیں کہ جو
ہمارا مقدر ہو چکیں ان کو اب حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جا سکتا
اور جو نقش ان تاریخی روایتوں نے چھوڑے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہندستانی
تہذیب و تمدن ہمارا تمدن اور کلچر مشترکہ ہوگا ایک رنگی نہیں بلکہ

دو رنگی یعنی ایسا گنگا جمنی کہ جس کا تانا بانا تو پراچین آریائی ہو گا پھول بوٹے اسلامی دور کے ہوں گے اور اس کا رنگ گہرا فرنگی یا مغربی۔ طبیعت چاہے یا نہ چاہے ہمیں اسے ماننا پڑے گا۔ آج ہندستان میں ہندو راشٹریہ یا پاکستان میں شرعی حکومت کے سپنے دیکھنا عقل کی بات نہیں ہماری حکومت دستوری ہی ہو گی جس میں جمہوریت بلکہ اشراکیت کا گہرا رنگ چڑھا ہو گا۔ ہماری زبان نہ سنسکرت میں رچی ہوئی ہندی نہ فارسی و عربی زدہ اردو بلکہ وہ سیدھی سادی ہندستانی ہو گی کہ جس کو عام لوگ اپنا سکیں اور بول چال اور پڑھ لکھ سکیں۔ ہمارا تمدن ایسا گنگا جمنی ہو گا کہ جس میں نہ صرف پراچین آریائی سبھیتا کا عکس دکھائی دیتا ہو۔ جس میں نہ صرف اسلامی دور کے پھول بوٹے ہوں بلکہ جس میں مغربی اور نئی روشنی کی کرنیں اور تاریں بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہوں۔ پُرانے دور کی تاریخ اور نئے زمانے کی روشنی نے ہمارا ایسا ہی مقدر کیا ہے اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ فرقہ وارانہ جوش اور مذہبی تعصب کی آگ بھڑکا کر آپ ابھی کچھ عرصہ تک عام لوگوں کی جہالت اور بے مائگی سے فائدہ اُٹھا کر ملک کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں ضرور ڈال سکتے ہیں۔ ابھی کچھ دن بھٹکے ہوؤں کو اور گمراہ کیا جا سکتا ہے لیکن زمانہ کی روش اور افتاد ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے ترچھے اور بانکوں کی کا کلوں کے بل نکال دیتی ہے اور بالآخر سیدھے راستہ پر لگا دیتی ہے اور پھر عقل کی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز۔ میں نے جو کچھ آپ کے سامنے اس وقت کہا ہے وہ میرا دین

ایمان ہے اس سے گریز کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ اگر انجانے میں
کوئی بات منہ سے ایسی نکل گئی ہو جو کسی صاحب کے دل کے دکھانے
والی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔

نیا ادب[1]

زمانۂ حال کے ہندستان کی زندگی کا نیا دور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے یعنی جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا زمانۂ حکومت ختم ہوا اور عنانِ حکومت براہ راست برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں آئی، شروع ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں خواہ وہ سیاسی، و معاشرتی ہوں یا اقتصادی، علمی اور ادبی، ایک نئی جھلک، نئی امنگ اور نیا دستور بیّن نظر آتا ہے، ہماری پچھلی دو صدی کی تاریخ کا محض سرسری مطالعہ بھی ہم کو بتاتا ہے کہ غدر سے سو برس پہلے اور غدر کے بعد سے اب تک کے ہندستان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ پرانا دور تھا اور یہ نیا۔ وہ تاریکی کا زمانہ تھا اور یہ روشنی کا۔ اُس عہد میں قوم ادبار و زوال کی طرف مائل تھی اور اب ترقی اور عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسلامی دور کے ختم ہونے کے بعد دو سو برس ہوئے کہ برطانوی دور شروع ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں انگریزوں نے اس ملک کو جس طرح لوٹا اور برباد کیا ہمیں آپس میں لڑا کر اپنی حکومت قائم کی اس کی مفصل کیفیت آپ میں سے اکثر نے تاریخ کی کتابوں، بالخصوص رومیش چندر دت کی مشہور تصانیف "اکنومک ہسٹری آف انڈیا" اور "انڈیا ان دی وکٹورین ایج" میں پڑھی ہوگی۔ غدر میں جیسے دردناک

---

[1] لکھنؤ یونیورسٹی کے سنہ ۱۹۲۹ء کے کانوکیشن کے سلسلہ میں جو جلسہ ہندستان کی مختلف زبانوں کے مصنفین کا وائس چانسلر کی زیر صدارت ہوا تھا۔ یہ مضمون اس میں پڑھا گیا اور بعد میں رسالہ "ایشیا" میں شائع ہوا۔

مظالم یہاں کی رعیت پر ڈھائے گئے اُس کے جو واقعات ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب "دی ادر سائڈ آف دی میڈل مین" میں درج کئے ہیں وہ دہشت ناک و عبرت ناک ہیں۔ کل کی سی بات ہے کہ جنرل ڈائر نے جلیان والا باغ میں برٹن بول کر قتل عام کا محشر بپا کیا اور بھی سینکڑوں مظالم انگریزی حکومت کے جو اس کے عہد میں ہم پر ہوئے اور جن کی یاد نقش کالحجر بن گئی ہے ہر ایک کی زبان پر ہیں۔

لیکن کفران نعمت ہوگا اگر آج جبکہ انگریزی حکومت یہاں سے اُٹھ گئی ہے۔ اس کا اقرار نہ کریں کہ انگریزی حکومت کے تخریبی دور کے علاوہ اُس کا ایک تعمیری دور اور روشن پہلو بھی تھا جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے شروع ہوا اور کامل تین نسلوں تک اپنا کام کرتا رہا۔ اس سائنس اور جمہوریت کے دور نے ملک کی کایا پلٹ کردی۔ ہماری روزمرہ کی زندگی کو اس طرح اُبھارا اور اونچا کیا۔ ہمارے رہن سہن میں ایسی سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائیں۔ تکلفات زندگی کے ایسے معجزے دکھائے جن کا ذکر نہ کرنا بعید از انصاف ہوگا۔ ریلوے، تار برقی ٹیلیفون، ریڈیو، سنیما، تھیٹر، موٹر کار اور ہوائی جہاز، ڈاک خانوں اور ہسپتالوں کا انتظام، فیکٹریوں اور کارخانوں کا قیام، صنعت و حرفت اور تجارت کا فروغ اور سائنس اور مشینری کے سینکڑوں معجزے اس ملک میں مغربی روشنی اور انگریزی حکومت کی بدولت ہی دیکھنے میں آئے جنھوں نے ملک کو ترقی کے راستہ پر ڈالا اور چلایا۔ اور جمہور کی زندگی کو کسی قدر اونچا اور بہتر بنایا۔ جس سے نہ صرف ہمارے یہاں کے بڑے بڑے شہر آج لندن اور پیرس

مقابلہ کرتے ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی زندگی کی
ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہمارے کسانوں اور مزدوروں کی حالت
ہمارے ارادوں اور منصوبوں کے لحاظ سے کیسی ہی کچھ اصلاح طلب
کیوں نہ ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی ایک نسل سے
اُن کی زندگی کا رہن سہن اور ان کی اقتصادی حالت نسبتاً بہتر
ہو گئی ہے اور یہ سب اسی تعمیری دور کی بدولت ہے جس کی بنیاد
انگریزی حکومت نے ڈالی تھی۔ قطع نظر اس مادی اور اقتصادی
ترقی کے جو ہم نے انگریزی دور میں کی اس دور کی خاص برکتیں، قومیت،
حریت اور مساوات کے وہ اصول اور عقیدے ہیں جو ہم نے انگریزی
حکومت کے تعمیری عہد میں قبول کئے۔ یہاں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں
اور انگریزی تعلیم کا چرچا ہوا۔ نئی تہذیب کی نئی روشنی نے
ہمارے دل و دماغ کو منور کیا۔ ہمارے آئین اخلاق کی از سر نو
ترتیب کی۔ ہماری سوسائٹی کے شیرازے کو بدلنا شروع کیا
اور دستور حکومت کا بھی چولا بدل ڈالا۔ متحدہ قومیت کا وہ
خواب جو اکبر اعظم نے اپنے زمانہ میں دیکھا تھا۔ اسی لئے اصلیت
کی صورت اختیار کر سکا کہ ملک انگریزی حکومت کے تابع تھا جو
امن و امان قائم رکھ سکی۔ جس سے کاروباری و تجارتی تعلقات
اور سوشل ربط و ضبط فروغ پاتے رہے۔ شخصی آزادی کا خیال اور
حب الوطنی کا جذبہ ہمارے دماغوں میں اس طرح پرورش پانے
لگا کہ انگریزی حکومت نے انگریزی تعلیم یہاں رائج کی اور پریس
کی آزادی ہمیں حاصل ہوئی۔ ملٹن۔ برک۔ مل۔ اسپنسر۔ مانٹسے۔

نکلے۔ اوگسٹ کامٹ اور روسو کی تعلیم سے ہمارے دماغ روشن
ہوئے۔ انگریزی، امریکی، فرانسوی اور اب روسی انقلاب کی تاریخ
سے ہم نے سبق حاصل کئے۔ پریس کی آزادی نے ہماری دیسی زبانوں
اور دیسی لٹریچر کو مالامال ہونے کا موقع دیا جس سے معدودے چند
کے خیالات عوام الناس تک پھیلے مساوات کے اصول و عقیدے نے
اسکولوں اور عدالتوں میں نشو ونما پائی۔ عدالت کے سامنے شودر اور
برہمن، مسلمان اور عیسائی سب ایک ہی ترازو میں تولے جانے لگے۔
امیر و غریب سب یکساں قانون کے پابند ہوئے۔ ذات اور مرتبہ
کی تفریق مٹنے لگی۔ اسکولوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ برہمن۔ چمار کھٹیک
اور ہندوؤں کے لڑکے بھی ایک ہی بینچ پر بیٹھنے لگے۔ ایک ہی قاعدے
اور ضابطے کے پابند ہوئے۔ امیر و غریب امتحانوں میں یکساں جانچے
جانے لگے اور ان کی کامیابی کا دارومدار اُن کی ریاست، مرتبہ اور
ذات پر نہیں بلکہ ان کی قابلیت کے لحاظ سے کیا جانے لگا۔ ڈارون
کے اصول ارتقاء، سائنس کی تعلیم اور مشینری کے رواج کی برکتوں نے
پُرانی تہذیب کی روایات، توہمات اور رسومات کے جال کو کاٹ کر
ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا کر دیا۔ خاندانی رعب و داب کی
جگہ عقل و دلیل نے لے لی اور شخصی آزادی کا سکہ چلنے لگا۔ آئینی حکومت
کے تجربے بھی ہمیں اسی دور میں ہوئے۔ ہماری زندگی کے افق کے دھندلکے
میں جب نئی روشنی کی کرنیں اس طرح پھوٹنی شروع ہوئیں تو اس
کی جھلک نے ہماری نظروں کو بصیرت دی اور اپنے یہاں کے
پست طبقوں کی زبوں حالت پر جو جبر و استبداد کی تہوں میں پڑے

بسکیاں لے رہے تھے ہماری توجہ مبذول ہوئی۔ ہم کو عورت کی ہستی کا دھیان آیا عورتوں کی تعلیم کا چرچا ہونے لگا۔ پردے کی مذموم رسم اٹھنے لگی صغر سنی کی شادی اور بیواؤں کی قابل رحم حالت اصلاح طلب معلوم ہوئی۔ نیچ ذاتوں کسانوں اور مزدوروں کے دکھ درد کے ہم قائل ہوئے۔ کامل پچاس برس تک یہ اصلاحی دور اپنا کام آہستہ آہستہ کرتا رہا۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب نئی روشنی کی چمک تیز اور گہری پڑنے لگی تو جنتا کی بھی آنکھیں کھلنے لگیں اور انقلاب کی لہریں اٹھنے لگیں اور پھر وہ زمانہ آیا کہ انقلاب زندہ باد کے نعروں سے زمین و آسمان گونجنے لگے۔

جب زمانہ نے اس طرح کروٹ بدلی تو زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکا۔ زندگی کے اور شعبوں کی طرح اردو علم و ادب بھی اس سے متاثر ہوا اور ہمارے ادیب و شاعر بھی نئے دور کی ترجمانی پر آمادہ ہونے لگے۔ اردو علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے غدر کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر نئے اور پرانے کی تفریق کے لئے کوئی زمانہ یا تاریخ مقرر کی جا سکتی ہے تو وہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہی ہے۔ اس سے پہلے کا ادب پرانا تھا اور بعد کا ادب نیا۔ یوں تو غالب نے بھی اپنے زمانہ میں محسوس کیا تھا کہ ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اور نظیر اکبر آبادی نے بھی طرحی غزلوں کی شاہراہ سے ہٹ کر ایسی

نظمیں کہی تھیں جن سے عوام الناس کی زندگی کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن اردو شاعری کا نیا دور حالی کی ذات اور اردو کا نیا ادب سرسید احمد خاں، ڈاکٹر نذیر احمد۔ مولانا محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی کے اسمائے گرامی کے ساتھ ہی ہمیشہ وابستہ رہے گا۔ یہ لوگ وہ تھے جنہوں نے اردو کے نئے ادب کی بنا رڈالی، ادب کی توجہ اُن نئے مضامین و مسائل کی طرف مبذول کی جن سے قوم کو نیا واسطہ تھا۔ ادب کی پرانی شاہراہ سے ہٹ کر ایسی راہیں نکالیں جن کی جھلک نئی روشنی ہم کو دکھا رہی تھی۔ نہ صرف مضامین و مسائل کے لحاظ سے بلکہ اسلوب تحریر کے رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے بھی اردو ادب کا چولا بدل دیا۔

تنقید نگاری۔ سوانح عمری۔ تذکرے۔ فسانے۔ ناول اور ادب کے دوسرے شعبوں پر بھی بجائے پُرانے رنگ کے نئی روشنی جھلکنے لگی صنفِ شاعری میں غزل گوئی کی پرانی لکیر کے فقیر بنے رہنے کی جگہ ایسی نظموں کو رواج دیا جن میں قدرتی مناظر کی تصویریں کھینچی گئی تھیں اور جن سے معاشرتی زندگی اور قومی رومانوں اور ولولوں کی ترجمانی ہوتی تھی۔ شاعری کے اس دور میں جو نئی راہ حالی نے نکالی تھی اقبال چکبست اور حسرت نے اس میں دو ایک منزلیں اور طے کیں۔ فسانہ نگاری میں سرشار۔ شرر اور مرزا رسوا نے اپنے اپنے رنگ میں داستانوں اور قصوں کی جگہ اردو میں ناول کو رواج دیا۔ مرزا سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر "اودھ پنچ" اور اُن کے رفقا نے جن میں اکبر الہ آبادی بھی شامل تھے، ایسی مزاحیہ نظم و نثر کا ڈھنگ نکالا جو اپنے دور کی پوری ترجمانی کرتا تھا اس لئے مقبول خاص و عام

ہوا۔ اردو میں نئے ادب کو ترقی دینے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے میں جن اصحاب نے بلیغ کوشش کی ان میں ڈاکٹر عبدالحق۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں نئی نسل کے شعراء میں جوش ملیح آبادی۔ فسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم اور مختصر فسانہ نویسی میں پریم چند بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

پچھلے دس پندرہ سال سے نوجوان لکھنے والوں کی ایک نئی جماعت پیش پیش نظر آتی ہے جو ہمارے آج کل کے ہیجانی اور انقلابی دور کی پیداوار ہے۔ اس کا نقطۂ نظر گو محدود ہے لیکن نرالا ہے اور ان کا اسلوب تحریر نہ صرف مختلف بلکہ نیا ہے۔ یہ اُن نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی منضبط جماعت ہے جو اپنے تئیں "ترقی پسند مصنّفین" کے لقب سے موسوم کرتی ہے اور جس نے محض اپنے ادبی کارناموں کو نئے ادب کا نام دے رکھا ہے۔ شبہ نہیں کہ بعض لحاظ سے ان نوجوان ادیبوں نے اُردو کے نئے ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور کچھ اور ترقی کی راہیں نکالی ہیں۔ ترقی پسند ادب کی بعض خصوصیات یہ ہیں۔ اس کا دائرہ ادب تنقید نگاری۔ مختصر فسانہ نویسی اور نئے طرز کی شاعری تک محدود ہے بعض لکھنے والوں نے چند ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں اس میں وہی ادیب اور شاعر شامل ہیں جنہوں نے ۱۹۳۵ء سے پانچ سات برس پہلے یا اس کے بعد لکھنا شروع کیا ہے ان کا نقطۂ نظر ان کے موضوع۔ ان کے عنوان اور ان کے اسالیب سب عقیدۂ اشتراکیت کے پابند ہیں اور ان کے لٹریچر پر کمیونزم کی مُہر ثبت ہے۔ قاعدے، اصول اور انصاف کی رو سے

تو ان سب شاعروں اور ادیبوں کا شمار جن کا اب تک حوالہ دیا گیا ہے اور جن میں ہمارے نوجوان شاعر اور ادیب بھی شامل ہیں۔ ترقی پسند مصنفین میں ہونا چاہئے۔ لیکن اس ہٹ دھرمی کا کیا علاج کہ ہمارے یہ نوجوان ادیب و شاعر ترقی پسند کا لقب صرف اپنے لئے ہی مخصوص اور محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور اُردو صحافت کی اصطلاح میں فی زمانہ نیا ادب اُسی لٹریچر کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا تعلق ترقی پسند مصنفین کی جماعت سے ہے۔

ہمارے اس نئے ادب کے دعوے دار نئے اور پُرانے ادب کی تفریق بالعموم ان اصولوں پر کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ جو ادب محض رومانی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت نگاری سے گریز کرتا ہے وہ ادب نیا ادب کہلانے کا مستحق نہیں۔ نیا ادب وہی ہے جو انسان کی محض روحانی جذبات کی عکاسی نہیں بلکہ مادّی زندگی اور ضروریات اور اجتماعی حیثیت سے قومی ارمانوں اور ولولوں کی ترجمانی کرتا ہو، جو زندگی کے دھارے سے الگ تھلگ رہ کر نہیں بلکہ انقلابات زندگی کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرکے اور اس کا ساتھ دے کر بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے کی منزلیں طے کرے۔ دویم یہ کہ وہ کسی خاص طبقہ یا گروہ کی نہیں بلکہ جمہور عام کی زندگی۔ اُن کے جذبات اور اُن کے ارمان وولولوں کا ترجمان ہو۔ میں عرض کروں گا کہ اسی نظریہ کو پیش نظر رکھ کر اگر آپ حالؔی، اقبالؔ، چکبستؔ اور حسرتؔ کی شاعری پر نظر کیجئے تو کیا آپ ان کو نئے ادب کے دائرے سے خارج کرسکتے اور ترقی پسند مصنفین کی جماعت سے

نکال سکتے ہیں؟ سرشار نے فسانۂ آزاد اور اپنے دوسرے ناولوں میں اپنے زمانہ کی سوسائٹی کی جیسی سچی اور اچھی تصویریں کھینچی ہیں وہ فسانہ نگاری اور نئے ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔

ان کی تصویریں کہنے کو تو کاغذی اور قلمی ہیں لیکن جس وقت ہمارے سامنے آتی ہیں تو ایسی ہی جیتی جاگتی۔ بولتی چالتی اور چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں جیسے اصلی زندگی میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اسٹیج پر ہر ایکٹر اپنا اپنا اصلی پارٹ کر رہا ہے۔ ان کا اسٹیج کسی خاص تماشے کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر طبقہ۔ ہر پیشہ۔ ہر فن اور ہر کرتب کے کھلاڑی ان کی مصوری کے کنویس پر جمع ہو کر زندگی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ نوابوں اور ان کے مصاحبوں وکیل، بیرسٹر، ڈاکٹر، حکیم بنگالی بابو جنہیں اپنی گویائی اور فصاحت پر بے حد ناز ہے تھوسوفی کے لیکچرر اور تعلیم نسواں کے حامیوں سے لے کر کارندوں، گماشتوں، کسانوں اور مزدوروں تک سب ہی اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ بازاروں اور میلے ٹھیلے میں تماش بین، ارباب نشاط۔ عیار، بدمعاش، لفنگے۔ بٹیر باز، چانڈو باز، ساقنیں، بھٹیاریاں اور مہریاں زندگی کے تماشے اور دوڑ دھوپ میں چل پھر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس زندگی کے دھارے میں سب ہی بہے جا رہے ہیں۔ کوئی چپ چاپ اور ساکت نہیں کھڑا ہے۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان آدا اور ذات شریف میں لکھنؤ کے پرانے زمانہ کی سوسائٹی کی ایسی سچی اور پیاری تصویر کھینچی ہے جس میں اس کے چشم و ابرو اور خد و خال صاف صاف دکھائی دیتے ہیں اور رگ رگ

پھڑکتی معلوم ہوتی ہے اور ان میں خون دوڑتا نظر آتا ہے۔ کیا ان کے شاہکار نئے ادب کے لئے باعث ناز نہیں؟ کیا ان کے کسب کمال میں ترقی پسندی کی جھلک نظر نہیں آتی؟ ہاں یہ اعتراض ضرور باقی رہتا ہے کہ ان کی عکاسی اور مصوری محض کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کی ترجمانی کے لئے وقف نہ تھی اور وہ آج کل کے ہیجانی دور کے ہنگامی انقلاب کے پیام بر یا ترجمان نہیں کہے جا سکتے تو اس کا تو ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ پیش از وقت پیدا ہوئے لیکن چونکہ زندگی اور موت پر کسی کو اختیار نہیں لہذا یہ اُن کا قصور نہیں کہا جا سکتا۔

میں اس کا تو ضرور قائل ہوں کہ ادب قوم کی اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رہ کر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ زندگی کی ارتقائی منزلیں طے کرنے میں ادب کا رجحان و رویہ ترقی پسند ہونا چاہئے نہ کہ مائل بہ پستی۔ لہٰذا اجتماعی زندگی کی منزل مقصود تک پہنچنے میں ہمیں جتنی بھی مسافت طے کرنی پڑے ہمارا ادب اس کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

یہ تو صحیح ہے مگر زندگی نام ہے خون کے دوڑنے پھرنے کا ہماری ہر رگ و ریشہ میں جسم کے تمام اعضاء میں خون کی روانی کو جسم کے ایک حصّہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعی زندگی کا اطلاق قوم کے تمام اور ہر طبقے پر ہوتا ہے صرف اکثریت یا اقلیت پر نہیں اگر پرانے ادب کا نقص یہ تھا کہ وہ صرف اقلیت کے مخصوص طبقے کی زندگی کی ترجمانی کرتا تھا تو نیا ادب اس نقص کو صرف اکثریت کے مخصوص

طبقے کی آئینہ داری کر کے دور نہیں کر سکتا۔ ادب جب ہی پروان چڑھ سکتا ہے جب وہ ہماری اجتماعی زندگی کا بہ حیثیت کل ترجمان اور آئینہ دار ہو۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی کتاب "ادب اور انقلاب" میں وہ اعلان نامہ جو ساہتیہ پرشد کے ناگپور والے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء میں نئے ادب کے مقاصد کی توضیح کے لئے مصنف نے لکھ کر سنایا تھا۔ بطور پیش لفظ شامل کیا گیا ہے۔ اس کا آخری حصہ ملاحظہ ہو :-

"احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حال زار ہمیں بے حس کیوں رکھ سکتا ہے اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چونے سے بیکاری اور افلاس کے داغ دھوئے جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو۔ وہ کیا کہے۔ کیسے کہے اور کس طریقہ سے کہے۔ چنانچہ ہندستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ ثابت کر کے دکھائیں کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہو اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہو۔"

اس اعلان نامہ پر پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق،

آچاریہ نرندر دیو، منشی پریم چند اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے دستخط ثبت ہیں۔

میں اس میں دو ترمیمیں پیش کرتا ہوں۔ اولاً "زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے" کی جگہ "اگر زندگی کے اہم مسئلوں میں یہ شامل ہے" دوسرے "زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہو" کی جگہ "زندہ اور صادق ادب کی خصوصیتوں میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ سماج کو بدلنا چاہتا ہو" بظاہر یہ ترمیمیں لفظی ہیں لیکن اصول اور ترمیموں میں نقطۂ نظر کا فرق ہے ان ترمیموں کے ساتھ میں اس اعلان نامہ کو قبول کرنے کو تیار ہوں۔

نئے ادب کا ذخیرہ تین صنفوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) فسانہ، ناول اور ڈراما۔ (۲) نئی شاعری۔ (۳) تنقید نگاری۔

نئے ادب پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی دو تین باتیں بیّن نظر آتی ہیں۔ اول تو پنجاب کے لکھنے والوں کو فسانہ، ناول اور ڈرامہ زیادہ مرغوب ہے۔ نئے ادب کے فسانے۔ ناول اور ڈرامے معدودے چند کو چھوڑ کر تقریباً سب ہی پنجاب کی پیداوار ہیں۔ آزاد نظم یا نئی شاعری بھی زیادہ تر پنجاب ہی میں محدود ہے۔ دوسری بات جو کسی قدر عجیب ہے یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پنجاب کے باہر کے ادیبوں نے تو کارل مارکس کے عقیدۂ اشتراکیت کا اثر قبول کیا ہے مگر پنجاب کے لکھنے والوں پر زیادہ تر فرائڈ کے اصول و فلسفہ اور نفسیاتی تجزیہ کا رنگ بہت گہرا چڑھا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اشتراکیت کے عقیدے

کا اثر قبول نہیں کیا ہے لیکن ان پر زیادہ تر جادو فرائڈ کے نفسیاتی تجزیہ کا ہی چلتا ہے۔ تیسری بات جو صاف نظر آتی ہے یہ ہے کہ نئے ادب والوں نے جو قابل قدر اضافہ اردو ادب میں کیا ہے وہ صنف تنقید نگاری میں ہے۔ اختر رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین۔ عزیز احمد حیدر آبادی غرضیکہ تقریباً سب ہی پایہ کے لکھنے والے پنجاب سے باہر کے ہیں۔ اردو مختصر فسانہ نگاری میں پریم چند کا مرتبہ بہت بلند اور ان کی حیثیت سب سے اونچی ہے۔

اسی طرح دور حاضر کے شعراء میں جوش ملیح آبادی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ گو میری رائے میں تو پریم چند اور جوش کو ترقی پسند مصنفین میں شامل کرنا کچھ زبردستی سی ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں گاندھی جی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے اس لئے اُنہیں گاندھی وادی تو کہہ سکتے ہیں ترقی پسند نہیں۔ وہ توست جگ یعنی (A readian life) اور رام راج یعنی Pastural age کے دلدادہ ہیں۔ اُن سے (Karl marx) اور کارل مارکس کے فلسفہ سے تو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ رہے جوش ملیح آبادی سو اُن کی شاعری اور اُن کی شخصیت اجتماع ضدین ہے۔ وہ شاعر باکمال ہیں اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کی متعدد نظمیں اور رباعیاں حُسن کارانہ اور آزاد خیالی دونوں کے لحاظ سے بہت اونچے پائے کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ لیکن شاعر انقلاب کا خطاب اُنہیں کچھ زیب نہیں

دیتا۔ ان کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ اکثر و بیشتر بقول مجنوں گورکھپوری کے ایک کف در دہاں چیخ سے زیادہ وقیع نہیں۔ جوش کی یہ شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکلی ہے۔

اور "خاتونِ مشرق" اور "خاتونِ مغرب" میں ترقی پسند ہونا تو درکنار وہ کسی دقیانوسی زمانہ کے پیرو مرشد معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال توجہ کے قابل یہ بات ہے کہ یہ دونوں صوبہ متحدہ کے ہی ہیں یعنی پنجاب کے باہر کے۔ پنجاب سے جو لٹریچر شائع ہو رہا ہے وہ زیادہ تر وقتی اور بازاری ہے جس کی مانگ تو ضرور ہوگی لیکن حیثیت کچھ نہیں۔ پنجاب والے بُرا نہ مانیں۔ ان میں بڑی خوبیاں ہیں، کس بَل ہے، حوصلہ و ہمت ہے۔ جوشِ عمل ہے۔ لیکن فطرت اپنی سب ہی خوبیاں تو کسی ایک کو نہیں دے دیتی۔ ان کے ادب میں ادبیت کا عنصر بہت کم ہوتا ہے اور خرافات زیادہ۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ نئے ادب میں خوبیاں بھی ہیں اور عیوب بھی۔ بعض عیوب نہایت سنگین ہیں۔ میں پہلے اس ادب کی خوبیوں پر سرسری نظر ڈالوں گا۔ اس کے بعد عیوب پر۔ نئے ادب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کے پڑھنے والے کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کی ترغیب ہوتی ہے۔ ہماری قدامت پرست سوسائٹی نے اپنی روایتی قدامت پرستی کے ذریعہ سے ادب کا بھی گلا گھونٹ رکھا تھا۔ اول تو جس ماحول میں ہمارے آباؤ اجداد نے پرورش پائی تھی اس میں نئے خیال یا ذاتی رائے کا گزر ہی کب تھا۔ زمانہ نے جب کروٹ بدلی تو نئی روشنی کے ساتھ نئے نئے

خیال بھی دماغ میں آنے لگے۔ ہم نے پرانی روایتوں، ریتوں اور رسموں سے گزر کر کچھ نئے راستے دریافت کرنے شروع کئے لیکن ابتدا میں ہماری آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ البتہ اب ہم اپنے خیال اور رائے کو نہ صرف آزادی بلکہ بے باکی سے ظاہر کرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ انقلاب میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن نئے ادب نے بھی اس کی ترغیب دی۔ یہ نہیں کہ نئے ادب والوں کی رائیں ہمیشہ صائب ہی ہوتی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آزادی سے تجاوز کرکے ہم بے باکی کے عادی ہوتے جاتے ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نئے ادب سے آزادئ خیال اور آزادئ عمل کی ترغیب ہوتی ہے اور یہ نئے ادب کی خصوصیت اور خوبی ہے۔

اب تک جو کچھ لٹریچر اردو میں شائع ہوتا رہا ہے اُس کا ایک بڑا حصّہ فرقہ وارانہ قومیت کے عیب سے پاک نہیں رہا اور ہماری سیاسی جدوجہد کی کشمکش کے زیر اثر اردو کی صحافت تو زیادہ تر قومی تعصبات کا شکار ہوتی رہی۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ نئے ادب کا دامن قومی تعصب کے داغ سے بالکل پاک و صاف ہے۔ یہ نئے ادب کی دوسری خصوصیت ہے۔

اب تک ہمارا ادب متوسط درجہ کی سوسائٹی کی معاشرت و آداب، رسم و رواج، عادات و اطوار کے اظہار کا آئینہ دار رہا ہے کسان، مزدور، نوکر چاکر، محنت کشوں، نوکرشاہی کے پنجہ میں گرفتار طبقوں اور جسم فروشوں کی جانب پرانے ادب نے نئے ادب کی طرح توجہ نہیں کی۔ مانا کہ یہ ہمارے ادیبوں کا قصور نہیں

بلکہ زمانہ کا چلن ہی ایسا تھا۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ادب اس
جانب سے لاپرواہ رہا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کا ذکر ہمارے ادب میں
نہیں ملتا۔ سرشارؔ اور مرزا رسواؔ کے ناولوں میں مزدور، نوکر چاکر، ارباب
نشاط، غرضکہ نچلے طبقے کے سب ہی لوگ اپنی اپنی جگہ اپنا کام کرتے
ہیں۔ لیکن ناول کا ہیرو اعلیٰ طبقے کا ہی ہوتا ہے جس طرح چاند کے گرد
ستارے پھیلے ہوتے ہیں اسی طرح اونچے طبقے کے ایک ہیرو کے گرد
نچلے طبقے کے حوالی موالی اکھٹے رہتے ہیں۔ نوکر چاکر، کسان مزدور،
طوائف یا کسبی کی خود کوئی حیثیت یا حقیقت نہیں تھی۔ نئے ادب کا
طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اُس نے ہمیں کسان مزدور نوکر چاکر اور طوائف
اور کسبی کی حیثیت، حقیقت اور ہستی سے روشناس کیا۔ اُس کی
قدر و قیمت قرار دے کر ہمیں بتایا کہ یہ طبقہ بھی دائرۂ انسانیت سے
خارج نہیں۔ یہ پست سمجھے جانے کے مستحق نہیں بلکہ ہماری ہمدردیوں
کی انہیں ضرورت ہے۔ وہ آوارہ اور بے کس عورت جس کو
سوسائٹی گنہ گار قرار دے کر انسانیت کے دائرہ سے خارج کر دیتی
ہے۔ دراصل گنہ گار نہیں بلکہ مظلوم ہے۔ مرزا رسواؔ نے "امراؤ جان
ادا" ناول میں طوائف کی زندگی کا جیسا مکمل خاکہ پیش کیا ہے اُسے
پڑھ کر اس زمانہ کی سوسائٹی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے
آجاتی ہے اسی خصوصیت نے امراؤ جان ادا کو اردو افسانوی
ادب کا شاہکار بنا دیا ہے۔ اردو میں اس کا خاص مرتبہ ہے جو
فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نئے ادب میں ڈھونڈھے سے بھی ایسا
شاہکار نہیں ملے گا۔ لیکن یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ مرزا رسواؔ کی

امراؤجان ادا اونچے درجہ کی پیشہ ور طوائف ہے مظلوم عورت نہیں، نئے ادب کی کسبی کہنے کو تو کسبی ہے لیکن در اصل وہ ایسی مظلوم عورت ہے جو انسانیت کے نام پر دہائی دے رہی ہے۔ دونوں میں یہی فرق ہے اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔

مزدور کسان، نوکر چاکر، کسبی، اور آوارہ عورت کی انسانیت، قدر وقیمت اور حیثیت ہماری نگاہوں میں قائم کرکے نئے ادب نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے اس احسان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اور یہی اس کا کارنامہ ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پریم چند کے "گؤدان" کو چھوڑ کر جس میں ہمارے یہاں کی دیہاتی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے، ترقی پسند ادیبوں نے کسان، مزدور یا کسبی کی زندگی کی اب تک کوئی ایسی مکمل تصویر پیش نہیں کی ہے جو امراؤجان ادا یا گؤدان سے زیادہ واضح ہوتی (کم از کم میری نظر سے نہیں گزری)، جس کو دیکھتے ہی ہم اس کی انسانیت، بے کسی اور مظلومیت کے اس طرح قائل ہو جاتے اور ہمارے دل پر اس طرح چوٹ لگتی کہ ہم تڑپ کر اس کا دکھ درد دور کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے اور ہمارے عزائم جوشِ عمل سے پیدا ہو جاتے۔

ترقی پسند مصنفین کے ادبی محاذ نے ہمیں چونکا تو کر دیا ہے لیکن بعض اوقات احتجاج کی یہ آوازیں ایسی ترش و تند ہو جاتی ہیں کہ جذبات کا دلوں میں غلبہ تو ہو جاتا ہے۔ مگر قوتِ عمل بیدار نہیں ہوتی کیونکہ ابھی تک احتجاج کی یہ آوازیں ہمارے محنت کشوں اور نوکرشاہی کے پنجہ میں گرفتار لوگوں کی نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ترقی پسند ادب میں جوش

خروش تو بہت ہے لیکن ادبیت کا عنصر بہت کم ہے۔ جمالیاتی ذوق
پاکیزگیٔ جذبات اور احساس کے توازن کی کمی ہے جو آرٹ کی جان
ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس تمام افسانوی ادب میں کوئی بھی افسانہ
ایسا نہیں جس پر حُسن کاری کے لحاظ سے نظر انتخاب نہ پڑے۔ لیکن
معدودے چند ہی اس تعریف میں آئیں گے۔ اور بعض تو بہت
خوب ہیں۔

عصمت چغتائی کے لکھنے کا ڈھنگ بڑا اچھا ہے، زبان اپنی
ہے، انداز بیان کے کیا کہنے، حُسن کاری کی جھلک ان کے افسانوں
میں اکثر ایسی ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات افسانے میں ایسی کہہ دیتی ہیں
جو یادرہ جاتی ہے، چونکہ خود عورت ہیں، عورتوں سے متعلق جو کچھ لکھتی
ہیں اس میں سچائی بھی ہوتی ہے اور اثر بھی۔ ان کا افسانہ "بھول بھلیاں"
خوب ہے اور "چھوٹی آپا" بھی۔ "پنکچر" بھی اچھا ہے۔ اور "پیشہ"
میں ہمارے یہاں کی آج کل کی فیشن ایبل سوسائٹی اور نئی تہذیب کی
تعلیم یافتہ لڑکیوں اور عورتوں کا خوب ہی چربہ اُتارا ہے۔
بعض بعض ایسی چٹکیاں لی ہیں کہ پڑھ کر طبیعت پھڑک جاتی ہے۔
البتہ کہیں کہیں عریاں نگاری بے حد شاق گزرتی ہے چنانچہ "پیشہ"
میں کئی جگہ بڑی بے باکی سے کام لیا ہے۔ مصوّر کو اپنے آرٹ کی تکمیل
کے لئے بعض اوقات عریاں نگاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن
جان بوجھ کر بعض حجابات اُٹھا دینا حُسن کاری نہیں۔ "پیشہ" میں
جہاں جہاں اُنھوں نے عریانی یا بے باکی سے کام لیا ہے۔ وہ زیادہ
قابل اعتراض نہیں۔ ان کے ناول "ٹیڑھی لکیر" کا اول نصف حصہ

جس میں اُنہوں نے ماڈرن گرل (modern girl) کی تصویر کھینچی ہے مکمل ہے۔ اس میں عصمت نے بتایا ہے کہ ہمارے گھروں میں بچوں کی پرورش اور تعلیم کس طرح ان کی زندگی کی "لکیر کو ٹیڑھا" کر دیتی ہے یہ ناول فنِ ناول نگاری کا کمال اور اردو ادب میں اپنے رنگ کا نیا اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ سعادت حسن منٹو کو تو گندگی اُچھالنے اور کیچڑ میں لوٹنے ہی میں مزا آتا ہے۔ اس لئے تعجب ہوتا ہے کہ "شوشو" اور "میرا اس کا انتقام" دونوں افسانے انہیں کے قلم سے نکلے ہیں۔ یوں تو ممتاز مفتی نفسیاتی تجزیہ کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ایک بیماری سی ہو گئی ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ان کا افسانہ "آپا" بہت ہی خوب ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی "کاغذی ناؤ" بھی بُری نہیں۔ مختصر یہ کہ لے دے کر آٹھ دس افسانے بچتے ہیں۔ ممکن ہے اور بھی دس پانچ ہوں جو اس وقت دھیان سے اُتر گئے ہیں پریم چند کا ذکر نہیں۔ ان کے علاوہ نئے ترقی پسند مصنفین کے افسانوں کی تقریباً ۴۰ جلدیں میری نظر سے گزری ہیں جن میں کئی سو افسانے شامل ہیں۔ ان میں پندرہ بیس کی کیا حقیقت ؟

ترقی پسند ادب کی خوبیوں کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ اب اس کے عیوب پر بھی سرسری نظر ڈالنی ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ نئے ادب کے پنجاب کے افسانہ نگاروں پر فرائڈ کے فلسفے کا بڑا گہرا رنگ چڑھا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مارسل پیرا دسٹ اور ڈی ایچ، لارنس کے طرز اور رنگ ڈھنگ کا تتبع کیا ہے بذاتِ خود نفسیاتی تجزیہ کوئی بُری چیز نہیں۔ افسانہ نگار کو بعض اوقات

اپنے آرٹ کی تکمیل کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ خاص کر ناول میں کردار کی خصوصیتوں کے اُجاگر کرنے کے لئے نفسیاتی تجزیہ بعض اوقات کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ ڈوستو وسکی نے اپنے مشہور ناول (Crime and Punishment) میں جس طرح اپنے ہیرو کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اُس نے اُس افسانہ کو اس کا شاہکار بنا دیا ہے لیکن جب ادیب یا افسانہ نگار نفسیاتی تجزیہ یا کیفیت لاشعور کا ایسا شیدائی ہو جائے کہ یہی اس کے آرٹ کی غرض و غایت بن جائے تو پھر یہ ایک روگ بن جاتا ہے اور جب کسی ادب کے کم و بیش آدھے سے زیادہ افسانہ نگار اس روگ میں مبتلا ہوں تو یہ نہایت ادنیٰ درجہ کا ادب پیش کرنے لگتے ہیں مارسل پراؤسٹ کے بارے میں جس کا تتبع یہ افسانہ نگار کرتے ہیں کہا گیا ہے کہ "اس کے کیرکٹر جذباتی تعیش کے ایسے روگی ہوتے ہیں کہ اُن کو معمولی بنی نوع انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس نے (Homo Sapiens Hedonism) پر شد و مد سے لکھا ہے۔ سوسائٹی کی عیش پسندی کے علاوہ دنیا کی کسی اور بات سے اُسے دلچسپی نہیں۔ یہی بات اس کی شہرت پر داغ ہے اور یہی ایک حد تک اس کے مقبول ہونے کی وجہ۔ ڈی۔ ایچ لارنس کی افسانہ نگاری بھی انگریزی ادب کے انحطاطی دور کی پیداوار ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے ترقی پسند ادیبوں کے سامنے کیسا بلند نصب العین پیش کیا تھا۔ لیکن ان کے رفقائے کار نے ادب کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔ کچھ رفتار زمانہ ہی ایسی ہے کہ مغرب کا اثر قبول کئے بغیر چارہ

ہی نہیں۔ اصل میں یہ بُرا بھی نہیں کیونکہ اس سے ہماری ترقی کی رفتار تیز ہوسکتی ہے لیکن مغربی قوموں کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں شریک ہونا ایک بات ہے اور مغرب کی نقالی بالکل دوسری بات۔ کون نہیں جانتا کہ شرر کے افسانہ نگاری کا طرز سرو. لٹر اسکاٹ کے آرٹ کا مرہونِ منت تھا۔ غالباً سرشار نے جب فسانۂ آزاد لکھنا شروع کیا تو ڈکنس اور تھیکرے کی فسانہ نگاری ان کی نظروں کے سامنے تھی لیکن اُنھوں نے جو اثر انگریزی فسانہ نگاروں سے قبول کیا اس کو انھوں نے اپنا لیا تھا کیرکٹر اپنے تھے۔ جس سوسائٹی کا چربہ اُتار تے تھے اس کے رگ و ریشہ سے واقف تھے۔ نصف صدی سے زیادہ گزر گئی اُن کا آرٹ آج بھی زندہ ہے اس وجہ سے نہیں کہ انھوں نے نئی فن کاری یا مغربی تکنیک کا سہارا لیا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خود آرٹسٹ تھے۔

ترقی پسندوں کی یہ تہی دستی ہے کہ نہ خیال و مضمون اپنا نہ کیریکٹر اپنے، حتیٰ کہ زبان بھی اپنی نہیں اور اگر کچھ ترجمہ کرتے ہیں تو اس کا بھی پورا سلیقہ نہیں، پراؤسٹ اور لارنس کے بار بار چبائے ہوئے مضمون کو نگلتے ہیں، ہضم کر نہیں سکتے بار بار ویسا کا ویسا ہی اُگل دیتے ہیں اور ایسی صورت میں کہ دیکھ کر کراہت ہوتی ہے۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ آپ مغرب کی نقالی کرتے ہیں۔ تو خفا ہوتے ہیں۔ پراؤسٹ، لارنس، چیخوف، گورکی، یا زولا کو منہ چڑھانے سے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ اپنی پونجی بھی ہونی چاہیئے۔

ایک سوال! کیا میں نئے ترقی پسندوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ پھسلن۔ چلنے کی پیالی۔ موتری۔ بلاؤز۔ پچھایا۔ خوشیا۔ لحاف

جال اور ایسے ہی بیسیوں افسانوں سے زندگی اور ادب کا کونسا مقصد پورا ہوتا ہے یا یہ ہمارے بُرے رسم ورواج یا سوسائٹی کے کون سے قبیح پہلو پر روشنی ڈالتے یا ہم میں ترقی پسندی کا رجحان پیدا کرتے ہیں ؟

عریاں نگاری کی ایسی مثالوں کے جواز میں کرشن چندر صاحب ایم۔ اے (جن کا چرچا ترقی پسند حلقوں میں بہت کچھ تعریف و توصیف سے کیا جاتا ہے اور جو اس جماعت کے روح رواں سمجھے جاتے ہیں) فرماتے ہیں :-

"جنسی موضوعات اور انسانی اجسام کے اعضاء کی عکاسی سے جو قدرتی صحت مند نشاط وابستہ ہے اُس سے ہر قاری کا ذہن متاثر ہوتا رہے گا لیکن اگر یہ تاثیر ایک سچا صحت مند نشاط نہیں بڑھاتا اور مریضانہ تخریبی پہلو اختیار کر لیتا ہے تو واقعی اس کے نتائج مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔

اساتذۂ قدیم میں تو اس تعیش پسندی کے بیشتر نمونے ملتے ہیں جو غالباً جاگیرداروں اور درباروں کے لئے ممسک دواؤں کا کام دیتے تھے۔ مجھے تو یہ شکوہ ہے کہ ہمارے ادیبوں کے یہاں وہ صحت مند نشاط بھی مفقود ہے جو اکثر ترقی پسند روسی انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ ہمارے نئے ادیب تو اکثر اوقات عورت اور مرد کے اجسام کا اس انداز سے ذکر

کرتے ہیں کہ ترغیب تو درکنار اُلٹی گھن آنے لگتی ہے وہ
بسا اوقات حُسن کی تشکیل نہیں کرتے جو میٹری کی اشکال
پیش کرتے ہیں۔ صحت مند جسم نہیں دکھاتے۔ بیمار جسموں کو
ننگا کرتے ہیں حتیٰ کہ آپ اُن کے گلے سڑے اعضا پیپ
اور لہو رِستے ہوئے ناسوروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ
فحاشی ہے تو ہر ڈاکٹر فحش پسند ہے۔"

رونا تو اسی بات کا ہے کہ اُس آرٹ میں جس کا خمیر جمالیاتی
ذوق اور لطافتِ جذبات سے گوندھا گیا ہو خواہ عریاں نگاری ہی
کیوں نہ کی گئی ہو لیکن وہ قدرتی صحت مند نشاط کی کیفیت تو پیدا
کر سکے اگر آپ کے یہاں بالکل مفقود نہیں ترقی پسندوں کے یہاں اس کی کمی
ضرور ہے۔ ایسے بیمار جسموں کو ننگا کرنے میں ان کو کچھ ایسا لطف آتا
ہے اور ایسے مزے لے لے کر اس گندگی میں لوٹتے ہیں کہ جس سے
مریضانہ تعیش پسندی کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ
جو خواہشیں زندگی کی مجبوریوں نے پوری نہیں ہونے دیں یا جو کسی
زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں اُن کی یاد سے دل بہلا کر ذہنی عیاشی کی
جا رہی ہے۔ کرشن چندر فرماتے ہیں کہ "اگر یہ فحاشی ہے تو ہر ڈاکٹر
فحش پسند ہے" مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی حیثیت ڈاکٹر یا
طبیب کی نہیں بلکہ ادیب اور فسانہ نگار کی ہے۔ آپ طب کی کتابیں
نہیں لکھتے بلکہ ترقی پسند ادب کی تخلیق کے دعوے دار ہیں۔ آپ اس
کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب ڈاکٹر یا طبیب اپنی کتابوں میں جسموں
کو عریاں کرتے ہیں تو اس طرح چٹخارے اور مزے لے لے کر نہیں

جس طرح آپ کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹری میں عریاں نگاری لازمی ہے بلکہ فرض کی حد تک ضروری ہے۔ لیکن یہاں اسے فحاشی ہی کہا جائے گا۔ رہا یہ امر کہ عریاں نگاری اور فحاشی کی مثالیں ہمارے پُرانے اردو ادب میں بھی کافی ملتی ہیں یہ غلط نہیں۔ لیکن وہ تو زمانۂ جاہلیت کے نمائندے اور عیش پرستی کے ترجمان تھے . . . . .
ترقی پسند ادب تو چشم بدور انقلاب کا ترجمان ہے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے نمائندے نئے ادب کی تخلیق کے دعوے دار!
ان کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ ورنہ پھر ترقی پسندوں میں اور اُن میں جنہیں ترقی پسند مطعون کرتے ہیں کیا فرق رہ گیا ؟

جمالیاتی ذوق اور لطافتِ جذبات ہر آرٹ کی جان ہیں۔ ادب زندگی کا سب سے بڑا آرٹ ہے۔ اگر شاعر یا ادیب کوئی ایسا حسین اور پاکیزہ تخیل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ جس سے ہم میں حسن و پاکیزگی کا احساس زیادہ رچ بس جائے تو ہم اتنی دیر کے لئے انسانیت کی بلند سیڑھیوں پر چڑھتے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ حسن و عشق کی ایسی تصویرکشی کرتا ہے جس میں خواہ ظاہری جاذبیت نہ ہو مگر معنوی حیثیت سے صلۂ رحم و ایثار نفسی، بے غرض سچائی اور پاکیزگی کی تمام صفات نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔

اگر وہ مظلوم و بیکس کے دُکھ درد کا بیان کرتا ہے تو ہمارے دل پر کچھ اس طرح چوٹ لگتی ہے کہ ہم تڑپ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور انسانی ہمدردی کے جوش کی کیفیت ہماری تمام تر قوت عمل کو متحرک کر دیتی ہے اگر شاعر آزادی کے نغمے سُناتا ہے تو

حب وطن کا جوش ہم میں ایسی بے خودی و وارفتگی پیدا کر دیتا ہے
کہ ہم مٹا دینے اور خود مٹ جانے کے لئے سر بکف ہو جاتے ہیں۔
غرضکہ اگر شاعر کی زبان اور ادیب کا قلم یہ تاثیر اور جادو رکھتا
ہے تو یہ اُس کا کمال ہے۔ ادبائے رجہ شاعری جمالیاتی ذوق اور لطافتِ
جذبات کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے وہ یقیناً اعلیٰ پایہ کی چیز ہے۔ یہ تو صحیح
ہے کہ شاعر یا ادیب اپنی خیالی دنیا میں رہتا ہے اور نت نئی دنیا
رچنے کا ارمان رکھتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر
اور ادیب بھی آخر ہیں تو انسان ہی اور اسی دنیا کی مخلوق! وہ جس
ماحول میں پرورش پاتے ہیں اُس کے اثر سے بچ نہیں سکتے جس ملک
قوم کا جو فرد ہوتا ہے اُس کے مخصوص خصائل اس میں ہونے ضروری
ہیں۔

روحِ عصر ادیب و شاعر پر بھی چھائی رہتی ہے۔ اسی لئے جس
اثر کو وہ قبول کرتے ہیں وہی اثر دوسروں پر بھی ڈالتے ہیں سوسائٹی
کے اعمال و افعال سے جس قدر وہ واقف ہو پاتے ہیں اتنی ہی ان کی
تصویر خوبی سے کھینچ سکتے ہیں اس معنیٰ میں وہ اپنے عصر کی زندگی کے
ترجمان ہوتے ہیں لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ شاعر کی انفرادی حیثیت
نہیں ہوتی۔ یا وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد نہیں ہوتا۔ باکمال
ادیب یا شاعر بعض اوقات نئے دور کا پیام بر ہوتا ہے اور دنیا
کو ایک تازہ پیام دیتا ہے جس کی بعض اوقات اس کے ہم عصر
قدر و قیمت نہیں سمجھ سکتے لیکن آنے والی نسلیں اس کے صحیح مرتبہ
کی تلاش کر لیتی ہیں اور اس کے پیغام کو سر آنکھوں پر لیتی ہیں۔

بعض اوقات شاعر یا ادیب زندگی کی ایسی حقیقتوں کا انکشاف کرتا ہے کہ جو دائم و قائم ہیں جن کی قدر و قیمت افتادِ زمانہ بھی بدل نہیں سکتی۔ زندگی کی ان حقیقتوں کا انکشاف آج بھی ہماری آنکھیں اسی طرح کھولتا ہے۔ ہمارے دل میں آج بھی وہ اسی طرح چٹکیاں لیتی ہیں۔

جس طرح سامنت کال میں یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکی یا جمہوری دور کی آیندہ نسلیں بھی ان کو آسانی سے بھلا نہ سکیں گی۔ کیا بات ہے کہ انقلابوں کے کئی طوفان اولادِ آدم کے سر پر ٹوٹے اور گزر گئے لیکن شیکسپیر کا نام آج بھی ادب سے لیا جاتا ہے۔ اور اس کی تصانیف شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ کیا بات ہے کہ میرا بائی، سورداس، کبیر اور تلسی داس کی شاعری آج بھی ہمارے دلوں پر جادو کا سا اثر ڈالتی ہے اعلیٰ اور متوسط طبقے کا ذکر نہیں، یہاں جمہور عام کا ذکر ہے۔ شہر کے مزدوروں اور دیہات کے کسانوں پر ترقی پسندوں کا جادو کس قدر چلتا ہے مجھے اس کا صحیح اندازہ نہیں مگر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کی ۹۰ فی صدی اَن پڑھ آبادی کی زبانوں پر آج بھی میرا، سورداس، کبیر، اور تلسی داس کے بھجن، گیت دوہے اور چوپائیاں اس طرح چڑھی ہوئی ہیں کہ آپ راہ گزرتے ہوئے سُن سکتے ہیں اور یہ ان مزدوروں اور کسانوں کی اندھیری زندگی میں تھوڑی سی روشنی کی جھلک پہونچاتے اور ان کے نراش دلوں کو ڈھارس بندھاتے ہیں۔

تہذیب و تمدن کی اس دنیا میں چھ سال تک آگ و خون کی

جو ہولی کھیلی جاتی رہی اس کو نازیت اور فسطائیت کے خلاف حریت اور جمہوریت کی جنگ کہا گیا ہے جمہوریت اور اشتراکیت نے نازیت کو زیر کر کے میدان میں فتح پائی لیکن دنیا دہشت وخوف جبر و ظلم، استحصال و بربریت کے شکنجوں میں آج بھی جکڑی ہوئی ہے۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ جو قومیں آج بیانگ دُہل مصنوعی جمہوریت اور فسطائی اشتراکیت کی دہائی دے رہی ہیں در اصل طاقت، جبر و اقتدار کی دیوانہ وار دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ ہے دیوانہ پن جس کی مہذب دنیا شکار ہے۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یہ تو معلوم نہیں کہ فانی نے زندگی کے کس حوصلہ شکن ماحول سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا لیکن اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ہمارے موجودہ دور تہذیب و تمدن کی سیاسی حقیقتوں پر پوری طرح چھا جاتا ہے بلکہ اس دور کی سیاسی افراتفری، کساد بازاری، چوربازاری ساہوکاری اور بد دیانتی کی محرکات پر صاف روشنی ڈالتا ہے۔ لہٰذا دور حاضر کے شاعروں یا ادیبوں کے لئے بڑا المیۂ فکر یہ ہے اگر مکروہات زندگی نے اُن کے عزائم اور عقیدوں کو قطعی طور پر کچل نہیں دیا ہے۔ اگر حسیات کی پاکیزگی اور لطافت ان میں ابھی باقی ہے اگر ان کے ضمیر کی روشنی اس فضائے جنون و وحشت کی گھنگھور گھٹاؤں میں بالکل گھٹ کر نہیں رہ گئی ہے اور اگر وہ شاعر و ادیب کی حیثیت اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھ سکے ہیں تو بجز

اس کے کچھ نہیں کرسکتے کہ جنون و وحشت، حرص و حسد، خونریزی وہ زندگی اور بربریت کا جو دور آج مہذب دنیا پر پڑ رہا ہے اس کے خلاف اپنی آواز بلند کریں اور عوام کو بتائیں کہ حریت، جمہوریت یا اشتراکیت کے اصول، آئین و نظام کے یہ پودے جو کل کی پیداوار ہیں اسی وقت تناور درخت کی شکل اختیار کرکے پھل پھول سکتے ہیں جب ان کی آبیاری سچائی، ایمانداری، محبت و ایثار و انصاف و رواداری، ضبط و استقلال اور ہمت سے کی جائے جو انسانی سرشت کے جوہر اور زندگی کی اصل حقیقتیں ہیں۔ یہی ادیب اور شاعر کا فرض ہے اور یہی اُسے کرنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے نئے ادب کے دعوے دار مُصر ہیں کہ شاعر اور ادیب کو بھی صرف سرخ وردی پہن کر اشتراکی حکومت کا بھاٹ بننا ہے۔

دیر و حرم کے قصّے

انقلاب زندہ باد کے نعروں سے جب تمام ملک کی فضا گونجی تو انقلاب برپا ہوا۔ جب انقلاب برپا ہوتا ہے تو زمین تہ و بالا ہوتی ہے۔ بستیاں اُجڑتی ہیں۔ آبادیاں منتشر ہوتی ہیں۔ لوگ خانماں برباد ہوتے ہیں۔ جانیں جاتی ہیں اور خون بہتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی یہ سب کچھ ہوا۔ بارے انقلاب کی غرض پوری ہو گئی۔ ملک نے صدیوں بعد آزادی حاصل کی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ آزادی و خود مختاری حاصل ہونے کے بعد ہم مضبوط بنیادوں پر ملک کی عمارت کی تعمیر شروع کرتے تاکہ یہ عمارت سربفلک اُٹھ کر ہمارے مرتبہ و حیثیت کو اونچا کرتی۔ لیکن اس وقت اس میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں۔ شبہ نہیں کہ ہماری نئی حکومت کا سکّہ سارے ملک پر بیٹھ گیا ہے۔ امن و امان قائم ہو گیا ہے۔ حکومت صحیح راستہ پر چل رہی ہے اور تعمیری کام شروع ہو گیا ہے لیکن چونکہ دورِ انقلاب کی ہیجانی کیفیت ابھی قوم کے سر سے اتری نہیں ہے۔ ہمارے ہوش و حواس ابھی برجا نہیں ہیں تعمیری کام میں ترقی نظر نہیں آتی۔ ہمارے دماغوں میں تھکاوٹ اور دلوں میں گھبراہٹ کی کیفیت دیکھنے میں آتی ہے اور ہماری روحیں بے چین ہیں۔ سوچ سمجھ کر صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت دکھائی نہیں دیتی ضروری قومی مسئلوں پر بھی ہم اس طرح رائے دیتے ہیں کہ گویا دل کا بخار نکال رہے ہیں۔ یہ کیفیت صرف عام لوگوں میں ہی دکھائی نہیں دیتی جو بالعموم جذبات کی رو میں بہتے ہیں بلکہ اچھے پڑھے لکھے

اور بعض اوقات قابل قدر اور صاحب مرتبہ احباب میں بھی ہیجانی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی بلکہ ادبی اور علمی شعبوں میں بھی ایک طرح کا ہیجان نظر آتا ہے۔ جب یہ کیفیت ہے تو زبان اور کلچر کا سوال بھی اس بحرانی کیفیت سے کیسے بچ سکتا تھا۔ تہذیب و تمدن، شائستگی یا کلچر کی بحث میں صحیح راستہ نکالنے کے لئے ہمیں دو تین باتوں کا جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ اول تو اس پرانے تہذیب و تمدن کا جس کے دور کو بیتے ہوئے اب سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس گزر گئے، خواہ اس کا تعلق کسی قوم یا ملک سے ہو۔ آج بیسویں صدی میں اپنے اصل رنگ روپ میں جیتا جاگتا واپس بلانا قطعی غیر ممکن ہے۔ دوسرے آج دنیا سائنس اور جمہوریت بلکہ اشتراکیت کے جس دور سے گزر رہی ہے۔ یہ نئی روشنی پھیلتے پھیلتے اب ساری دنیا کو منور کر رہی ہے اور جو مغربی یا نئی تہذیب کی ہوائیں آج چل رہی ہیں اُن سے اپنا دامن بچائے رکھنا یا اُن کے آگے آنکھیں بند کر لینا کسی ملک یا کسی قوم کے لئے ممکن نہیں۔ دنیا سکڑ کر آج اس قدر تنگ اور چھوٹی ہو گئی ہے کہ لندن سے کراچی مسافر ۳۰ یا ۳۶ گھنٹوں میں پہونچ جاتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ ہم سب سے الگ تھلگ رہ کر اس کلجگ میں اپنی ست جگ کی دنیا رچا سکیں۔ ہم لاکھ ایسا چاہیں مگر زمانہ ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ ہمیں اس کا اثر قبول کرنا پڑے گا۔ اگر یہ دونوں خیال صحیح ہیں، تو اپنے کلچر کا ٹھیک راستہ ڈھونڈھنے کا ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے یعنی ہم اس پر توجہ دیں اور

غور کریں کہ پچھلے ہزار برس کی تاریخ میں کون سے دور ایسے گزرے ہیں کہ جن کا اثر ہم نے اس طرح قبول کیا ہے کہ جو ہمارے رگ و ریشے میں پیوست ہو گئے ہیں جن میں ہم رس بس گئے ہیں اور اب ہمارے جو لوگ آج پراچین ہندوسبھتا کی قسمیں کھاتے ہیں وہ ہماری پچھلی ہزار برس کی تاریخ کے دوروں سے نظر چراتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بھول ہے جس طرح انسان اپنی خاندانی اثرات وروایات سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح وہ اپنے اردگرد کے حالات زندگی کے تجربوں اور تبدیلیوں سے بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہتا۔ یہی حال قوموں کا بھی ہے۔ ہمارے تہذیب و تمدن پر تاریخی دوروں، انقلابی کیفیتوں اور نئی نئی ایجادوں اور تجربوں کا اثر لازمی طور سے پڑتا ہے۔ ان کا رنگ ہم پر چڑھتا ہے اور بعض رنگ ایسے گہرے اور پختہ ہوتے ہیں کہ وہ نسلوں اور صدیوں پھیکے نہیں پڑتے آپ جب تہذیب و تمدن کی راہیں ٹٹولنے بیٹھتے ہیں تو آپ پر لازم ہوتا ہے کہ آپ گزشتہ دوروں کے تاریخی صفحوں پر ایک نظر ڈالیں میں اسی سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔

پراچین آریہ ورت کے ہندوؤں نے کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ۔ منطق۔ طب۔ نجوم اور ہندسہ وغیرہ علوم میں بڑا کمال حاصل کیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت حال ہے کہ علم تاریخ سے یہ بے بہرہ تھے اور اس کی ترتیب کا سلیقہ ان میں نہ تھا۔ تاریخ کی ترتیب اور اس کا مکمل کرنا ہم نے مسلمانوں سے سیکھا اسی لئے زمانۂ سلف کی تاریخ کی ترتیب اور تکمیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر ملکی مورخوں اور سیاحوں

نے بہت کچھ ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ ہوانگ سانگ۔ فاہین۔ البیرونی برنیر۔ ابینے ڈوبائے۔ ابن بطوطہ اور عبدالرزاق وغیرہ وہ مشہور نام ہیں کہ جنھوں نے اپنے سفرناموں میں اور روزنامچوں میں ہندستان کی تاریخ کے لئے بہت کچھ مسالا چھوڑا ہے۔ ان میں البیرونی کی حیثیت خاص طور سے ممتاز ہے۔ البیرونی محمود غزنوی کے ساتھ ہندستان آیا تھا چونکہ محمود کا لڑکا مسعود البیرونی کی بڑی قدر کرتا تھا۔ البیرونی کو ہندستان کے بڑے حصّے کی سیاحت کا موقع ملا۔ اُس نے یہاں رہ کر سنسکرت زبان اور لٹریچر پر قدرت حاصل کی اور چونکہ علم دوست اور فلسفی مزاج کا آدمی تھا اُس نے یہاں کے علوم و فنون کا گہرا اور بے لاگ مطالعہ کیا۔ وہ ہندو فلسفہ کا بڑا قدر دان تھا۔ اُس نے اپنی تصنیف میں ہندوستان کے متعلق اسّی باب لکھے ہیں۔ مذہب فلسفہ۔ ذاتوں کی تفریق۔ بُت پرستی۔ لٹریچر۔ سائنس۔ علم ہندسہ۔ طب۔ جغرافیہ۔ نجوم وغیرہ۔ مشکل سے کوئی بات ایسی چھوٹی ہو گی جس کا اُس نے گہرا مطالعہ نہ کیا ہو۔ اور اپنی بے لاگ رائے نہ ظاہر کی ہو۔ البیرونی ہندو فلسفہ طب ہندسہ اور نجوم کا بڑا قدر داں تھا اور اس نے ان کی موافقت میں بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ہندو کیریکٹر اور رسوم کے عیب بھی اُس کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے اور ان کی مذمّت کرنے میں اُس نے کوتاہی نہیں کی ہے۔ ذات کی تفریق۔ بُت پرستی اور اوہام پرستی ہندو عورتوں کی بیکسی اور بے چارگی اور جمہور عام کی زبوں حالت ان سب ہی کا پردہ اس نے فاش کیا ہے۔ ہندو راجاؤں کی حرص و طمع اُن کے مظالم اور نااتفاقی کا بھی تذکرہ اُس سے چھوٹا نہیں ہے۔ ابن بطوطہ نے

یہاں کی ستی کی رسم اور جوگیوں کے کرتبوں کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ شہنشاہ بابر نے یہاں آکر کیا دیکھا اور کیا سمجھا اس کا بھی سرسری سا حوالہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ بابر نے لکھا ہے "ہندستان کوئی دلچسپ جگہ نہیں یہاں کے لوگ خوبرو نہیں ہوتے۔ ان میں دوستانہ ارتباط قائم کرنے اور بڑھانے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ یہ تکلفات زندگی سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان میں فنوں کی ایجاد اور تکمیل کا مادّہ بھی نہیں پایا جاتا ان کے یہاں نہ اچھے گھوڑے ہوتے ہیں۔ نہ عمدہ گوشت۔ نہ انگور نہ تربوز اور اچھے پھل۔ نہ یہاں بازاروں میں اچھا کھانا ملتا ہے نہ برف کا پانی۔ نہ یہاں مدرسے ہیں نہ حمام بلکہ موم بتّی بھی بازار میں نہیں ملتی۔ نہ یہاں نہریں ہیں نہ باغات نہ محلات۔ فن عمارت میں موسم۔ نفاست اور آرام وغیرہ کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

کسان اور مزدور وغیرہ صرف ایک لنگوٹی لگاتے ہیں اور عورتیں لانگ باندھتی ہیں۔ البتہ ملک بہت وسیع ہے۔ چاندی سونے کی افراط ہے اور ہر پیشہ وفن کا کاریگر آسانی سے میسّر آجاتا ہے"۔

یقیناً یہ اُس زمانہ کا تذکرہ نہیں کہ جب قدیم آریائی تہذیب اور کلچر کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ چندرگپت موریا۔ اشوک وکرمادت اور ہرش کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یہ دور ہماری زوال پزیری کا تھا۔ اسمیں بھی شبہہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان دیکھنے اور لکھنے والوں کی تحروں میں نادانستہ طور سے ہی سہی۔ فاتح قوم ہونے کا زعم اور مذہبی تعصب اور عارضی قیام کی وجہ سے ناواقفیت بھی شامل ہوگی جس سے ان کی تحریروں میں مبالغہ نہ انداز پیدا ہو گیا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا

جاسکتا کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا اور سُنا اور یہاں کی اس زمانہ کی حالت کے بارے میں لکھا وہ بہت بڑی حد تک صحیح اور سچ مانا جاسکتا ہے کیونکہ اس کی تصدیق اُن سیّاحوں کے بیان سے ہوتی ہے جو فاتح قوم کی حیثیت سے نہیں آئے تھے بلکہ جن کی حیثیت محض سیاح کی تھی۔ کم و بیش یہ کیفیت تھی ہمارے ملک کی کہ جب مسلمان حملہ آور ہوئے اور انھوں نے اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنے مذہب کی تلقین اور تبلیغ کرنے کی کوشش عظیم کی۔ جب مسلمانوں کی حکومت یہاں مستحکم ہو گئی جب وہ ہندستان میں بس کر یہاں کے باشندوں کے ساتھ رس بس گئے اور ہندستان کو اپنا وطن بنا لیا اُس وقت کیا صورت رونما ہوئی۔ اس کا تذکرہ بھی توجہ کے قابل ہے۔

دیر و حرم کے انصال و اختلاط کا دور اکبر اعظم کے عہد میں شروع ہوا۔ اکبر کی ہی ذات تھی کہ جس نے پہلے پہل متحدہ ہندستانیت اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا خواب دیکھا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ اُس نے اپنی زندگی اور اپنے عہد میں اس خواب کو اصلیت اور حقیقت کی شکل دینے کی بلیغ کوشش کی تھی۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کے مسلک کا اور مشترکہ تہذیب و تمدن کا آغاز اس زمانہ میں ہوا اور جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد تک یعنی کامل سو برس تک یک جہتی اور اختلاط کا پودھا بڑھتے بڑھتے تناور درخت ہو کر پھولتا پھلتا رہا۔ اسلامی حملہ آوروں کے شروع دور میں مسلمان ہندوؤں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اُن کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کی تحقیر کیا کرتے تھے۔ ہندو بھی مسلمانوں کو ملیچھ سمجھتے اور

اُن سے دور دور رہتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں یہ کیفیت بدل گئی تھی مذہبی کٹرپن نے رواداری کو جگہ دی تھی اور علیٰحدگی کی جگہ ارتباط پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اکبر نے ہندوؤں کو اپنایا اُس نے اپنے گرد ایسے لوگ جمع کئے کہ جو اُس کے مقصد میں اُس کے مددگار ہوئے۔ فیضی۔ ابوالفضل۔ مرزا عبدالرحیم خاں خانخاناں۔ نظام الدین بدایونی کے سپرد یہ خدمت تھی کہ وہ ہندوؤں کے دھرم شاستر۔ ان کے فلسفے اور لٹریچر کے سنسکرت سے فارسی میں ترجمے کریں۔ اکبر نے مہاراجہ بھگوان سنگھ اور اس کے نامور بھتیجے مان سنگھ، راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کو اپنے دربار میں وہی منصب و مرتبہ دیا جو مسلمانوں کو حاصل تھا۔ راجہ مان سنگھ ایک زمانہ میں بنگال اور کابل کا گورنر رہا۔ راجہ ٹوڈرمل مشیر مال تھے۔ جے پور اور جودھ پور کے راجپوتی خاندانوں سے ازدواجی تعلقات قائم ہوئے۔ ہندوؤں کا دل ہاتھ میں لینے کے لئے اکبر نے گوشت کا استعمال تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ہندو رانیوں کے ساتھ اُن کے مذہبی رسوم اور پوجا پاٹھ میں بھی شریک ہوتا تھا۔ دیر و حرم کے اتصال و اختلاط کے خیال سے اُس نے ایسے مذہب کی بنیاد رکھنا چاہی تھی کہ جس میں ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کی خوبیاں اور اعلیٰ اصول شامل ہوں اور اُن کے نقائص سے پرہیز کیا جائے اسی طرح سے ہندو مذہب اور رسم و رواج میں جو ایسے نقائص تھے کہ جن سے جذبۂ انسانیت کو ٹھیس لگتی تھی اُس نے اُن کی اصلاح کرنے اور بدلنے کی بھی کوشش کی۔ ستی کی رسم تقریباً ممنوع کر دی گئی تھی۔ بیواؤں کی شادیاں رواج پانے لگی تھیں اور صغر سنی کی

شادی ممنوع ہو گئی تھی۔ رواداری اور یک جہتی کے اس مسلک کو اختیار کرکے اکبر نے اپنے دور میں متحدہ قومیت اور مشترکہ کلچر کی بنیاد ڈالی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد تک یعنی کامل سو برس تک سلطنت اور حکومت کا یہی رویہ اور دستور رہا۔

رواداری۔ اختلاط اور یک جہتی کے مسلک کے علاوہ بھی ہندو مسلمانوں کے اس دور کے میل جول اور رس بس جانے سے ہندوؤں کو اور بھی فائدے ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ کھانے پینے۔ پہننے اوڑھنے اور تکلفات زندگی کے شوق و نفاست میں مسلمانوں کا اثر ہندوؤں پر اچھا پڑا۔ میل جول کے رسوم و آداب ہم نے مسلمانوں سے ہی سیکھے۔ مسلمانوں کا طرز حکومت بھی پرانے زمانے کے ہندو راجاؤں کے راج پاٹ سے زیادہ بہتر اور اونچے پائے کا تھا۔ ہماری جنگجوئی اور جنگ آزمائی کا انتظام بھی مسلمانوں کے مقابلے میں کمتر درجے کا تھا۔ ہماری فوجوں میں گولہ بارود اور توپخانے کا رواج بھی مسلمانوں نے ہی شروع کیا۔ سواری کا ساز و سامان۔ شیشہ آلات۔ کاغذ۔ موم بتی اور گھروں کے آرائش کے سامان نے مسلمانوں کے زمانہ میں ہی رواج پایا۔ ان کے دور میں موسیقی۔ طب اور نجوم کے علوم نے بھی ترقی کی۔ علم جغرافیہ اور تواریخ ہم نے مسلمانوں سے ہی سیکھا۔ انہوں نے سڑکیں بنوائیں۔ نہریں۔ کارواں سرائیں اور ڈاکخانے کھولے اور رائج کئے۔ مسلمانوں کے زمانے میں فن تعمیرات کمال پر پہنچا۔ باغبانی نے ترقی کی اور اس ملک میں نئے نئے پھل اور پھول لاکر لگائے۔ صیغۂ مال کے موجودہ دستور کو اکبر کے

زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے جاری کیا تھا جو آج تک قائم ہے۔ ہماری تجارت کا سلسلہ مسلمانوں کے زمانہ میں سمندر پار تک پہنچا اور ہمارے تعلقات اکثر غیر ملکوں سے قائم ہوئے۔ یہ تمام واقعات صاف صاف بتا رہے ہیں کہ جس مشترکہ تہذیب و تمدن نے سلطنت مغلیہ کے دور میں رواج پایا وہ ہماری ہزار برس پہلے کی تہذیب و تمدن سے زیادہ بہتر اور اعلیٰ تھا۔

یہ تو سرسری سا تذکرہ تھا اُسی بلیغ کوشش کا جو دانستہ طور پر اکبر اعظم نے متحدہ ہندستانی قومیت کے قائم کرنے کی اپنے عہد میں کی تھی اور یک جہتی کے جس مسلک پر قائم رہ کر شاہانِ مغلیہ نے ہمارے مشترکہ تہذیب و تمدن کی بنیادیں ڈالی تھیں اور جن پر تقریباً سو برس تک یہ عمارت اُٹھتی اور کھڑی ہوتی گئی لیکن ہندو اور مسلمان عوام الناس کے روزمرہ کے میل جول اور کاروبار زندگی کے روزانہ تعلقات سے جو اثر اُن کے عقیدہ و ایمان، خیالات و جذبات اور رسم و رواج پر پڑا وہ اس سے زیادہ گہرا اور پائیدار تھا۔ چند اللہ والے لوگ جن میں صوفی۔ قلندر اور اولیاء اور سادھو سنت دونوں ہی مذہب کے لوگ شریک تھے طبقۂ جمہور سے ایسے اٹھے کہ جنھوں نے عوام الناس کی کایا پلٹ کردی اور ان میں جذبۂ انسانیت کو اس طرح ابھارا کہ اس میں روحانیت کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ ہندوؤں میں یہ نتائج ویشنومت کے عروج اور بھگتی کی تحریک کی مقبولیت کا تھا۔

راما نند۔ تکا رام۔ ایک ناتھ اور نام دیو نے مہاراشٹر میں چیتن نے بنگال میں۔ تلسی داس۔ سور داس اور میرا نے اودھ

اور برج میں کرشن اور رام بھگتی کی ایسی دھن لگائی اور کبیر اور نانک نے شمالی ہند میں حقانیت کا وہ نعرہ بلند کیا کہ جس نے اس دیس کی ساری جنتا کو اپنے پدوں۔ بانیوں۔ گیتوں۔ بھجنوں اور بولوں سے مست اور چور کر دیا۔ جو کام یہ سادھو سنت اور بھگت کر رہے تھے وہی کام اپنی اپنی جگہ مسلمان اولیار۔ صوفی اور قلندر بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ کوئی منضبط تحریک نہ تھی اس کے پاس نہ پریس تھا اور نہ پروپیگنڈا نہ حکومت کا زعم نہ دولت کا سہارا لیکن سادھو۔ سنتوں اور اولیار کے دلوں میں سچائی۔ ہمدردی اور جذبۂ انسانیت کی وہ آگ روشن تھی کہ جس نے چاروں طرف اُجالا ہی اُجالا کر رکھا تھا۔ باوصف اس کے کہ صدیاں گزر گئیں یہ روشنی اب بھی باقی ہے اور ان کے نام آج بھی ہر کہ ومہ کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

دیر و حرم کے اتصال کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔ مسلمان مورخین خود اس بات کا اقبال کرتے ہیں کہ ان کے اولیار اور صوفیوں نے ہندو سادھو اور سنتوں کا اثر قبول کیا تھا اور کچھ مسلمان تو آواگون اور کرم کے عقیدوں کے بھی قائل تھے۔ تعزیہ داری کی رسم پیری مریدی کا رواج اور اولیار پرستی بھی ظاہرا ہندو عقیدوں کے اثر کا نتیجہ ہے لیکن ہم اس وقت اس کا تذکرہ نہیں کر رہے ہیں کہ مسلمان ہندو عقیدوں اور رسموں سے کس طرح متاثر ہوئے بلکہ یہ کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر کیا فائدہ اُٹھایا۔

ہندو عقیدے اور فلسفہ کی معراج وحدانیت یا عقیدۂ ہمہ اوست

ہے لیکن اس فلسفہ کی بلندی اور گہرائی تک خال خال اور چیدہ بزرگ ہی پہونچ سکتے ہیں۔ عوام الناس کا دل و دماغ یہاں تک نہیں پہنچتا اس لئے اُن کے واسطے رشیوں اور مُنیوں نے اوتاروں کی پرستش مندروں میں پوجا پاٹھ۔ کرم کانڈ کی ریتیں اور رسمیں اور طرح طرح کے پاکھنڈ رواج دئے۔ اور اس طرح سے عوام و خواص میں ایک گہری خلیج قائم ہو گئی اس خلیج کے پاٹنے اور دور کرنے میں اسلامی عقیدہ وحدانیت و حقانیت نے ہندو سماج اور ہندو جمہور پر کیا اثر ڈالا اُس کا مختصر بیان منظور ہے:-

بودھ مت کے زوال پزیر ہونے پر شنکراچاریہ نے جب پُرانے ہندو مذہب کی تجدید کی اور برہمنوں کی عظمت کو از سرِ نو تازہ کیا تو اس کی بنا ویدانیت کے فلسفہ کی تشریح و تلقین پر رکھی ویدانت کے فلسفہ پر شنکراچاریہ کی تفسیر اپنا جواب نہیں رکھتی لیکن اس کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے خال ہی خال چیدہ لوگ ہو سکتے تھے۔ عوام الناس کے لئے اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے شنکراچاریہ نے عام لوگوں کے لئے اوتاروں کی پرستش، مندروں میں پوجا پاٹھ اور کرم کانڈ کی ریتوں اور رسموں کا ایک ایسا جال رچا کہ جس کے پھندے میں ہندو آج تک پھنسے ہوئے ہیں اور نکل نہیں سکتے۔ اس نے اس نئے ہندو دھرم کو مقبولِ عام بنانے کے لئے پراچین آریہ سبھتا کی حدود سے نکل کر دراوڑی غیر مہذب فرقوں اور اُمتوں کی بھی مدد لی اور ہندو دھرم کو ان کی سطح پر گرا کر نیچا کر دیا شاکت مت کی ادنیٰ قسم کی ریتیں اور رسمیں اس کی ایک معمولی

مثال ہیں۔ ویشنومت اور بھگتی کی تحریک اس نئے ہندو دھرم کے خلاف آواز احتجاج تھی۔ اس تحریک کو رشی راناڈے نے آج کل کی اصلاح میں (Hindu Protestantism) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ویشنومت کو شروع تو بارہویں صدی میں رامانج نے کیا تھا اور اس کی پیدائش جنوبی ہند میں ہوئی تھی لیکن بھگتی کی تحریک عروج پر پہنچ کر مقبول ہوئی۔ پندرہویں اور سولھویں صدی میں اُن سادھو۔ سنتوں اور بھگتوں نے کہ جنہوں نے اسے رچا اور اس کا پرچار کیا پہلی بات تو یہ کی کہ سنسکرت سے پیچھا چھڑا کر عوام کی بولیوں میں اپنے مت کا پرچار کیا۔ دوسرے گیان اور یوگ کے راستوں کو چھوڑ کر صرف بھگتی مارگ اختیار کیا۔ پوجا پاٹ اور کرم کانڈ کے کھڑاگ سے اپنا پنڈ چھڑا کر اُنہوں نے ایسے والہانہ عشق حقیقی کی دھن چھیڑی کہ جمہور عام یعنی دیس کی جنتا اس کے اور راگ کے سننے کے لئے ان کے پیچھے دوڑنے لگی یہ خصوصتیں ویشنومت اور بھگتی کی تحریک میں شروع ہی سے پائی جاتی ہیں لیکن پندرہویں اور سولھویں صدی میں جب دیر و حرم کا اتصال ہو رہا تھا بھگتی کی تحریک میں ایک خصوصیت یہ نمایاں ہوئی کہ ان بھگتوں۔ سادھوؤں اور سنتوں نے ذات پات کے مت بھید اور اونچ نیچ کی تفریق کا کھنڈن کرنا شروع کیا اور بعد میں عقیدۂ وحدانیت کی آواز بھی بلند ہونے لگی۔ بلاشبہ یہ مسلم عقیدے اور ایمان کا اثر تھا جو اس تحریک نے قبول کیا۔ رشی راناڈے نے اپنے ہندو پروٹسٹنٹزم والے ایڈریس میں کہا ہے کہ مہاراشٹر کے تقریباً ایک سو سادھو سنتوں میں جنہوں نے

اس تحریک کا پرچار کیا دس مسلمان تھے۔ دس عورتیں تھیں۔ چالیس برہمن تھے۔ اور چالیس غیر برہمن۔ غیر برہمنوں میں قصائی۔ دُھنے۔ جلاہے سُنار۔ نائی۔ ماہر۔ کسان اور فوجی لوگ بھی تھے۔ ایک ناتھ۔ تکارام نام دیو کے ناموں کے ساتھ ہی ساتھ شیخ محمود۔ شیخ فرید اور محمود قاضی کے نام بھی عزت و تعظیم سے لئے جاتے ہیں۔ چیتن کے سنتوں یا مریدوں میں بھی کئی ایک مسلمان شامل تھے۔ گرو نانک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی مسلمان کے مرید تھے۔ کم از کم یہ تو یقینی طور سے معلوم ہے کہ انہوں نے سیّاحی اور دشت نوردی کی دھن میں عرب کا ساحل بھی چھوا تھا اور مکّہ اور مدینہ کی زیارت بھی کی تھی۔

کبیر صاحب کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنایا کبیر اور نانک کی بانیاں اور بول بالخصوص عقیدۂ وحدانیت کا نچوڑ ہیں۔ ایمان و عقیدے کی بلند سطح سے اُتر کر زبان اور لٹریچر پر بھی دیر و حرم کے اس اتصال کا گہرا اور پائدار اثر پڑا ہے۔ رشی راناڈے نے لکھا ہے کہ ایک ناتھ اور تکارام دونوں اردو میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ غالباً یہ پرانے زمانہ کی دکنی اردو ہو گی۔ برج بھاشا اور اودھی میں ملک محمد جائسی۔ عبد الرحیم خانخاناں رس کھان وغیرہ کے نام محتاج بیان نہیں۔ تلسی داس کی رامائن میں سینکڑوں لفظ فارسی کے ملتے ہیں اور اُردو کے نشو و نما میں ہندوؤں کا جو حصّہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قصہ طویل ہے۔ یہاں اُس کے بیان کی گنجائش نہیں۔ دیر و حرم کے اتصال کا جو اثر آریہ ورت کی سبھتا پر ہوا اور جس طرح سے ہماری مشترکہ تہذیب اور کلچر نے

جنم لیا اس کا مختصر سا تذکرہ یہاں کر دیا گیا ہے۔ شائقین کے لئے کافی لٹریچر اس میں موجود ہے کہ جس سے وہ اپنی تشنگی بجھا سکتے ہیں۔

ہندوؤں میں کافی جماعت ایسے لوگوں کی ہے کہ جو اس پہلو کو نظر انداز کر کے بالکل خلاف رائے بلکہ مختلف عقیدہ رکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے حملوں اور صدیوں کی حکومت کا سوائے تخریب تباہی کے اور کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہندوؤں کے خصائل اور چلن میں جو کمزوریاں اور خرابیاں آج نظر آتی ہیں اُن کی رائے میں یہ سب مسلمانوں سے میل جول کا نتیجہ ہے اُن کی رائے میں مسلمانوں سے میل جول اور قرابت سے ہندو کیرکٹر اونچا نہیں بلکہ نیچا ہوا جو ہمارے لئے باعث شرم ہے۔ رشی راناڈے نے اپنے اُس ایڈریس میں جو پچاس سال ہوئے اُنھوں نے اسی شہر لکھنؤ میں انڈین سوشل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھا تھا اس خیال کی تردید کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ غور طلب ہے:۔

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ پانچ سو برس کی حکومت کے بعد جب مسلمانوں کی سلطنت زوال پزیر ہوئی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو اس کی جگہ سوائے بنگال۔ اودھ اور حیدر آباد کے تمام ہندستان پر ہندوؤں نے اپنا سکہ بٹھایا۔ پنجاب میں سکھوں نے راجپوتانہ میں راجپوتوں نے اور مغرب و دکن میں مرہٹوں نے حکومتیں قائم کیں اور ملک پر اس طرح حاوی ہوئے کہ اُن کی دھاک بندھ گئی اور اُن کا ڈنکا بجنے لگا۔ ہزار

. سال پیشتر جب مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے تھے تو
ہندو ریاستیں اور ہندو فوجیں اُن کے حملوں کی تاب
نہ لا کر اُن کے آگے موسم خزاں کے خس وخاشاک کی طرح
تتر بتر ہو کر ہوا میں اُڑ گئی تھیں۔ لیکن مسلمانوں کے ہزار
سال کے میل جول اور ربط وضبط کا اثر ہندو کیرکٹر پر یہ ہوا
کہ ان میں بھی وہی بل بوتا اور مردانگی کے جوہر پیدا ہو گئے
کہ جو مسلمانوں کا خاصہ تھے۔ ہندوؤں کا کیریکٹر مسلمانوں
کے میل جول سے اونچا ہوا اگر انہیں تاریخ اور واقعات
اس کے شاہد ہیں "

جواب تو شافی ہونا چاہئے لیکن مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جوش
انسان کو تاریخی وارداتوں کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھنے پر آمادہ نہیں کرتا
بات یہ ہے کہ جب دو مختلف خیالوں۔ عقیدوں۔ تحریکوں یا دو مختلف
قوموں میں تصادم ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر حادی ہونا چاہتا
ہے تو کچھ انسانی فطرت ہی ایسی ہے کہ حشر برپا ہوتا ہے ارتقائے
تمدن میں اس کو تخریب کا دور کہتے ہیں یہ سیلاب کی طرح اٹھتا اور
آتا ہے اور بہولے کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے۔ اس کے بعد مصالحت
اور سمجھوتہ سے تعمیری دور شروع ہوتا ہے جو اس قدر ولولہ خیز تو نہیں
لیکن دیرپا اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ تصادم کے جوشیلے اور ولولہ
انگیز حادثے ہمارے ذہن نشین ہو جاتے ہیں لیکن روزانہ کی تعمیری
زندگی کی حکایتیں ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو آج
تک یاد ہے کہ محمود غزنوی نے ہندستان پر کتنے حملے کئے تھے۔

اورنگ زیب نے کئی من جنیو ہندوؤں کے اُتارے تھے! اور نادرشاہ نے دلی میں قتل عام کا ایک محشر بپا کیا تھا لیکن ڈیرہ حرم کے ان قصوں کا جن کا یہاں بیان کیا گیا ہے ہمیں دھیان بھی نہیں آتا۔

یورپ میں رفریمیشن کے زمانہ میں خوں ریزی اور غارت گری کا کیا کچھ بازار گرم نہ ہوا۔ انکیوزیشن کے مظالم۔ لارڈ شیل کی معرکہ آرائیاں۔ سینٹ بارتھو لیومیو والے دن کا قتل عام کس کو نہیں یاد ہے تاہم رفریمشن کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں ایک درخشاں باب اور مبارک دور سمجھا جاتا ہے۔ فرانسیسی دور انقلاب میں کیسی کچھ خوں ریزی نہ ہوئی۔ ہزاروں ہی نونہالانِ قوم موت کے گھاٹ اُترے اور اکابرانِ ملک (Guillotine) پھانسی کے بھینٹ چڑھائے گئے شہنشاہ اور ملکۂ فرانس کو دار پر چڑھایا گیا لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ فرانسیسی انقلاب نے حریت جمہوریت اور مساویت کے جس دور کا پیام دیا وہ دنیا کے لئے نعمت و رحمت ثابت ہوا ہے۔ جمہوریت اور اشتراکیت کے تصادم کا کیا نتیجہ نکلے گا اس کا صحیح اندازہ تو آئندہ کا مورخ ہی کر سکتا ہے لیکن یہ ہمیں بھی معلوم ہے کہ باوصف اس خوں ریزی اور بربادی کے جو بولشیوزم کے سر منڈھی جاتی ہے اس دور انقلاب نے روس کی ایسی کایا پلٹ کی ہے کہ وہاں کے جمہور کے دن پھر گئے ہیں اور دنیا کی مہذب اور طاقتور قوموں میں روس اور امریکہ کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ اپنے ہی ملک کو لیجئے۔ اسلامی دور کے

ختم ہونے پر دو سو برس ہوئے کہ انگریزی دور شروع ہوا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں انگریزوں نے اس ملک کو جس طرح لوٹا اور ہمیں آپس میں لڑا کر یہاں انگریزی حکومت قائم کی اُس کی مفصل کیفیت آپ میں سے اکثر نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھی ہوگی۔ خاص طور سے رمیش چندر دت کی تصانیف (Economic History اور India in the Victorian age) کا مطالعہ بصیرت افروز ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جیسے دردناک مظالم یہاں کی رعیت پر ڈھائے گئے اس کے جو واقعات ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب (Other side of the medal) میں رقم کئے ہیں۔ عبرت انگیز ہیں۔ کل کی سی بات ہے کہ جب جنرل ڈایر نے جلیانوالہ باغ میں یزن بول کر قتل عام کا محشر بپا کیا اور بھی سینکڑوں مظالم انگریزی حکومت کے جو کل تک ہم پر ہوئے اور جن کی یاد نقش کالحجر بن گئی ہے ہر ایک کی زبان پر ہیں لیکن کفرانِ نعمت ہوگا جو آج جب کہ انگریزی تسلط یہاں سے اُٹھ گیا ہے ہم اس کا اقرار نہ کریں کہ دو سو برس کے انگریزی عہد میں سائنس و حرفت کی جو ترقی ہمارے ملک میں ہوئی۔ آئینی و دستوری حکومت کے جو تجربے ہم کو ہوئے اور آزادی کی جو ہوا ہمارے دماغوں میں سمائی۔ انگریزی زبان لٹریچر اور تعلیم کے فیض سے جس نئی روشنی نے ہماری آنکھیں کھولیں اسی سبب نے ہمیں آج آزادی کا منہ دیکھنا نصیب کیا۔ کم سے کم میں تو یہ ضرور یقین کرتا ہوں کہ انگریزی دور میں ہم نے جو کچھ کھویا اُس سے کہیں زیادہ پایا بھی۔

انگریزی حکومت کا تعمیری دور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے شروع ہوا اور کامل تین نسل تک اپنا کام کرتا رہا۔ اس سائنس اور جمہوریت کے دور نے ملک کی کایا پلٹ کردی۔ ہماری روز مرّہ کی زندگی کو اس طرح اُبھارا اور اونچا کیا، روز مرّہ کے رہن سہن میں ایسی سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائیں۔ تکلفات زندگی کے ایسے معجزے دکھائے کہ جن کا تذکرہ نہ کرنا ہٹ دھرمی ہوگا۔ ریلوے۔ تار برقی ٹیلیفون ریڈیو۔ سینما۔ تھیٹر۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز۔ ڈاکخانوں اور ہسپتالوں کا انتظام۔ فیکٹریوں اور کارخانوں کا قیام۔ صنعت و حرفت اور تجارت کا فروغ اور سائنس اور مشینری کے اور سینکڑوں معجزے اس ملک میں مغربی روشنی اور انگریزی حکومت کی بدولت دیکھنے میں آئے جس نے ملک کو ترقی دینے کے راستے پر ڈالا اور چلایا اور جمہور قوم کی زندگی کو کسی قدر اونچا اور بہتر بنایا جس سے نہ صرف ہمارے یہاں کے بڑے بڑے شہر آج لندن اور پیرس کا مقابلہ کرتے ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہمارے کسانوں اور مزدوروں کی حالت ہمارے ارادوں اور حوصلوں کے لحاظ سے کیسی ہی کچھ اصلاح طلب ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی ایک نسل سے ان کی زندگی کا رہن سہن اور ان کی اقتصادی حالت نسبتاً بہتر ہوگئی ہے اور یہ سب اُسی تعمیری دور کی بدولت کہ جس کی بنیاد انگریزی حکومت نے ڈالی تھی۔

قطع نظر اُس مادّی اور اقتصادی ترقی کے جو ہم نے انگریزی دور میں کی اور جس کا حوالہ ابھی ابھی اوپر دیا گیا ہے اس دور کی

خاص برکتیں قومیت۔ حریت اور مساویت کے وہ اصول اور عقیدے ہیں کہ جو ہم نے انگریزی حکومت کے تعمیری دور میں قبول کئے۔ نئی تہذیب کی وہ نئی روشنی کہ جس سے ہمارے دل و دماغ منور ہوئے جس نے ہمارے آئین اخلاق کی از سر نو تعمیر کی۔ ہماری سوسائٹی کے شیرازے کی کایا پلٹ کر دی اور ہمارے دستور حکومت کا چولا بدل ڈالا۔ ہندستان میں متحدہ قومیت کا وہ خواب جو اکبر اعظم نے اپنے زمانہ دیکھا تھا اس لئے حقیقت میں رونما ہوا کہ کل ملک ایک حکومت کے تابع تھا جو امن و امان قائم رکھ سکی۔ جس سے کاروباری اور تجارتی تعلقات اور سوشل ربط و ضبط فروغ پاتے رہے۔ شخصی اور قومی آزادی کا خیال اور حب الوطنی کا جذبہ ہمارے دماغوں میں اس لئے پرورش پاتا رہا کہ حکومت نے انگریزی تعلیم یہاں رائج کی۔ پریس کی آزادی ہمیں حاصل ہوئی۔ ملٹن۔ برک مل۔ اسپنسر۔ مارلے۔ ہکسلے۔ ادگسٹ کامٹ اور روسو کی تعلیم کے فیض سے ہمارے دماغ روشن ہوئے۔ انگریزی۔ فرانسوی اور امریکی انقلابیوں کی تاریخ سے ہم نے سبق سیکھے۔ پریس کی آزادی نے ہماری دیسی زبانوں اور لٹریچر کو مالامال ہونے کا موقع دیا جس سے معدودے چند کے خیالات عوام الناس تک پھیلے۔ مساویت کے اصول و عقیدے نے قانونی عدالتوں اور سرکاری اسکولوں میں نشو ونما پائی۔ عدالت کے سامنے شدر اور برہمن۔ مسلمان اور عیسائی سب ایک ہی ترازو میں تولے جانے لگے۔ امیر و غریب یکساں قانون کے پابند ہوئے ذات اور مرتبہ کی تفریق مٹنے لگی۔ اسکولوں

میں بھی ایسا ہی ہوا۔ برہمن۔ چمار، کھٹیک کے لڑکے ایک ہی بنچ پر بیٹھنے لگے۔ ایک ہی قاعدے اور ضابطے کے پابند ہوئے۔ امیر و غریب اپنے خون میں یکساں جانچے جانے لگے۔ ان کی قابلیت اور کامیابی کا دارومدار ان کی ریاست، مرتبہ اور ذات پر نہیں بلکہ ان کی قابلیت کے لحاظ سے کیا جانے لگا۔ ڈاروِن کے اصول وارتقاء۔ سائنس کی تعلیم کے معجزوں اور مشینری کے رواج کی برکتوں نے پرانی تہذیب کی روایات۔ رسومات اور توہمات کے جال کو کاٹ کر ایک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا۔ خاندانی رعب و داب کی جگہ عقل و دلیل نے لے لی اور شخصی آزادی کا سکہ چلنے لگا۔

مختصراً سائنس و جمہوریت کے نئے دور اور نئی تہذیب کی روشنی اس ملک میں انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ سے آئی۔ ہمیں آئینی و دستوری حکومت کے تجربے بھی انگریزی دور میں ہی ہوئے۔ اس سب کے لئے ہمیں انگریزی قوم کا احسان مند ہونا چاہئے۔ قرینِ انصاف نہ ہوگا اگر اس کا اقرار نہ کیا جائے کہ باوصف ملک کے بٹوارہ ہونے کے آج صدیوں کی غلامی کے بعد ہمیں یہ دن دیکھنا ملا ہے کہ ملک آزاد ہو گیا اور جو قیمت ہم نے اس کے لئے ادا کی وہ بہت زیادہ نہیں۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ دنیا کے ارتقاء و تمدن کی رفتار ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں تخریب کے دور بھی آتے ہیں۔ اور تعمیر کے دور بھی۔ صحیح نقطۂ نظر یہی ہے کہ تخریبی دور کے عارضی حادثوں کو نظر انداز کر کے تاریخ کے تعمیری نقوش کی یاد تازہ کر کے اُن پر چلا جائے۔ جذباتی اور جوشیلی طبیعتوں سے

قطع نظر کرکے صاحب دل و دماغ ایسا ہی کرتے ہیں اور اگر ہمیں ترقی کے راستے پر چلنا ہے تو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ہماری تاریخ تمدن کی جلدوں میں صفحے اب اس طرح خالی نہیں پڑے ہیں کہ ہم من مانا جو چاہیں اب اُن پر لکھتے جائیں۔ دیر و حرم کا پُرانا واسطہ اور مشرق و مغرب کا نیا تصادم ایسی تاریخی روایتیں ہیں کہ جو ہمارا مقدر ہو چکیں ان کو اب حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جا سکتا اور جو نقوش ان تاریخی روایتوں نے چھوڑے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہندستان کی تہذیب و تمدن اور ہمارا تمدن اور کلچر مشترکہ ہوگا یکرنگی نہیں بلکہ دورنگی۔ یعنی ایسا گنگا جمنی کہ جس کا تانا بانا تو پراچین آریائی ہوگا نقش و نگار اس پر اسلامی دور کے ہوں گے اور اس کا رنگ گہرا فرنگی یا مغربی۔ با دل خواستہ یا نخواستہ ہمیں اسے قبول کرنا ہے۔ آج ہندستان میں ہندو راشٹر یا پاکستان میں شرعی حکومت کے خواب دیکھنے طریق ہوشمندی نہیں۔ ہماری حکومت دستوری ہی ہوگی جس میں جمہوریت بلکہ اشتراکیت کا گہرا رنگ چڑھا ہوگا۔ ہماری زبان نہ سنسکرت آمیز ہندی نہ فارسی اور عربی زدہ اُردو بلکہ وہ سیدھی سادی ہندستانی ہوگی کہ جس کو جمہور قوم اپنا سکیں اور لکھ بول سکیں۔ ہمارا کلچر ایسا گنگا جمنی ہوگا کہ جس میں نہ صرف پراچین آریائی سبھتا کا عکس دکھائی دیتا ہو جس میں نہ صرف اسلامی دور کے نقش و نگار پائے جاتے ہوں بلکہ جس میں دورِ حاضر کی مغربی اور نئی روشنی کی کرنیں اور تاریں بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہوں۔ پُرانے دور کی تاریخ اور نئے زمانہ کی روشنی نے ہمارا ایسا ہی مقدر کیا ہے اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ فرقہ وارانہ جوش اور مذہبی

تعصب کی آگ بھڑکا کر آپ ابھی کچھ عرصہ تک عوام الناس کی جہالت اور بے مائگی سے فائدہ اٹھا کر ملک کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں ضرور ڈال سکتے ہیں۔ ابھی بھٹکے ہوؤں کو کچھ دن بہکایا اور گمراہ کیا جا سکتا ہے لیکن زمانہ کی روش اور افتاد ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے بانکوں اور ترچھوں کو بالآخر سیدھے راستے پر لگا دیتی ہے اور پھر طریق ہوشمندی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

اکبرؔ الہ آبادی اور اُن کی شاعری

ہمارے پُرانے علم ادب میں تقریظیں لکھنے اور تنقیص کرنے کا عام دستور تھا جب کوئی ادیب کوئی تصنیف شائع کرتا تھا تو اس کے احباب براہِ قدردانی دوستانہ مراسم کی بناء پر تقریظیں لکھتے تھے۔ شعراء کے کلام کا اُن کے شاگرد خراجِ تحسین دے کر اپنا فرض ادا کرتے تھے۔ اُستاد شاگردوں کی واہ واہ کرکے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ زبان کی بحث میں دلّی اور لکھنؤ والے رائی کا پربت بنا کر ان بحثوں کو اخباروں میں مہینوں جاری رکھتے اور اس اکھاڑے کے پہلوان ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں کسی قسم کی تنقیص سے گریز نہ کرتے لیکن تنقید کے فن سے یہ لوگ نہ واقف تھے نہ اُنہیں اس کی اہلیت تھی۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی بزرگ یا استاد کی نکتہ چینی کرنا یا اس کے کلام کے کھوٹے کھرے کو پرکھنا یا اس کی جرأت کرنا سوءِ ادب سمجھا جاتا تھا۔ فنِ تنقید نگاری کی نشو ونما ہمارے ادب میں دورِ حاضر کی بات ہے۔ دو پشتوں سے زیادہ نہیں ہوئے کہ ہم نے اس طرف قدم بڑھایا ہے اور اب نوجوان ادیب اس طرف خاطر خواہ توجہ کر رہے ہیں۔ تاہم پُرانی عادت ابھی چھُٹی نہیں ہے۔ تنقید کے نام سے اب بھی تقریظیں لکھی جاتی ہیں اور ادیبوں کی تصنیفوں اور شاعروں کے کلام پر اس طرح تبصرہ کیا جاتا ہے کہ جس سے ادیب یا شاعر کا مرتبہ ادب میں قائم کرنے اور کھوٹے کھرے کی جانچ کرنے میں کسی طرح کی مدد نہیں ملتی اور پڑھنے والے کا دماغ اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اقبال اور پریم چند کو لیجئے۔ اقبال کا رتبہ بحیثیت شاعر کے کسی ثناد تحسین کا محتاج نہیں ہے۔ اُردو شاعری میں غالب کے بعد کوئی دوسری ہستی اس مرتبہ کی نظر نہیں آتی ہے۔ آج کل درجنوں مقالے۔ رسالے بلکہ کتابیں بھی اقبال پر ہر سال لکھی جاتی ہیں جن میں لکھنے والے اقبال کی شاعری اور اُن کے کلام پر تو روشنی کم ڈالتے ہیں لیکن اسلامی تمدن و عقیدوں کی بحثیں بہت لمبی کرتے ہیں۔ پریم چند کی ذات بھی عظمت پرستی (HERO-WORSHIP—) کا شکار ہو رہی ہے پریم چند اردو لٹریچر میں فن مختصر افسانہ نگاری کے موجد تھے اور اُنھوں نے اس کو جس کمال پر پہونچایا اس کی دوسری نظیر ہمارے ادب میں نہیں ملتی ہے۔ دیہاتی زندگی کے مُرقع جیسے اُنھوں نے کھینچے اور مزدور وکسان کے دُکھ درد کی داستان جیسی اُنھوں نے سُنائی کسی دوسرے نے نہیں۔ لیکن اُنہیں آج دُنیا کے مشہور ناول نگاروں کی صف میں جگہ دی جاتی ہے اور ان کا شمار ترقی پسندوں کے زمرہ میں کیا جاتا ہے۔ ایسی "ترقی پسندی" جو ان کے کبھی دھیان میں بھی نہ آئی ہو گی۔ کم و بیش یہی سلوک بعض حلقوں میں اکبر الہ آبادی کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ نئے زمانہ کے بعض پُرانی وضع کے ادیب اکبر کو مرشد کامل (Superman) کا رتبہ دینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھ رہے ہیں۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی نے ایک مقالہ پیام اکبر یعنی حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیات پر ایک نظر کے عنوان سے مقالات ماجد میں شامل کیا ہے یہ مقالہ تقریباً سوا سو صفحوں پر مشتمل ہے

اس میں اکبر کی ظرافت و زندہ دلی سیاست عشق، تغزل، اخلاق معاشرت، تصوف، معرفت و فلسفہ پر مفصل تبصرہ کر کے سینکڑوں اشعار ان کے کلام سے اس ثبوت میں پیش کئے گئے ...... ہیں کہ حضرت اکبر کی ذات بہ صفت موصوف اور وہ ہر فن مولا تھے اور اُن کی شخصیت فکر و حکمت کا آئینہ بھی یعنی وہ اُن بزرگوں میں تھے جن کا مثل و نظیر کہیں مدتوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔ آپ کا طرز تحریر و انداز بیان بھی اس مرتبہ کا ہے جیسا کسی پیرو یا مقلد کا اپنے پیر و مرشد کے تذکرہ میں ہوتا ہے اور یہ کوئی اعتراض کی بات بھی نہیں ہے۔ مولانا نے جس حُسن عقیدت اور نیاز مندی کا اظہار حضرت اکبر کی ذات سے کیا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ اپنی فکر و ذہنیت کا ایسا درخشاں عکس اکبر کی شخصیت اور کلام میں دیکھ کر مولانا اگر ان کے گرویدہ اور شیدائی نظر آتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں بھی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اُردو کی اور ادبی دنیا اکبر کی شخصیت اور شاعری پر کسی قدر مختلف حیثیت سے نظر ڈالتی ہے اور ان کی مقبولیت کا راز ان کے مفکر (Thinker) ہونے کی حیثیت میں پنہاں نہیں ہے پھر مولانا اس مقالے میں اکبر کی شاعری پر تبصرہ و تنقید کر رہے ہیں ان کے سوانح حیات کا قلمبند کرنا اس کی غرض نہیں ہے۔ اور فی زمانہ صاحب دماغ اور اہل قلم سوانح حیات میں بھی تصویر کے دونوں رُخ دکھاتے ہیں۔ مولانا نے تو دوسرے رُخ کی چھاؤں بھی کہیں پڑنے دی ہے۔ شبہ نہیں کہ اکبر کے کلام کا ایک معتد بہ

حصہ پرانے وضع کی عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے جس سے اُن کے ایک پختہ کار غزل گو ہونے کا یقین ہوتا ہے لیکن ان ہی کے زمانہ میں ان کے ہم عصروں میں داؔغ اور آمیرؔ مینائی کو قبول عام کا جو شرف حاصل ہوا اور جو مرتبہ اردو شعراء میں اُنھوں نے پایا کسی دوسرے نے نہیں۔ ان کی شاعری میں سیاسیات کا چٹخارہ بھی ہے اور پند و نصائح کا طومار بھی۔ لیکن یہ رنگ باوصف چوکھا ہونے کے عامیانہ ہے جس کی بناء سر سید کی تحریک کی مخالفت اور ہر انگریزی خیال، بات اور چیز سے نفرت اور دشمنی پر قائم ہے۔ اس عامیانہ رنگ کو فکر و تدبر سے تعبیر کرنا واقعی جرأت کا کام ہے۔ رہے پند و نصائح تو پریم چند کی طرح اکبر کے کلام میں بھی ان کی حد سے زیادہ بہتات ہے۔ لیکن شاعری تو مصوری ہے ذوق حُسن اور لطافت جذبات کی پند و نصائح کا مرکز یا خزانہ نہیں نہ پند و نصائح کو کمال شاعری سے کوئی واسطہ ہے۔ اگر شعریت کے لباس میں حقائق زندگی کی گہرائیوں یا تصوف عرفان و فلسفہ کی جستجو ہے تو شائقین غالب و اقبال سے رجوع کریں گے اور ان کے کلام سے حظ اُٹھائیں گے، اس غرض سے اکبر پر کسی کی نظر نہیں پڑیگی۔
ماجد صاحب نے اپنے مقالہ کا عنوان "پیام اکبر" قائم کیا ہے اکبر نے اپنے ملک و قوم یا دنیا کو کونسا پیام دیا ہے؟ معیار مشرقیت کا؟ زمانۂ جاہلیت میں جن اولوالعزم ہستیوں نے مشرق کے مُردہ قالب میں ایک نئی روح پھونکی تھی اور یہاں کے تہذیب و تمدن کو اجاگر کرکے اس میں چار چاند لگائے تھے وہ صدیوں ہوئے کہ

پیوند خاک ہو گئے۔ انہوں نے جو تازہ پیام اپنے زمانہ میں نہ صرف مشرق بلکہ دنیا کو دیا تھا وہ مدت سے اب نئی آوازوں، نئی نفیروں اور نئی روشنی میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور پرانا تہذیب و تمدن لاش بے کفن کی طرح پڑا ہے جس کے رونے والے تو بہت ہیں لیکن جلانے والا کوئی نہیں۔ مشرق کی تہذیب اور مشرق کا تمدن خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی محض مدتِ ایام کے گزرنے سے اب بوسیدہ ہو کر کھوکھلا ہو گیا ہے۔ جس میں حقیقت اور اصلیت بہت کم باقی ہے۔ مدت سے اس میت کا رونا رویا جا رہا ہے جس سے اب کوئی کیفیتِ غم و اندوہ بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اکبر نے بھی اس کا رونا رویا ہے۔ یہ رونا پیام نہیں مرثیہ ہے۔ خود ماجد صاحب نے بھی آخر میں اسے تسلیم کیا ہے۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ اکبر کی شاعری کے جوہر نہ اُن کی عشقیہ غزلوں میں کھلتے ہیں نہ اُس کلام میں جو پند و نصائح یا فلسفیانہ و صوفیانہ لباس پہنے ہے۔ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز تو ان کی فطری ظرافت اور بے پناہ طنز ہے کہ جس نے ان کے نام و کلام دونو کو چمکا دیا۔ اس لحاظ سے اور اس رنگ میں اُردو شعراء کی محفل میں کوئی ان کا ثانی نہیں ۔ ظریف نے بھی لکھنؤ میں اس رنگ میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔ لیکن اکبر اکبر ہی ہیں جب تک اُردو زبان قائم ہے اور اُردو شاعری کے شائقین و قدردان موجود ہیں۔ اکبر کا نام باقی رہے گا۔ ان کے طرزِ ظرافت اور طنز کے قدردانوں میں کمی نہ ہو گی۔

ماجد صاحب کے تبصرہ میں ایک بات اور نمایاں معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آپنے اس تہی بغض کی پیروی میں کہ جو آپ کو مغربیت سے ہے اکبر کے کلام سے بیسیوں ایسے اشعار تو پیش کر دئے کہ جن میں نئی روشنی اور مغربیت کا خاکہ اڑایا گیا تھا۔ ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے کہ جن سے اکبر کی الوہیت معرفت اور تصوف کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے مگر جن نظموں رباعیوں اور قطعات سے اکبر کی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں جن میں ان کی ظرافت کی شوخیاں جھلکتی اور ان کے بے پناہ طنز کے نشتر چبھتے معلوم ہوتے ہیں یعنی جو ان کے کلام کے شاہکار ہیں اور جن سے اکبر کی شہرت آفتاب بن کر چمکی ان کا مضمون میں مشکل سے کوئی اقتباس ہو گا۔ یہ بات ذرا کھٹکتی ہے کیونکہ اس کمی کی وجہ سے پڑھنے والے کو اکبر کی شاعری کا صحیح اندازہ کرنا مشکل اور اردو شعراء کی مجلس میں ان کا مقام قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اکبر کی شاعری کا صحیح صحیح اندازہ کرنے اُن کے کلام کے محاسن و معائب معلوم کرنے اور کھوٹے کھرے کی جانچ کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بات کا سرسری تذکرہ کیا جائے کم از کم کچھ اشارے کئے جائیں کہ اکبر کس زمین میں پیدا ہوئے کس فضا میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا۔ اور کس آب و ہوا میں اُن کی شاعری کی نشو و نما ہوئی اور اس نے فروغ پایا اس سے ان کے دل و دماغ کے سمجھنے اور ان کے کمال شاعری کے سوتے کا سراغ لگانے میں مدد ملے گی۔ اس کا سرسری حوالہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ پچھلی ایک صدی میں (اکبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے) ہندستان

کا چولا بالکل بدل گیا ہے۔ اب ایک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو گیا ہے جس کا اندازہ کرنا اکبر یا اُن کے ہم عصروں کے لئے غیر ممکن تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شاہانِ مغلیہ کی محفل کی آخری شمع جو بادِ مخالف کے جھونکوں سے عرصہ سے جھلملا رہی تھی اب بجھ کر خاموش ہو گئی تھی سلطنت کا رعب و داب و کر و فر مٹ چکا تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے جلوے اور کرشمے اب خاک میں مل چکے تھے۔ روح و جسم کے فنا ہونے کے بعد خالی ایک خول باقی رہ گیا تھا۔ نام کی یاد اور اس کی حسرتیں طبیعتوں کو تڑپاتی اور قویٰ اور اعضا کو شل کئے ہوئے تھیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ وقت بہت سخت گزرا اور قوم کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ جنہوں نے اس تہذیب و تمدن میں چار چاند لگائے تھے اور ثروت و امارت کے دن دیکھے تھے یا سلطنت کا بار اپنے کاندھوں پر سنبھالا تھا اُن کی اولادیں بزرگوں کی گاڑھی کمائی عیش و عشرت کی رنگ رلیوں اور شراب و کباب کے شغل میں تباہ کر رہی تھیں۔ جنہوں نے ایک زمانہ میں اس ملک پر حکومت کی تھی اُن کی اولاد دفتروں اور محکموں میں کاغذ پیٹتی اور قلم گھستی تھی۔ قوم میں کٹھ ملا رہ گئے تھے یا باطی۔ "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ" والا مقولہ مشرقیوں میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان معیارِ زندگی مانا گیا ہے۔ اس دور کے مسلمان اس کی صحت اور حقیقت کا اپنی حالت سے اندازہ کرتے ہوئے اسی پر تن بتقدیر بیٹھے ہوئے تھے۔ مسجدوں میں نماز پڑھنے اور خانقاہوں میں اللہ اللہ

کرنے کے سوا نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ دنیا تو بگڑ چکی تھی اب عقبےٰ کو سنبھالنے کی فکر تھی۔ مختصراً مسلمانوں میں سوائے میاں پن کے اب کچھ باقی نہ رہا تھا۔ بچی کھچی طبیعتوں میں جو کچھ تڑپ باقی تھی وہ بذلہ سنجی اور غزل گوئی کے نذر ہوتی تھی۔ بیکاری کا یہی ایک شغل رہ گیا تھا۔ اکبر نے جب آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا تو یہی تاریکی دیاس کا منظر ان کے چاروں طرف تھا اسی میں اُنھوں نے پرورش پائی باوصف ان کی فطری ذہانت اور زندہ دلی کے معلوم ہوتا ہے کہ جو اثر اس ماحول سے لڑکپن میں اُنھوں نے قبول کیا تھا وہ اسے دماغ وطبیعت پر سے کبھی ہٹا نہ سکے۔ یاس وہراس کی جو کیفیت مسلمانوں پر طاری تھی کم وبیش وہی کیفیت ہندوؤں کی بھی تھی۔ بجز اس کے کہ اُن میں بیداری ایک نسل پہلے شروع ہو گئی تھی اور اس لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے بھی بچھڑے ہوئے تھے۔ اندھیر نگری چوپٹ راج کا جو زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں گزرا غدر کے بعد اُس میں ایک انقلاب آیا۔ دولت برطانیہ نے جب ہندوستان کی حکومت کی باگیں براہ راست اپنے ہاتھوں میں لیں تو انگریزی حکومت کا تعمیری دور شروع ہوا۔ ملک میں امن قائم ہو گیا تھا۔ قانون وعدالت کا سکہ جم رہا تھا۔ یونیورسٹیاں کھل رہی تھیں۔ پریس کو آزادی حاصل تھی۔ سائنس اور جمہوریت کا چرچا شروع ہو گیا تھا اس طرح سے نئی روشنی کی کرنیں ہمارے افق پر پھوٹنے لگی تھیں اور قوم اور ملک کے پیشوا اور رہنما ترقی کی سبیلیں نکالنے لگے تھے۔ زمانہ کے اس طرح کروٹ بدلنے نے دو ایسی تحریکوں کو جنم دیا۔ کہ جن کا

اثر ملک پر محض عارضی اور وقتی نہیں بلکہ بہت دیرپا اور گہرا پڑا۔
ایک تحریک انڈین نیشنل کانگریس اور سوشل کانفرنس کی تھی کہ جس
کے بانی ملک کے نامور مفکر اور مدبر تھے جنہوں نے ملک کے لئے
ایسا راستہ تجویز کیا کہ جس میں نئے اور پُرانے مشرق و مغرب
دونوں تمدنوں اور تہذیبوں کا اتحاد و توازن تھا۔ ایک طرف سرکار
سے۔ اپنے حقوق کا مطالبہ تھا تو دوسری جانب قوم کی اصلاح کا
جذبہ۔ مطلب یہ تھا کہ مغرب کی نئی روشنی سے جو کچھ حاصل ہوتا
ہے اُسے لیا جائے لیکن مشرق کی پُرانی تہذیب میں بھی جو کچھ باقی
ہے اُسے کھویا نہ جائے۔ اس تحریک کا منشا ہندوستانی قومیت
کی عمارت کا کھڑا کرنا اور خود مختار حکومت قائم کرنا تھا اس تحریک
میں بلا تفریق مذہب و ملّت سب ہندوستانیوں کے شامل ہونے
کے لئے دروازے کھُلے تھے گو عملاً اکثریت ہندوؤں ہی کی تھی۔
دوسری تحریک سر سید احمد خاں نے علی گڑھ سے شروع کی یہ صرف
ہندی مسلمانوں پر محدود تھی۔ تحریک کی غرض و مقصد مسلمانوں کی
تعلیم اور معاشرتی اصلاح تھی۔ سیاسیات سے اس کو علاحدہ
رکھا گیا تھا لیکن کچھ ہی زمانہ بعد اس نے نیشنل کانگریس کی مخالفت
شروع کردی اور مسلمانوں کو ہندوؤں اور کانگریس سے علحدگی کا
سبق سکھایا آگے چل کر اسی تحریک نے مسلم لیگ کو جنم دیا کہ جس
سے علحدگی و نفاق کی بنا پڑی اور ملک کے دو ٹکڑے ہوئے اور
شدید نقصان پہنچا۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان ملت
کے حق میں اس تحریک نے اکسیر کا کام کیا۔ جس نے مُردہ قالب

میں نئی روح پھونک کر اس میں جان ڈال دی۔ انگریزی تعلیم کی نئی
روشنی نے ان کی آنکھیں کھولیں ان کے طرز معاشرت کی اصلاح
کی انہیں زندگی کے حوصلے اور ارمان پیدا کئے اور آیندہ کی ترقی
اور عظمت کی منزل قرار دے کر اس کا راستہ صاف کیا اور یہ سب
نتیجہ تھا اُن عظیم کوششوں کا جو سر سید احمد خاں نے اپنے تدبر اور
تفکر اپنے حوصلے اور استقلال سے ملت کی خدمت گزاری میں جان
کھپا کر کی تھیں۔ سر سید احمد خاں کی ذات اور ہستی بہت بلند پایہ رکھتی
تھی، وہ لفظ کے اصل معنی میں مفکر (Thinker) تھے۔
ان میں عظمت و بزرگی کے وہ سب اوصاف موجود تھے کہ جو کسی
فرد کو یکتائے روزگار بنا دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں ان کا وہی مرتبہ
ہے جو رام موہن رائے یا راناڈے کا ہندوؤں میں۔ یہ اُن ہی
کی ذات کا تبرک ہے کہ آج یہاں کے مسلمان کٹھ ملا بنے رہنے
کے بجائے دور حاضر کے مہذب انسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سر سید کی
تحریک نے دو صورتیں اختیار کیں، ایک میں تفکر و تدبر تھا، دماغ
تھا۔ اور جوش عمل جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور ایم۔ اے
او کالج کی شکل میں نمایاں ہوا۔ جس نے بعد میں مسلم یونیورسٹی کو جنم دیا
دوسرا دھارا محض سطحی اور جذباتی تھا جو شمالی ہند کے اسلامی اردو
پریس کے راستہ سے بہتا تھا اس میں مسلمانوں کی اصلاح و فلاح
کا خیال تو کم تھا لیکن ہندوؤں کو برا بھلا کہنے اور ان پر طعن و تشنیع
کرنے اور کانگریس کی مخالفت کا جذبہ زیادہ تھا کانگرس میں بھی
ایسے سطحی اور جذباتی عناصر کی کمی نہ تھی یعنی ایسے طبقہ کی کہ جس کو

آزادی خودمختاری اور جمہوریت کی قدروں کی تو پروا کم تھی۔ لیکن انگریزی حکومت اور نئی روشنی سے بغض اس لئے تھا کہ وہ ہماری پرانی تہذیب و مذہب رسموں اور روایتوں کی بیخ کنی کرتی تھیں اُردو پریس میں لکھنؤ کا اودھ پنچ اس ٹکڑی کا علمبردار تھا۔ اردو صحافت کا وہ دور کہ جب اودھ پنچ کے شباب کا زمانہ تھا آج سے بالکل مختلف تھا۔ شمالی ہند میں صرف دو روزانہ اخبار جاری تھے۔ ایک لاہور کا پیسہ اخبار اور دوسرا لکھنؤ کا اودھ اخبار۔ اور اردو پر ہی کیا منحصر ہے انگریزی کا بھی صوبہ بھر میں ایک ہی روزانہ اخبار تھا۔ اور وہ بھی انگریزوں کا۔ اس زمانہ میں اس کی ۴ رقی کا پی قیمت تھی۔ خال خال ہندوستانی اور وہ بھی اونچے طبقے کے پائنیر پڑھا کرتے تھے۔ بابو گنگا پرشاد ورما کا اخبار ایڈوکیٹ جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا کانگریس کی رایوں کا واحد ترجمان تھا۔ اور اردو میں ہندوستانی سیاسیات کی تعلیم کا ذریعہ۔ اردو میں ماہانہ رسالوں کا اس وقت تک کوئی ذکر نہ تھا۔ مخزن۔ زمانہ۔ نگار وغیرہ بیسویں صدی کے شروع میں شائع ہونا شروع ہوئے۔ کبھی کبھی پیام یار یا گلدستۂ سخن کے ناموں سے بعض رسالے شائع ہوتے تھے۔ جن میں مشاعروں کی طرح غزلیں نکالی جاتی تھیں اور بس۔ اس زمانہ کا اردو پریس ہفتہ وارانہ تھا جن میں امرتسر کا وکیل اور وطن۔ اٹاوہ کا البشیر اور گورکھپور کا مشرق نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور علی گڑھ کی تحریک کے حامی تھے۔ اودھ پنچ کانگریسی عقیدے کا طرفدار تھا آپس میں خوب چوٹیں چلتی تھیں۔

مرزا سجاد حسین کے دم سے پنچ کی ظرافت اور طنز کے نشتر اتنے
نکیلے ہوتے تھے کہ رقیب مقابلے میں ٹھیرتے نہیں تھے۔ جو سامنے آیا
اُس نے منہ کی کھائی۔ سیاسیات کی بحثیں تو کم ہوتی تھیں نئی روشنی
اور علی گڑھ کے نیچر نیچر کا مذاق بے طرح اڑایا جاتا تھا۔ طنز و ظرافت
سے گزر کر پھکڑپن کی بھی نوبت آجاتی تھی تاہم اس زمانہ کے مذاق
کے مطابق اودھ پنچ کی ظرافت اور طنز و مزاح ذوق سلیم پر بار
نہیں گزرتا تھا۔ اودھ پنچ نے دائرۂ صحافت سے گزر کر ادب کی
حدیں بھی چھوئی تھیں۔ اس نے بعض اچھے اچھے لکھنے والے پیدا
کئے۔ سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ تربھون ناتھ ہجر
جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ نواب سید محمد آزاد۔
اودھ پنچ کے نورتن تھے۔ اور حضرت اکبر الٰہ آبادی انمول رتن
جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اکبر نے جب آنکھیں کھولیں اور ہوش
سنبھالا تو اُس وقت نہ صرف مسلمانوں کے زوال بلکہ انتہائی
انحطاط و یاس کا زمانہ تھا۔ اکبر کی تعلیم اور پرورش اسی ماحول
میں ہوئی تھی۔ مذہبیت و مشرقیت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسلامی
تہذیب و معاشرت سے ان کی شخصیت اور خصلت کا خمیر گندھا تھا۔
اسی زمانہ کے علم و ادب کا ان پر جادو چلتا تھا۔ اسی انحطاطی دور
کی بچی کھچی جو کچھ خوبیاں باقی تھیں اُن میں موجود تھیں۔ رواداری
وضعداری۔ مہمان نوازی اپنے زمانہ کی شرافت آداب و اخلاق
جو ایک خدا ترس مسلمان میں ہوا کرتے تھے۔ اُن میں بھی تھے۔
یہی ورثہ تھا جو اُنھوں نے بزرگوں سے پایا تھا اور وہ اسے

کلیجہ سے لگا کر رکھتے تھے۔ یہی ان کی دولت تھی۔ یہی عقیدہ اور
ایمان۔ اس سے زیادہ کی انہیں توفیق نہ تھی۔ یہی زمین و آسمان
انہوں نے دیکھا تھا اور اُن کا عقیدہ تھا کہ یہی ہمیشہ سے چلا آیا
ہے اور چلا جاتا رہے گا۔ اس میں کسی قسم کی رد و بدل، اصلاح یا
انقلاب کی گنجائش نہیں تھی نہ کسی غور و فکر کی ضرورت۔ اور
فکر و تدبر کی گنجائش ہی کہاں تھی جس نظام عالم پر صدیوں
کے فکر و تدبّر کی مُہریں ثبت تھیں اور جو تہذیب و تمدن میں حرف
آخر مانا جاتا تھا اس میں دلیل و بحث کا موقع ہی کیا تھا۔ خود کہہ
گئے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

فالتو کے لفظ میں کس بلا کی تحقیر و طنز ہے۔ مشرقی تہذیب و تمدن
کے حدود کے باہر جو کچھ بھی ہے وہ صرف فالتو عقل کا فتور ہے لہذا
دلیل و بحث بے کار۔ جب تفکر تدبّر اصلاح دلیل و بحث سب فالتو
عقل کا فتور ٹھیرا تو سوائے سطحی جذباتیت کے اور رہ ہی کیا گیا۔
اور یہ اُن میں کافی سے زیادہ ہے۔ ایک شعر میں فرما گئے ہیں :۔

اس بزم میں وہ کہتے ہیں ہمیں موقع کے موافق بات کرو
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

جب زمانہ نے کروٹ بدلی نئی روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔
اصلاح کا دور شروع ہونے لگا اور انہوں نے دیکھا اور محسوس
کیا کہ نظام عالم میں یعنی ہند کی اسلامی دنیا میں خلل واقع ہو رہا
ہے خدا کی خدائی میں فرق پڑ رہا ہے تو پورے جوش کے ساتھ

ردِّ عمل کے لئے تیار ہو گئے۔ لڑنے کے لئے اُن کے پاس طنز و ظرافت کے تیر و نشتر تھے اور آو دھ پنچ کا میدان اور اکھاڑہ۔ شبہ نہیں کہ دل کھول کر لڑے اور اچھے اچھے معرکے سر کئے لیکن زمانہ کے دھارے کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ مقدر مٹایا نہیں جا سکتا مسلمانوں کو اُبھرنا تھا۔ اُبھرے۔ خدا کی خدائی میں خلل پڑنا تھا۔ پڑا مشیت ایزدی میں کوئی چارہ نہیں یہ بھی تھک کر اور ہار کر بیٹھ رہے۔ سمجھے کہ قیامت آنے والی ہے۔ جب قیامت آنے لگی تو پھر کچھ سوچنے سمجھنے کرنے دھرنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ سوائے گوشہ نشیں ہونے اور اللہ اللہ کرنے کے کوئی چارۂ کار نہ رہا اس میں اکبر کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے عام طور پر ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

معمولی طور سے انسان شباب کی اُمنگوں اور ولولوں کشمکش اور معرکوں عشرتوں اور رنگ رلیوں سے سیر ہو کر جب دورِ انحطاط میں قدم رکھتا ہے تو اُسے مضمحل اور شل ہونے لگتے ہیں خانگی کلفتیں دماغ کو پریشان کرنے لگتی اور تھکانے لگتی ہیں اور وہ عارضوں اور بیماریوں سے تنگ آجاتا ہے تو پھر دنیا کے عذاب سے عاجز آکر سوائے گوشہ نشینی میں اللہ اللہ کرنے کے اور کوئی چارۂ کار سُجھائی نہیں دیتا ۔ اکثر نیک اور وضعدار لوگ عقیدۂ تصوف میں ہی پناہ لیتے ہیں ۔ زندگی کا یہ ردّ عمل نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ غیر معمولی ۔ اکبر پر بھی یہی وقت گزرا۔ یہ تو دوراز کار باتیں تھیں بہ سبیل تذکرہ کرنا پڑیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اکبر کا کمال شاعری تو اُن کے بے مثل طرزِ طنز و ظرافت میں نظر آتا ہے۔ قدرت نے

اپنے خزانہ سے زندہ دلی وظرافت اور طنز ومزاح کی دولت کی اُن پر اس طرح بوچھار کی تھی کہ وہ عمر بھر اس کو لٹایا کئے لیکن آخر دم تک اس نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس سوتے سے صرف چشمے ندیاں اور آبشار نہیں بہے بلکہ طبیعت کی طغیانی کا یہ حال تھا کہ کوئی شے یا کوئی شخص اس کی باڑھ کی زد سے بچا نہیں۔ بدھو وفاتی اور جمن سے لے کر مولوی، شیخ، مرزا تک ہر ایک ان کی زندہ دلی اور ظرافت کا نشانا بنا ہے۔ رام لال، ہر چرن داس بابو اسو توش سے لے کر کرزن، مہراج اور مالوی جی سب ہی ان کے طنز کے نشتروں کے شکار ہوئے ہیں۔ پیر نیچر سر سید تو ان کی فن کاری کا تختۂ مشق تھے حتیٰ کہ گاندھی جی بھی اس لپیٹ میں آ گئے مگر حد ہو گئی کہ حضرت اکبر نے خود اپنے تئیں بھی نہیں بخشا۔ کسی کی ذات اور نیت پر حملہ مقصود نہ تھا۔ اکبر میں مذہبیت تو تھی لیکن فرقہ وارانہ تعصب سے اُن کا دامن پاک تھا۔ ہر شخص کہ جس کے نام پر ان کے تیروں کی بوچھار ہوتی تھی کسی نہ کسی طبقہ جماعت سیاست یا معاشرت کا نمائندہ ہوتا تھا۔ اور اس طبقہ جماعت یا معاشرت کی خامیوں اور کمزوریوں کو وہ اپنی ظرافت اور زندہ دلی سے اچھالتے اور طشت از بام کرتے تھے۔ دوسروں کا مذاق اُڑانے والا جب خود اپنے آپ دوسروں کا نشانۂ مذاق بن کر قہقہے لگاتا ہے یا خود اپنا مذاق آپ اُڑاتا ہے تو طنز وظرافت کے نشتروں کی چبھن محسوس نہیں ہوتی اور طبیعت بشاش رہتی ہے یہی اصلی طنز ومزاح کا جوہر ہے۔ کیا خوب شعر ہوا ہے:۔ ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا　　اُس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے معیار اور اس کے فلسفہ کا سمجھنا تو حضرت اکبر کے بس کی بات نہ تھی نہ اُن کی افتادِ مزاج ہی انقلاب کے ہنگاموں کی تاب لا سکتی تھی جو نہ ہونا تھا سو نہ ہوا مگر مدخولۂ گورنمنٹ اور گاندھی کی گوپیوں نے شعر میں جو شعریت کا لطف پیدا کر دیا ہے اس کی داد کون نہ دے گا۔ دو غیر مانوس لفظوں کو شعر میں اس طرح کھپایا ہے کہ گویا نگینے جڑ دئے ہیں جن سے پورا ایک طبق روشن ہو جاتا ہے۔

اکبر کو غیر مانوس لفظوں بالخصوص انگریزی اور ہندی کے لفظوں کے شعر میں کھپانے اور نباہنے کا کچھ ایسا سلیقہ تھا اور وہ بھی طنز و ظرافت کے رنگ اور زمین میں کہ لفظ لفظ نہیں رہ جاتے بلکہ نگوں کی طرح چمکنے لگتے تھے کہ جو مرصع ساز کا کام ہے۔ اُن کا ایک شعر جو پہلی جنگِ عظیم میں (۱۹۱۴ء) ایسا مشہور ہوا کہ گلیوں اور بازاروں میں ہر کہ و مہ کی زبانوں پر تھا لیکن جو ان کی کلیات کی جلدوں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہمیشہ یاد رہے گا سُنئے ؂

پریس بیورو کی خبروں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے
فتح سرکار کی ہوتی ہے قبضہ ان کا ہوتا ہے

"ان کا" بھی کوئی لفظ میں لفظ ہے لیکن اکبر کے قلم نے اس معمولی اشارہ میں انگریزوں کے جنگی پروپیگنڈا کے دفتر کے دفتر کھول دئے ہیں۔ شعر اکبر ہی کا ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ ایک اور موقع پر بھی اُنھوں نے اس لفظ سے یہی کام لیا ہے

"جلوۂ دربارِ دہلی" کے نام سے جو نظم لکھی گئی ہے اُس میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کیا کیا دیکھا۔ چار شعر ملاحظہ ہوں۔

رنگِ زمانہ آج کا دیکھا اوجِ برٹش راج کا دیکھا
رخِ کرزن مہاراج کا دیکھا پرتو تخت و تاج کا دیکھا
محفل اُن کی ساقی اُن کا اوجِ بختِ ملاقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا چرخِ ہفت طباقی اُن کا

آخری مصرع نے معمولی مصرعوں میں جان ڈال کر انہیں آسمان پر چڑھا دیا ہے۔

ع۔ آنکھیں میری باقی اُن کا۔ چار لفظوں میں کیا کیا نہیں کہہ دیا۔ طنز بھی ہے، حسرت بھی ہے۔

اکبر کی کلیات کی جلدوں میں پچاسوں اشعار ایسے ہیں کہ جن سے ان کی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں ان کی زندہ دلی اور ظرافت کی شوخیاں جھلکتی ہیں اور ان کے بے پناہ طنز کے نشتر چبھتے ہیں۔ مثلاً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ان کا لطف اُٹھائیے اور داد دیجئے :۔

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں
فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی اب تو دھن ہے اُنہیں فرنگن کی
تاکید عبادت پہ یہ کہتے ہیں لڑکے پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی
عشاق کو بھی مالِ تجارت سمجھ لیا اس قہر کو ملاحظہ للّٰہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فوٹوگراف میں کہتے ہیں فیس دیجئے اور آہ کیجئے
بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

محتاجِ درِ وکیل و مختار ہیں آپ
سارے عملوں کے نازبردار ہیں آپ

آوارہ و منتشر ہیں مانندِ غبار
معلوم ہوا یہ کہ زمیں دار ہیں آپ

رہ گئے نا آشنا احباب غائب ہو گئے
ہم نفس جو ایک باقی تھے وہ صاحب ہو گئے

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بنک میں
قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس میں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دیکھیے جب وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا
بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجیے

اب کہاں تک بتکدے میں صرفِ ایماں کیجیے
تا کجا عشقِ بتانِ سست پیماں کیجیے

ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجیے مجھکو مسلماں کیجیے

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے
شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

یہ کیا تم نے کہا اب کوئی ملجا ہے نہ ماویٰ ہے
خدا کے فضل سے بھائی علی گڑھ ہے اٹاوہ ہے

برق کے لیمپوں سے آنکھوں کو بچائے اللہ
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

شانِ نمازِ اکبر شاہانہ ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

حکم برٹش کا ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

ترقی کی تپیں ہم پر چڑھا کیں
گھٹا کی دولت ایپچیں بڑھا کیں

رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن
وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ہم کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی۔اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ان شعروں اور رباعیوں میں طنز و ظرافت کا جو لطف ہے اس سے طبیعتیں محفوظ ہوتی ہیں اور ان کی فن کاری کی داد دینی پڑتی ہے لیکن ان کی شاعری کا کمال تو نظموں یا قطعوں میں نظر آتا ہے جن میں انھوں نے زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کی مصوری کی ہے جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر سامنے رکھ دی ہیں ان میں ظرافت کے قہقہے نہیں صرف تبسم زیر لب ہے۔ اور ہلکا ہلکا طنز جو کچھ نظموں کی شعریت میں جان ڈال دیتا ہے۔ اُن کی یہ نظمیں کافی مشہور ہوئیں اور انھوں نے بھی ان کے نام اور طرز شاعری کو چمکایا۔ ملاحظہ ہو :۔

برق کلیسا

رات اُس مِس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدرِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سُننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سُن کر جسے بلبل چہکے

آتشِ حُسن سے تقوی کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

معشوق کے چشم و ابرو اور خد و خال کی نقاشی سراپا میں بیشتر

شاعروں نے کی نہے اور ہماری نظروں سے گزری ہے لیکن ایمان
لگتی بات کہئیے گا کہ انداز بیان کی یہ ندرت اور اس سے جو لطف
صل ہوتا ہے وہ آپ نے کبھی اور بھی دیکھا ہے ہاں تو پھر کیا ہوا سے

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی — سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار — دولت و عزت و ایمان ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے — ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

تو کیا جواب ملا :-

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی — ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

وغیرہ وغیرہ

مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ یہ ہیں نیک نہاد — ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی — کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی
عرض کی میں نے کہ ہے لذتِ جاں راحتِ روح — اب نہ مانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں — گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں
موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد — میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ یہ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں — نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم — تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم
میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو — ہنس کے بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

طنز و مزاح کو ادبیت اور شعریت میں اس طرح سمو کر جو ندرت

کلام میں پیدا کی ہے اور برق کلیسا کی جیسی جیتی جاگتی تصویر اس نظم میں کھینچی ہے اس کی دوسری مثال ہمارے ادب میں شاید ہی ملے۔ پھر زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف و اظہار بھی بغیر اپنا اثر کئے نہیں رہتا۔

زندگی کی حقیقتوں کی مصوری اور وہ بھی نظم میں کہ جس میں طنز و مزاح کی لذّت نے شعریت کے حسن و دلآویزی کو دوبالا کر دیا ہو۔ آسان کام نہیں ہے۔ نہ ہر ایک کا بوتہ ہے فیض قدرت سے اکبر کو اس کا سلیقہ و صلاحیت بدرجۂ اتم عطا ہوئی تھی۔

ملاحظہ ہو :۔ ؎

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ — بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

لندن میں ایک عقد کے واقعہ میں اس شعر پر کس ادا اور تکرار کے ساتھ تضمین کی ہے کہ ہر شعر خود بخود بولتا ہے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ؎

ایک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد — اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم — کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ — ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہو رہی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو — قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو — شوربے کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز و طریق — بال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم پہ خم — ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا — جس سے تھا دل کی حرارت کو برابر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں جو روش جادو نظر | یاں جوانی کی امنگ اور اُن کو عاشق کی تلاش
اس کی چتون سحر آگیں اس کی باتیں دل ربا | چال اُس کی فتنہ خیز اس کی نگاہیں برق پاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ ایک برق بلا | دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور یہیں کہتا دور باش
دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا | دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش
بار بار آتا ہے اکبرؔ میرے دل میں یہ خیال | حضرتِ سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حقیقت اور اصلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا ہوا ہے اور ہوتا ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے؟ یہی کہ نئی روشنی کے ساتھ جہاں نور اور تجلیاں آئیں وہاں کچھ ظلمت بھی۔ ترقی کے دور میں ہم نے موتی اور جواہر رولے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ سنگریزے بھی۔ آزادی کی پرواز میں ہم نے بلندیاں بھی چھوئیں اور کبھی کبھی پستیاں بھی۔ ایثار، ہمت، استقلال، آزادی اور ترقی کی مسافت میں منزل تک پہنچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کی نظر فیشن کی رنگینیوں۔ عیش و عشرت کی بے عنوانیوں تک ہی پہنچتی اور ان میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے تو کیا اس لئے روشنی، ترقی اور آزادی سے مُنہ موڑ لیا جائے۔ اکبرؔ کی زندگی کا ماتم یہی ہے کہ وہ نئی روشنی کے نور و تجلی کو بھی ظلمت سے تعبیر کیا کئے۔ اُنھیں موتیوں اور جواہر کے انبار میں صرف سنگریزے ہی دکھائی دیئے۔ آزادی کی پرواز میں اُنھیں بلندیاں نہیں دکھائی دیں صرف پستیوں ہی میں پڑے رہے۔ نئے دور کی نئی قدرو

کو پہچاننے اور اُن کے سمجھنے کی اگر اُن میں صلاحیت ہوتی تو اُن کے طنز کے نشتر بڑے کارگر ہوتے اور اُن کا طنز و مزاح بھی پیام کی حیثیت رکھتا اب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ گو وہ قوم کی رفتار ترقی میں زندگی بھر روڑے ہی اٹکایا کئے لیکن نئی تہذیب کے نئے فیشن اور بے عنوانیوں پر ان کے تیر و نشتر خوب چلے اور کارگر بھی ہوئے۔ گو اُنہوں نے ترقی کی رفتار کو بڑھایا نہیں لیکن تنزل کے ڈھال میں کچھ رکاوٹ ضرور پیدا کیا اور سنبھالا دیا۔ یہ بھی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

نئی روشنی اور نئی تہذیب کے خلاف اپنے تیر و تفنگ چلاتے چلاتے جب اکبر تھک جاتے انہیں اُن کے کارگر نہ ہونے کا احساس ہوتا تو ان پر ناکامی کا اضمحلال اور پُرانی یادوں کی حسرتیں چھا جاتیں۔ اس کیفیت کے دوران میں بھی جو ان کا کلام ہوا ہے لطف و دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہتے ہیں :-

بٹھائی جائیں گی پردے میں بی بیاں کب تک
بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کب تک

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام آئیں گی چلمن کی تیلیاں کب تک

میاں سے بی بی ہیں پردا ہے ان کو فرض مگر
میاں کا علم ہی اٹھا تو پھر میاں کب تک

طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں
یہ غیرتیں یہ حرارت یہ گرمیاں کب تک

عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں
سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک

جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

جناب حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

ان میں طنز و مزاح کا رنگ ہلکا ہے اور ہر شعر سے حسرت ٹپکتی ہے۔ پڑھنے والے کو شاعر سے ایک قسم کی ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ آپ لاکھ پردے کی رسم کے خلاف ہوں پرانی تہذیب اور پرانا تمدن آپ کو ایک آنکھ نہ بھاتا ہو مگر اکبر کے اس کلام کی لطافت اور اس کے حسن مذاق کی داد دیئے بغیر نہیں بنتی۔ اس سے شاعر کے قادر الکلام ہونے اور اس کے کمال کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اور اس سے زیادہ خراج تحسین کسی شاعر یا ادیب کو کیا مل سکتا ہے کہ اس کے مخالف بھی اس کی واہ واہ میں شریک ہوں۔

بایں ہمہ اکبر کی شاعری اور ان کے کلام میں کچھ نقص بھی ہیں اور عیب و نقص کس میں نہیں ہوتے۔ بے عیب تو صرف خدا کی ذات ہے اور یہ بھی اگلے وقتوں کے لوگوں کا مقولہ ہے۔ اب تو لوگ خدا کی ذات کو بھی نہیں بخشتے۔ اکبر نہایت پُرگو شاعر تھے۔ اُنہوں نے بہت کہا۔ کلیات کی چار جلدیں ایک طویل عمر کے لئے بھی کم نہیں ہیں پھر انسان کی طبیعت خواہ وہ کیسا ہی زندہ دل اور بذلہ سنج کیوں نہ ہو ہر وقت تو حاضر نہیں رہتی۔ لازمی ہے کہ جب ہر وقت کچھ نہ کچھ کہے جانے کی عادت پڑ جائے تو ہر طرح کا کلام قلم سے نکلے گا۔ غیر مانوس اور بالخصوص انگریزی الفاظ کو نگوں کی طرح جڑنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ یہی عادت زیادتی سے بگڑ کر عیب ہو گئی ان کے کلام میں بہت کافی اشعار ایسے ملتے ہیں جو غیر مانوس انگریزی الفاظ کی بھتات اور بے موقع استعمال سے بالکل بے مزہ ہو گئے

ہیں۔ ان میں نہ کوئی طنز و ظرافت کی چاشنی ہے نہ شعریت کا حسن دیکھئے :۔

علم و حکمت میں ہو اگر خواہش فہیم
یا مینیش کے صدقے جا کے دودھ اور کھانڈ لے

سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کرا یم
یا الیکشن کے بدلے تو چلا جا مانڈ لے

لطفِ سخن تو یہی یہی لٹرس بھی سوئی بھی ہو
زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو

ذہن کا وصف یہی یہی اور انٹیلیجنس بھی ہو
اس کو کالج اور اُسے کانووکیشن سمجھو

اسمال نہیں گریٹ ہونا اچھا
دل ہوتا ہے بُرا پیٹ ہونا اچھا

جب میں کہتا ہوں کہ گومی کسں ڈیر
سر جھکا کر کہتے تو یہ ٹیک ہیں

وہ بولے مرا اُن کا کیا جوڑ ہے
میں گلر تنگ ہوں وہ ہیں اسٹیلیس

کچھ سین خوش آتے ہیں نہ بھاتے ہیں بزرجی
میں نیل کا طالب مجھے انتخواہان ازرجی

سنتا نہیں لکچر میں پڑا رہتا ہوں دن رات
لگتا ہے فقط لیڈیوں میں وقت زرجی

جو پوچھا میں نے ہوں کس طرح ہیپی
کہا اُس مس نے میرے ساتھ مے پی

موقع کا ہی خیال نہ اب کانشنس سے
ارشاد ہو غلط بھی تو اس کا ڈیفنس ہے

عاشق ہوں میں فقط یہ تقاضا میوزئے
یاروں سے التجائے پلیز ایکسیکیوز ہے

اُن کے دستِ ناز سے ہے پائی ٹی
اب کہاں باقی ہے ہم میں پائٹی

بسا اوقات رعایت لفظی میں بھی کچھ لطف ہوتا ہے مگر یہاں تو سوائے اس کے کہ بھونڈا پن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے کوئی خوبی نہیں محض تک بندی ہے اور وہ بھی ادنیٰ درجہ کی۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کا کلام بالعموم ابتذال، رکاکت اور فحاشی سے پاک ہے لیکن کچھ مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں کہ جن کا طنز و ظرافت ذوقِ سلیم پر بار گزرتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ اکبر کے سے بزرگ کے

قلم نے ایسے اشعار نکلے۔ مثالاً:۔

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

ایک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا
ایک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

پتلون میں تن گیا وہ سائے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

اس مس کی زباں ات جولی بینی دہن میں
بولی یہ تری راہ ترقی میں ہیچ ہے

میں نے کہا اس کا لر مشرق ہوں اے مس
چپ رہ کہ یہی میری سکنڈ لینگویج ہے

سینے پہ بٹنوں کے دسترس مشکل ہے
پائنٹ یہ سخت ہے اسے ٹچ نہ کرو

لیا لیبھی جا اکبر غضب کی بیوٹی ہے
نہیں نہیں پہ نہ جا یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں
ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ مبہم کو

پھر کر کے اس پہ قبضہ کہہ دیں ترک اُن سے
"سالونکا" سے اب تو سالونکالو ہم کو

معذرت کی جا سکتی ہے کہ اس زمانہ کا مذاق ہی ایسا تھا۔ داغ نے بھی تو کہا تھا۔ ع۔ مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں۔ اور پھکڑپن تو اودھ پنچ کی ٹکڑی میں روا سمجھا جاتا تھا۔ پھر دنیا بدل گئی۔ زمانہ بدل گیا اور اس کے ساتھ ہمارا مذاق سخن بھی کسی قدر بدل گیا ہے۔ سنجیدہ حلقوں میں ایسے مذاق کی داد اب کم ملے گی۔ فحاشی ہو کہ نہ ہو۔ ابتذال و رکاکت بھی نہ سہی پر ان اشعار میں بازاری پن اور پھکڑپن تو ضرور ہے۔

باوصف اس کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طنز و ظرافت کی شاعری کے رنگ میں اب تک اردو لٹریچر میں کوئی دوسرا ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا اور جب کہ حقیقت نگاری کی دھن میں حسن و لطافت طنز و مزاح کا رنگ مدھم پڑتا جا رہا ہے کسی ایسے باکمال کا آئندہ

پیدا ہونا بھی مشکل ہے۔ اردو ادب کے اُفق پر اکبر کا نام سورج کی طرح چمکتا رہے گا۔ اور اس کی کرنیں ہماری زمین پر اُجالا بکھیرتی رہیں گی۔ مگر زندگی بھی کیا طرفہ تماشا ہے کہ جس شاعر کی زندہ دلی و ظرافت سے عمر بھر مجلسیں گرم ہوتی رہیں جس کے طنز و مزاح کی شوخی اور بیباکی سے محفلیں گونج اُٹھتی تھیں وہ آخر عمر میں بے بس ہو کر مشرقیت کی میت کے ماتم میں نوحہ خوانی اور مرثیہ گوئی پر مجبور ہو۔ فرماتے ہیں:

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے ۔۔۔ نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی ۔۔۔ نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی ۔۔۔ نہ گھونگٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے ۔۔۔ نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے ۔۔۔ نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمہ تقلیدِ یورپ کے ۔۔۔ مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی ۔۔۔ لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں ۔۔۔ زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے ۔۔۔ کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر ۔۔۔ بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

کیسا درد اور کتنی حسرت ہے ان شعروں میں! کون ایسا کافر دل ہوگا جو اس سے متاثر نہ ہو۔

-----⁂-----

ہمارا پُرانا اور نیا کلچر

ہمارا پُرانا کلچر کیا تھا اور آج اس سو پچاس برس کی تبدیلیوں کی فضا میں اس کا رنگ کیا سے کیا ہو گیا اس مضمون میں اسی کا ذکر رہے گا۔
دماغ سلجھا ہوا ہو۔ بات کے سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت ہو۔ طبیعت میں شرافت اور نفاست ہو۔ رہنے سہنے کا ڈھنگ صاف ستھرا ہو۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے کا تمیز ہو۔ کھانے پینے اوڑھنے پہننے کا سلیقہ ہو۔ دنیا کی نعمتوں کی نگاہ میں قدر و قیمت ہو۔ مذاق شستہ ہو۔ غرض کہ جس شخص میں اچھے بُرے کی تمیز ہو اور اُس کے چال چلن سے شائستگی جھلکتی ہو تو کہیں گے کہ اس شخص میں کلچر ہے۔ اردو میں اس کے معنیٰ ادا کرنے کے لئے غالباً "شائستگی" کا لفظ ٹھیک ہو گا۔ اس کے معنیٰ سمجھانے کے لئے شاید مثال سے مدد ملے ایک کہاوت ہے اس کے صحیح اور غلط ہونے سے بحث نہیں۔ غرض مطلب سمجھنے سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شریف نواب زادے تھے۔ اُنھوں نے چار شادیاں کی تھیں۔ ان کی ایک بیوی ایرانی تھی۔ دوسری کوئی دہلی کی خاتون۔ تیسری لکھنؤ کی بیگم۔ اور چوتھی پنجابن۔ آدمی شوقین مزاج تھے اسی لئے چار بیویاں چُن چُن کر کی تھیں۔ طبیعت چاہی کہ ان کے دل و دماغ کا جائزہ لیا جائے رات کا پچھلا پہر تھا، تڑکا ہونے والا تھا لیکن پَو ابھی پھوٹی نہیں تھی۔ آنکھ جو کھُلی تو اپنی ایرانی بیوی سے پوچھا کہ "کیا وقت ہو گا" اس نے جواب دیا کہ "پَو پھوٹنے والی ہے صبح ہوا چاہتی ہے"

آپ نے پوچھا کہ "تم نے کیسے اندازہ لگایا" وہ بولی کہ "میرے بُندے کے موتی ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔"

دوسرے دن اتفاق سے نواب کی آنکھ پھر اُسی وقت کھلی اور آج اُنہوں نے پھر وہی سوال دہلی والی خاتون سے پوچھا تو انہوں نے بھی وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا اور کہا کہ صبح ہونے والی ہے۔ تو آپ نے پوچھا کہ "تمہیں کیسے معلوم ہوا" تو بولی کہ "میرے گجرے کے پھول مرجھا گئے ہیں"

تیسرے دن لکھنؤ والی بیگم کی باری آئی۔ وہی وقت تھا اور وہی سوال۔ جب بیگم نے بھی وقت کا اندازہ صحیح کیا تو نواب نے کہا کہ "اندھیرا تو کافی ہے تم کیسے کہتی ہو کہ تڑکا ہونے والا ہے" وہ بولی کہ "میرے مُنہ کی گلوری کا ذائقہ پھیکا پڑ گیا ہے۔"

چوتھی رات کو اسی وقت وہی سوال و جواب پنجابی بیوی کے ساتھ ہوئے تو وہ بے ساختہ بول اُٹھیں کہ "ٹڈ گڑگڑا وندا ہے" مطلب سمجھانے کے لئے کہاوت اچھی معلوم ہوئی اس لئے دھرا دی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر پنجابی کلچر سے بیگانہ اور ہر دہلی و لکھنؤ والا کلچر کی تصویر ہوتا ہے۔

سو پچاس برس پہلے قوم دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک دولتمند دوسرے بے زر۔ ایک آقا۔ دوسرے غلام۔ ایک شریف دوسرے رذیل۔ پہلے طبقے میں نواب، راجا، رئیس، افسر اور حاکم شامل تھے دوسرے میں کسان، مزدور اور نوکر چاکر۔ جیسا کہ ساری دنیا میں سدا سے ہوتا آیا ہے۔ کلچر نے دولت اور شرافت کے سایہ میں نشو و نما پائی

تھی۔ فاقہ مستوں کی گرہ میں نہ دام تھے نہ ایسے ذریعے اور موقعے کہ کلچر کو اپناتے۔ ان کو پیٹ پالنا ہی مشکل تھا کلچر کہاں سے لاتے۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ کلچر کے دوران گفتگو میں رئیسوں اور شریفوں کا ہی ذکر آئے گا۔

پہلے زمانہ میں رہنے سہنے کا دستور یہ تھا کہ بڑے بڑے رئیس اور شریف بھی شہر کی گنجان آبادی ہی میں اپنی حویلیاں اور محلسرائیں بنواتے اور ان میں رہتے تھے۔ یہ حویلیاں اور محل سرائیں عام طور پر تنگ و تاریک کوچوں اور گندی گلیوں میں ہی واقع ہوتی تھیں۔ مردانے حصے میں دیوان خانے اور نشست گاہیں ہوتی تھیں۔ ان کو صفائی اور تکلف سے سجایا جاتا تھا۔ امارت کے سب ہی چونچلے دکھائی دیتے تھے۔ گو ضرورت اور آرام کا خیال آرائش کے سامنے کم رکھا جاتا تھا۔ گھر کا اسباب۔ کوڑا کرکٹ۔ چولہوں کی راکھ۔ جھاڑو کی تنکیاں۔ پانوں کی پیکیں۔ ترکاری اور پھلوں کے چھلکے اور گٹھلیاں کپڑوں کی کترنیں اور کائی چڑھی ہوئی پانی کی گولیں اور صراحیاں یہ سب غیروں کی نظر سے اوجھل زنان خانوں میں رہتی تھیں۔ پردہ شرافت کا پہلا لوازمہ تھا۔ بیویاں، بہوئیں اور بہنیں روپے پیسے اور دوسری ملکیت کی طرح نہایت حفاظت سے رکھی جاتی تھیں۔ پردہ نہ صرف غیروں سے بلکہ اپنوں سے بھی ہوتا تھا۔ مکانوں کی بناوٹ میں ایسا انتظام رکھا جاتا تھا کہ سورج اور تازی ہوا بھی تاک جھانک نہ کر سکے گھر کی بیویوں کو چھتوں پر جب ہی دھوپ اور ہوا دی جاتی تھی کہ جب پڑوس کے مرد پہلے سے پردے میں ہو جاتے تھے۔ پچاس برس سے

کایا پلٹ کر دی ۔ اب اکثر شریف اور رئیس آبادی سے دور بنگلوں
اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ سورج کی روشنی اور تازی ہوا کا ہر
جگہ سب سے پہلے انتظام کیا جاتا ہے۔ احاطے میں سبزہ اور چمن ضرور
ہوتا ہے صفائی اور ستھرائی کا خیال چپے چپے پر رکھا جاتا ہے ضرورت
اور آرام کی چیزوں کو محض آرائش پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جب پردہ
اُٹھ گیا تو مردانہ اور زنانہ کا بھی فرق نہ رہا۔ بیویاں اب گھر کی ملکیت
کے بجائے مالک ہوتی ہیں اور آزادی کی ہوا میں اُڑتی ہیں ۔ پہلے
بیویاں اور بیٹیاں گلبدن، شربتی اور آب رواں زیب تن کرتیں،
سُرمہ، مسی، مہندی، رحلی، بندی اور کنگھی چوٹی سے سنورتیں اور
کمخاب اور زربفت میں بنت، گوکھرو، لچکا اور کرن سے زیب پیکر
طرح طرح کے زیوروں سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی دُلھنیں بنتی اور
بنائی جاتی تھیں ۔ اب چاند بن گہنے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ سُرمہ مسی اور
بندی کی جگہ اب پوڈر۔ روز اور لپ اسٹک نے لے لی ہے۔ کمخاب
زربفت۔ شربتی اور آب رواں کی بجائے جیور جٹ۔ کریپ ڈی شین
اور شیفون کا فیشن ہے۔ سجنے اور سنور کی جگہ سادگی اور صفائی کا
خیال ہے۔ حُسن خداداد اور جمال عریانی کا نظارہ عام ہوتا ہے اس
پر یہ سادگی کہ جیور جٹ۔ کریپ ڈی شین اور شیفون کی ساڑیاں
زیب تن کر کے یقین دلایا جاتا ہے کہ نمائش منظور نہیں۔ مردوں کے
لباس میں بھی بڑا فرق ہو گیا ہے۔ پہلے شوقین مزاج نوجوان ادھی
کے کُرتوں پر جامدانی اور چکن کے انگرکھے پہن کر اور سر پر دو پلی ٹوپی
لگا کر بازاروں میں اپنی جسم و جوانی کی نمائش کرتے تھے۔ اب ہم

اپنی جسمانی کمزوریوں کو فیلٹ ہیٹ اور عینک سے چھپانے اور بدن کے بھونڈے پن کو قیمتی ولایتی سوٹوں (Suits) کی مدد سے سڈول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کا دستور بھی اب سے بہت مختلف تھا بچے انا اور کھلائی کی گود میں پرورش پاتے تھے۔ نظر بد سے بچانے کے لئے ان کا حویلیوں سے باہر نکالنا منع تھا۔ مکتب میں کریما، خالق باری اور آمدنامہ سے درس شروع ہوتا اور گلستاں، بوستاں، رقعات عالمگیری۔ جامی، نظامی، فردوسی، عرفی، قاآنی اور حافظ شیرازی پر ختم ہو جاتا۔ خال خال ریاضی اور فلسفہ کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ بچوں کا کھیل کود گلی ڈنڈے سے شروع ہوتا۔ عمر کے ساتھ ساتھ کنکوے بازی کی مشق بھی بڑھتی بعد میں چوسر، گنجفہ، اور سنجیدہ طبیعتیں شطرنج سے بھی شغل کرتی تھیں۔ جن میں جوانی کی اُمنگ ہوتی وہ پھری گتکا، لکڑی اور بنوٹ چلانا بھی سیکھتے۔ مجہول اور کاہل کبوتر بازی، مرغ بازی اور بٹیر بازی میں نام پیدا کرتے۔ لکھنؤ کے بھولے نواب اور پیارے صف شکن بٹیر کی واردات اب تک سرشار کے قلم سے یادگار ہے۔ نئی روشنی کا چمتکار دیکھو پچاس ساٹھ برس نے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا۔ انگریزی تعلیم کا بول بالا رہے۔ اب ہر اسکول کا لڑکا اتنی انگریزی، حساب، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ بلکہ سائنس بھی جانتا ہے کہ اگر آج اُس کے پردادا زندہ ہوں تو اُن کو پڑھا سکتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ اسکول اور یونیورسٹی کے یونین اور پارلیمنٹ میں تحریر و تقریر کرنے کی مشق ہوتی

ہے۔ سیاسیات کا مطالعہ اور اُن سے دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔
اخباروں کے پڑھنے کا شوق لڑکوں کو تمام دنیا کے حالات سے
باخبر رکھتا ہے۔ کرکٹ۔ ٹینس۔ ہاکی اور فٹ بال غرضکہ تمام کھیل کود
بھی ایسے ہیں کہ جن سے نہ صرف جسم بنتا اور صحت اچھی رہتی ہے بلکہ
برابر والوں سے مل جُل کر کام کرنے کی عادت پڑتی اور زندگی میں
کچھ کرکے دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ پُرانے زمانہ میں جب شریف
گھرانوں کے نوجوان اگر لکھنؤ سے کانپور بھی جاتے تو امام ضامن کا
روپیہ بازو پر باندھا جاتا۔ نہ معلوم کتنی منتیں مانی جاتیں اور بڑی
بوڑھیوں کی زبانیں دعائیں دیتے دیتے تھک جاتیں۔ اب قوم کے لڑکے
ہی نہیں بلکہ لڑکیاں بھی ولایت تک منزل سر کر آتی ہیں اور کسی کو کانوں
کان خبر نہیں ہوتی۔

اگلے وقتوں میں مولوی صاحب کو کلچر سے کچھ ایسا خلقی اور
دلی بغض ہوتا تھا کہ شریف اور رئیس گھرانوں کے نونہال آدابِ
مجلس سیکھنے، اندازِ گفتگو کا سلیقہ حاصل کرنے اور شعر و سخن کا مذاق
پیدا کرنے کے لئے اونچے درجہ کی طوائفوں کے کوٹھوں پر اس لئے
بھیجے جاتے تھے کہ فیضِ صحبت اُٹھائیں۔ اب ہمارے یہاں کے
نوجوان بچپنے میں گورنیس کی نگرانی میں، لڑکپن میں یونیورسٹی کی
فضاؤں اور ہوش سنبھالنے پر ڈنر ٹیبل اور ڈرائنگ روم کی صحبتوں
میں کلچر کا درس لیتے ہیں اور جو صاحب توفیق ہوتے ہیں وہ ان
ہونہاروں کو غیر ولایتوں تک اس لئے بھیجتے ہیں کہ لندن کی سوسائٹی
اور پیرس کے سیلونز (Salons) میں مزید جلا اور

پاس ہو کر آئیں۔

زبان ادب اور کلچر کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے دو چار باتیں اس کے بارے میں بھی کہنی ہیں۔ سرحدی حصوں کو چھوڑ کر تمام شمالی ہندوستان میں سو برس سے اردو ہی ہماری زبان ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اس کی ٹکسالیں ہیں۔ ہماری نثر اردوئے معلّٰی کی کسوٹی پر کسی جاتی ہے اور بات چیت اور بول چال میں وہی محاورے زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں جو دہلی لکھنؤ کے شریف گھرانوں کی روزمرہ تھے اور جن کا لطف آپ اب تک فسانۂ آزاد اور اودھ پنچ کی جلدوں میں اُٹھاتے ہیں۔ تقریباً ایک نسل سے اب ہندوؤں میں ہندی کا چرچا زیادہ ہو رہا ہے لیکن میں نے مالوی جی مہاراج کو جن سے زیادہ ہندی کا پریمی اور کوئی نہیں ہو سکتا لکھنؤ، دہلی اور آگرے میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ بارہا شین قاف سے درست ایسی سلیس اُردو میں تقریریں کرتے سُنا اور بات چیت کرتے دیکھا ہے کہ جس پر کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر انقلاب زمانہ کی زد سے کوئی چیز بچتی نہیں۔ اب ہماری زبان پر بھی نزلہ گر رہا ہے فرمائش ہے بلکہ تاکید ہے کہ ہماری زبان اردو یا ہندی نہیں بلکہ ہندوستانی ہونی چاہئے کہنے کو تو ہندستانی سے وہ زبان مراد ہے کہ جس میں سے فارسی اور سنسکرت کے لفظ چھانٹ چھانٹ کر نکال دیئے جائیں تاکہ ہر شخص اسے سمجھ سکے۔ لیکن مثالیں جو ہندستانی زبان کی پیش کی جاتی ہیں ان کا ڈھانچہ ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ خیالات اور محاورے انگریزی کے۔ ترکیبیں فارسی کے استعارے اور

تشبیہیں سنسکرت کی۔ اگر مبتدا اردو میں تو خبر انگریزی میں اور جن کے سمجھنے والے صرف ہماری یونیورسٹیوں کے نوجوان کہ جو انگریزی کی تعلیم پاتے اور اُردو ہندی دونوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں دراصل مطلب یہ ہے کہ اب ہماری زبان یکّہ اور تانگہ والوں اور ٹھیلے والوں کی زبان ہونی چاہئے جس کو بازاروں اور گاؤں میں ہر شخص سمجھ سکے اور بات پتے کی ہے۔ اب جمہوریت کا دور ہے۔ مزدور، کسان اور نوکر چاکر اب ہمارے غلام نہیں بلکہ آقا ہیں کیونکہ ان ہی کے ووٹ پر ہماری حکومت کی بنا پڑ رہی ہے جب تک ہم ان کو اپنا کر راضی نہیں کر لیتے حکومت پر ہمارا قبضہ نہیں جم سکتا اور ان کو اپنا بنانے اور راضی کرنے کی کنجی کھادی، گاندھی کیپ اور ہندستانی[۱] زبان ہے۔

شعر وسخن کا مذاق۔ مشاعرے، مرثیہ گوئی و سوزخوانی کی مجلسیں بھی پُرانے کلچر کا جزو تھیں۔ ان صحبتوں کا لطف بھی بھلا دینے کی چیز نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گرمیوں[۲] کے دنوں میں چاندنی رات میں کسی شریف رئیس کی محل سرا کی مہتابی پر دری کا فرش ہوا اُس پر اُجلی چاندنی بچھائی گئی۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کر منڈیر پر چنوا دی گئیں ان پر بالو کے آبخورے ڈھک دئے گئے۔ کاغذی ہنڈیوں میں پانوں کی گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئیں۔ ڈیڑھ خمے حقّوں کے نیچوں میں پانی چھڑک کر ہار لپیٹ دئے گئے چاندنی رات میں زیادہ روشنی کے انتظام کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

---

[۱] راقم الحروف کی رائے پچھلے دس سالوں میں ہندی اردو اور ہندستانی کے مسئلہ پر قطعی بدل گئی ہے۔ [۲] امراؤ جان ادا

صرف ایک کنول روشن کر دیا جاتا تھا۔ شعرا اور احباب جمع ہوتے تھے۔ پہلے شیرا ور فالودے کے پیالے کا دور چلتا۔ پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگتا۔ احباب اپنی اپنی غزلیں پڑھتے۔ داد دل کھول کر دی جاتی بلکہ تعریفوں کے پُل باندھ دئے جاتے۔ رقیبوں میں چوٹیں بھی ہوتیں لیکن ان میں بھی ایک ادا اور شعور ہوتا تھا۔ اب بھی مشاعرے ہوتے ہیں بلکہ کثرت سے ہوتے ہیں۔ کسی ہال میں میز کرسی کی نشست ہوتی ہے۔ خلقت کا اژدحام ہوتا ہے۔ بجلی کی روشنی ہوتی اور پنکھے چلتے ہیں۔ طرح کی غزلیں اب بھی پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن گل و بلبل، خنجر و قاتل اور ساغر و مینا کے فرسودہ مضامین کے علاوہ ہمارا شاعر اب کائنات قدرت کے مظاہروں اور دُکھیا قوم کے درد بھرے ارمانوں پر بھی نظر ڈالتا اور سُننے والوں کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ خلقت خوش ہوتی ہے تو تالیاں بجاتی ہے۔ خفا ہوتی ہے تو جوتوں کے تلے رگڑنے لگتی ہے۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا رنگ جب سے دولھا صاحب اس دنیا سے سدھارے اب بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ گویا خاندان انیس کے اس چراغ کے گُل ہوتے ہی اب مرثیہ خوانی کی مجلس بھی سونی ہوگئی۔ سوز اب بھی محرم کے دنوں میں ریڈیو میں سننے میں آتے ہیں۔

تفریح اور عیش و عشرت کے سامانوں کی نہ پہلے کمی تھی نہ اب ہے۔ پہلے زمانہ میں رقص و سرود کی محفلیں بڑے تکلف سے آراستہ کی جاتی تھیں۔ شائقین جمع ہو جاتے تھے اچھی اچھی گانے والیاں اور گویئے ساز کے ساتھ وقت کی چیزیں چھیڑ کر ترت کرکے مختلف

راگ راگنیوں کے سروپ آپ کے سامنے اُبھارتے اور اپنے کمال سے سماں باندھ دیتے تھے۔ نازک سے نازک حسیات وجذبات اُبھارے جاتے اور ایک کیفیت پیدا کی جاتی تھی۔ اب بال روم (Ball Room) اور کیفے (Cafe) میں جیز (Jazz) کے ساتھ فوکس ٹروٹ (Foxtrot) اور کبیرے ڈانسز (Cabaret Dances) ہوتے ہیں۔ دلوں میں ٹھیس لگتی ہو یا نہ لگتی ہو قدر داں آپ کو بتائیں گے کہ خاصی اچھی ورزش ہو جاتی ہے۔ مجرے بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ خلوت کی صحبتیں ہوتی تھیں اب ان کی جگہ ڈرائنگ روم کے ریڈیو نے لے لی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ تفریح کی تفریح اور منچلے نوجوانوں کا سازندوں اور طوائفوں کی صحبت میں بگڑنے کا اندیشہ نہیں پھر کام کاج سے تھکے ماندے شام کو گھر آئے۔ بیوی بچے پاس بیٹھے ہیں۔ چائے ہو رہی ہے۔ ادھر برج کا شغل شروع ہوا۔ اُدھر ریڈیو کھلا۔ دیہاتی پروگرام۔ خبریں۔ ٹاک اور گانے سب ہی سامانِ تفریح موجود ہیں اور پھر لطف یہ کہ کچھ وقت کی بھی قید نہیں۔ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی گیت میں بھیرویں، پیلو، کھماج اور سوہنی سب کا لطف اُٹھائیے اور سنیما کے تو کیا کہنے ہیں۔ آرٹ اور سائنس کا ایسا معجزہ ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ گو بالعموم ہندوستانی فلم نے ابھی تک ہنٹر والی، چشمے والی، طوفان میل اور زندہ ناچ گانے سے زیادہ آگے قدم نہیں بڑھایا ہے۔

غرضکہ نئے اور پرانے کلچر کی داستان طولانی اور وقت

تنگ ہے۔ مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ فی زمانہ جو کلچر رواج پا رہا
ہے وہ نیا تو ضرور ہے مگر ہمارا نہیں۔ پرانا کلچر تو بہت جلد نقار خانہ
میں طوطی کی آواز ہو کر رہ جائے گا لیکن نئے کلچر کو ہمیں اپنا بنانے
میں کتنا وقت ابھی لگے گا۔ اور اس گنگا جمنی کلچر کا آگے چل کر کیا اور
کیسا رنگ روپ نکلے گا۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ البتہ یہ صاف نظر آتا
ہے کہ پرانے کلچر کی بنا آرٹ پر پڑی تھی اور ہمارے حسیات و جذبات
سے اس کا خمیر گوندھا گیا تھا۔ نیا کلچر سائنس کے سہارے کھڑا ہو رہا
ہے اور اس کی تہ میں ہماری ضرورتیں کام کرتی ہیں۔ اب تک کلچر
نے دولت و شرافت کے سایہ میں نشو و نما پائی تھی۔ اب یہ غریب
کے گودڑ اور خلق خدا کے ہنگاموں میں پناہ مانگے گا۔
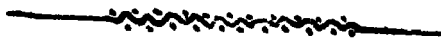
لکھنؤ کا ایک لطیفہ

اکبر اور بیربل کے لطیفے تو زبان زد خاص و عام ہیں۔ ویسے بھی آپ نے اچھے سے لطیفے سُنے ہوں گے تاہم کچھ مضائقہ نہیں جو لکھنؤ کا بھی ایک لطیفہ سنیں۔ لکھنؤ بھی خدا اُس کو سلامت رکھے عجیب و غریب شہر ہے۔ بگڑ بگڑ کر سنورتا ہے۔ اس کی رعنائیاں دلربائیاں نت نئے شیدائی پیدا کرتی ہیں۔ پر جہاں ایسے قدردانوں کی کمی نہیں وہیں رقیبوں سے بھی مفر نہیں۔ بہت دن نہیں ہوئے کہ ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور دلّی میں رقابت تھی۔ آئے دن دلّی والے لکھنؤ والوں پر چوٹیں کیا کرتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کی بزم ادب میں بس یہی ایک چرچا رہتا تھا۔ خوب گرما گرمی ہوتی تھی۔ ذرا سی بات پر صفحے کے صفحے سیاہ کئے جاتے تھے۔ لیکن اب تو نہ 'داغ' ہیں نہ 'امیر'، نہ اُن کے ہوا خواہ و قدرداں۔ نہ مشاعروں کی وہ گرما گرمی۔ خدا مغفرت کرے سجّاد حسین مرحوم کی، اُن کے ساتھ اودھ پنچ کا شباب بھی بیت گیا۔ ایک دولھا صاحب کا دم غنیمت تھا کل کی بات ہے کہ لوگ سال سال بھر تک اس دن کا انتظار کرتے تھے اور دور دور سے چلے آتے تھے کہ 'انیس' کے اس نام لیوا کو مجلس کے منبر پر بیٹھا دیکھ لیں اور اس کا مرثیہ سُن لیں۔ لیکن ـ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ شاعری کا چرچا کم ہوگیا یا لکھنؤ سے مرثیہ خوانی اُٹھ گئی، چشم بد دور اب بھی اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں۔ لیکن بقول جناب ظریف کے اب تو خوش الحانی کی داد چاہی جاتی ہے، شاعری کہاں! مشاعروں کی بھی کمی نہیں۔ آئے دن ہر قصبے اور ہر ہوسٹل میں ہوتے رہتے ہیں لیکن جا کر دیکھئے تو وہ طوفان بدتمیزی کہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ نہیں کوئی سوراجیوں کا مظاہرہ عام ہے۔

غرض کہنے کی یہ ہے کہ نہ وہ لوگ رہے نہ وہ زمانہ رہا۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!

پھر بھی نہ لکھنؤ کی رونق میں کمی ہے نہ اس کے رقیب ناپید ہیں۔ پہلے لکھنؤ اور دلّی کا چرچا رہتا تھا اب لکھنؤ اور الہ آباد کا جھگڑا ہے پہلے بزم ادب میں معرکے ہوتے تھے اب بساط سیاست پہ چالیں چلی جاتی ہیں اور الہ آباد کے پہلوان خم ٹھوک ٹھوک کر اکھاڑے میں اُترتے ہیں۔ لکھنؤ غریب اب بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ صاحب آخر یہ لگی بعض کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ راجدھانی تو الہ آباد ہے مگر سرکار کی نگاہ تلطف جب دیکھو تب لکھنؤ پر رہتی ہے۔ ہر فرمائش پوری کی جاتی ہے۔ ساری دولت و خزانہ اس کی آرائش پر لٹایا جاتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ اپنوں سے بیر غیروں سے ناتا۔ ہم سے جیتے جی یہ رنڈاپا نہیں سہا جاتا۔ مانا کہ الہ آباد راجدھانی کہلاتا ہے پر نوشتۂ تقدیر تو نہیں کہ مٹایا بھی نہ جا سکے ارے صاحب یہ تو بڑی پرانی مثل ہے کہ جو پیا من بھائے سوہی سہاگن

کہلائیے۔ کوئی بات تو لکھنؤ میں ہوگی جو پیا من بھاتا ہے۔ لاکھ سیرت اچھی سہی پر صورت بھی تو کوئی چیز ہے۔ چہرہ پر نمکینی ہو جسے چھب کہتے ہیں۔ اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا سلیقہ ہو۔ گفتگو میں انداز دلربائی ہو تو لاکھ آپ متقی و پرہیزگار ہوں نظر ایک دفعہ اُٹھ ہی جاتی ہے۔ پھر دنیا میں سب متقی و پرہیزگار ہی تو نہیں ہوتے طبیعتیں شوقین مزاج و طرح دار بھی ہوتی ہیں۔ اللہ لگتی کہئے گا۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں کتنے ہیں کہ جو چاہے کالی ہو، بھدی ہو، بھونڈی ہو، لیکن محض بیوی ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور کبھی کسی اچھی صورت پر نظر اٹھا کر نہیں ڈالتے راجا ہو یا پرجا، خاصۃً انسانیت سے تو کوئی خارج نہیں۔ کارپردازانِ حکومت بھی تو آخر انسان ہی ہیں کوئی فرشتہ تو نہیں۔ پھر اگر لکھنؤ کی رعنائیاں اور دلربائیاں ان کو اپنا شیدائی بناتی ہیں اور اس کا جذب اُنہیں اپنی طرف کھینچتا ہے تو یہ کونسا الزام ہے۔ لوگ کہتے ہیں، میں نہیں کہتا، کہ الہ آباد میں سوائے امرود، کھپریل اور پراگ والوں کے دھرا کیا ہے؟ ایک حضرت اکبرؔ تھے سو خدا بخشے وہ بھی اب نہ رہے۔ پھر الہ آباد کو اکبرؔ پر ناز بے جا ہے وہ تو اودھ پنچ کے نو رتنوں میں سے ایک انمول رتن تھے ان کو الہ آباد سے کیا واسطہ۔ یہ صحیح ہے کہ الہ آباد اقلیم سیاست و صحافت کا بادشاہ ہے، اور بالعموم اخباروں اور رسالوں کو لکھنؤ کی آب و ہوا موافق نہیں آتی، اسی لئے تو حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے "کلیم" کے لئے پنجاب کی قربت میں دہلی کا آشیانہ ڈھونڈھ نکالا۔ لیکن جب ایسا ہے تو پھر آخر آپ نے اس غریب 'پایونیر' کو بڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے

اور دم توڑنے کے لئے لکھنؤ کیوں بھیج دیا؟ لاکھوں روپیہ مریض کی تیمار داری پر صرف کیا جا رہا ہے پر بوسیدہ ہڈیوں میں کوئی جوانی کی روح کیسے پھونک دے؟

مذاق کی تو بات ہی دوسری ہے۔ پر سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ لکھنؤ ہی ہے۔ لاکھ اُجڑ گیا۔ بگڑ گیا۔ پھر بھی شہر ہے مٹی مٹائی عظمت و تہذیب کی انمول نشانی ہے۔ شائستگی اور شرافت کا گھر ہے۔ اودھ کی سرزمین اور لکھنؤ بھی وہ مردم خیز خطّہ ہے کہ علم و ادب کی مجلس میں وہ وہ نامور پیدا کئے کہ جنھوں نے اپنا سکّہ زمانہ پر بٹھا کر چھوڑا۔ انشا و سودا۔ آتش و ناسخ۔ انیس و دبیر۔ نسیم و میر حسن نواب مرزا شوق اور رجب علی بیگ، سرورؔ کا نام کون نہیں جانتا خیر یہ تو پُرانی داستانیں ہیں لیکن سرشار کو گزرے ہوئے تو بہت دن نہیں ہوئے۔ اُردو میں فن فسانہ نگاری کا موجد تھا۔ مٹے مٹائے لکھنؤ کی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی وہ وہ تصویریں اپنے قلم سے کھینچ گیا ہے کہ دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں۔ جب تک ہندستان میں اردو کے قدردان اور پڑھنے والے موجود ہیں فسانۂ آزاد کے 'خوجی' کو بھول نہیں سکتے۔ وہ دم بدم ان سے ٹھٹول کرے گا اور ان کو ہنساتا رہے گا۔ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اُردو والے ہوں یا ہندی والے۔ اس میں عورت و مرد کی تخصیص نہیں۔ گلزار نسیم کس نے نہیں پڑھی۔ گل بکاؤلی کا تماشہ کس نے نہیں دیکھا۔ بیسوں شعر ضرب المثل ہوگئے اور سیکڑوں زبان زد خاص و عام ہیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا نام کس نے نہیں سنا آج بھی پڑھنے

والے کلیجہ تھام کے رہ جاتے ہیں ۔ لندن پنچ کی تتبع میں نہ معلوم ہندستان
میں بھی پنچانہ رنگ کے کتنے ہی اخبار نکلے ہندی پنچ ، بمبئی پنچ وغیرہ
وغیرہ ، لیکن اودھ پنچ کا سا شباب کسی کو نصیب نہ ہوا۔ اس گلشن
ظرافت کے پھول نہ مرجھاتے ہیں نہ باسی ہوتے ہیں۔ ویسے کے ویسے
بکھرے پڑے ہیں۔ جب جی چاہے چُن کر اور بین کر گلدستہ بنا لیجئے۔ اس
چمن کی تختہ بندی اور آبیاری اُن نکتہ رس اور بذلہ سنج زندہ دل
طبیعتوں نے کی تھی جن کی ظرافت ، زندہ دلی ، طنز و تمسخر اور بذلہ سنجی
کی ڈھاک اور سکہ ہر کہ و مہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو بر رو آیا اُسی نے مُنہ
کی کھائی۔ مرزا سجاد حسین ، مچھو بیگ ستم ظریف۔ تربھون ناتھ ہجر۔
اکبر حسین اکبر۔ جوالا پرشاد برق۔ نواب سید محمد آزاد۔ محمد علی
کسمنڈوی وغیرہ اودھ پنچ کے وہ نورتن تھے کہ جن کا نام دنیائے
صحافت میں خدائے سخن کا مرتبہ رکھتا ہے۔ دولھا صاحب دیکھنے
میں تو دُبلے پتلے ، کمزور اور بوڑھے آدمی تھے۔ گردن ہمیشہ مراقبہ
میں رہتی تھی مگر طبیعت میں دریائے سخن موجزن رہتا تھا۔ مضامین
تھے کہ اُمنڈتے چلے آتے تھے۔ مرثیہ گوئی کا جوہر انیس سے ورثہ
میں ملا تھا۔ مرثیہ خوانی کا کمال خداداد تھا۔ جس وقت منبر پر بیٹھتے
اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں بند پڑھتے تو رن کا نقشہ آنکھوں
کے سامنے کھنچ جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دراصل کوئی بشر سوار
شمشیر بے نیام کر رہا ہے۔ خدا جانے اس وقت ان بوسیدہ ہڈیوں
میں کس بلا کی طاقت آ کہاں سے آ جاتی تھی۔ بات یہ تھی کہ صاحب
کمال تھے۔ اگر یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو چار دانگ عالم میں

ان کے نام کا ڈنکا بجتا۔ شاہی درباروں میں قدر و منزلت ہوتی۔
ہر اخبار و رسالے میں تصویریں چھپتیں اور نہ معلوم کتنی یادگاریں
اب تک قائم ہو گئی ہوتیں۔ لیکن اس بد نصیب ملک کے ماہران فن
و صاحبانِ کمال کے یادگاروں کی کس مپرسی کی حالت تو اس شعر کی
مصداق ہے کہ ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے ۔۔۔ نے پر پروانہ سوزو نے صدائے بلبلے

علم و ادب و صحافت، شاعری، موسیقی، دستکاریوں کی
صنعتیں، خورو نوش کے تکلفات ہر تہذیب و تمدن کی جان ہوا
کرتے ہیں۔ قوموں کی شائستگی و شرافت کا پتہ انہیں باتوں سے چلتا
ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اس مٹی مٹائی حالت میں بھی لکھنؤ شرافت و
شائستگی کا گھر ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا مرکز ہے۔ علم و ادب
و صحافت سے قطع نظر نغمہ و سرود تو لکھنؤ کے رگ و ریشہ میں پیوست
ہے۔ گو زمانہ کے انقلاب نے اب یہاں کی رقص و سرود کی محفلوں
کا رنگ ماند کر دیا ہے۔ 'سینما' اور 'ڈانس' کی اُچھل کود کے آگے
انہیں کون پوچھتا ہے۔ مگر بہت دن نہیں گزرے کہ لوگ کالکا کا
ناچ اور بندہ دین کی ٹھمریاں اور ہولیاں دور دور سے سننے آتے
تھے۔ فی زمانہ کھادی اور چرخے کی دھوم ہے۔ دستکاریوں کی نمائش
آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ نئے نئے قسم کے چرخوں اور کھرگوں کی ایجاد
کے لئے سینکڑوں روپیے کے انعام دئے جاتے ہیں۔ ہاتھ کا بنا ہوا
معمولی دیسی کپڑا عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ اگر آنکھیں ہیں اور قدر
کرنا جانتے ہو تو لکھنؤ کی چکن اور ٹانڈے کی جامدانی منگا کر دیکھو کہ دستکاری

کی صنعت و معجزہ کسے کہتے ہیں۔ اس جامدانی کو ہاتھ میں لیتے ہی بخدا طبیعت بے ساختہ چاہتی ہے کہ بننے والے کے ہاتھ چوم لے۔ مٹی کے کھلونے ہر قصبے و شہر میں بنتے ہیں مگر یہ بات صرف لکھنؤ کے ہی کھلونوں میں ہے کہ صرف جان ڈالنے کی کسر معلوم ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے مطعون کرنے والے تو بہت ہیں لیکن فصل پر ملیح آبادی سپیدے اور لکھنؤ کے دسہری کے پارسل کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے۔ زردہ اور قوام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لئے پھر لکھنؤ ہی لکھنا پڑتا ہے۔ لکھنؤ پہنچتے ہی بیگماتی گلوریوں کی فرمائش ہوتی ہے۔ ککڑی کی کیا حقیقت ہے۔ ایسی کوئی کھانے کی چیز بھی نہیں، لیکن جہاں "لیلیٰ کی اُنگلیاں ہیں اور مجنوں کی پسلیاں ہیں" کی صدا کانوں میں آئی بے اختیار طبیعت للچاتی ہے اور خدمت گار کو حکم ہوتا ہے کہ دو پیسے کی لے آنا۔ ایک کیا سینکڑوں باتیں ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ شبہ نہیں کہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن شرافت و شائستگی کے تکلفات کی ان ہی چھوٹی باتوں سے ہر قوم کے تہذیب و تمدن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جنہیں آپ فی زمانہ مروجہ زبان میں کلچر (Culture) کہتے ہیں۔ مگر اسے کیا کیجئے کہ ہمارے میدان سیاست کے سورما اور سوربیر اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن بھی شائستگی کے نام کا اہل ہے۔ اُنہوں نے اس سے زیادہ پڑھا اور سمجھا ہی نہیں کہ ہندو تہذیب کا ماحصل "چوٹیا و دھوتیا" اور اسلامی تہذیب کا لب لباب "گھٹنا اور بدھنا" اُن کے آگے اس دُکھڑے کا بیان اسی ہندی مثل کا مصداق ہے کہ اندھے کے آگے روئے اور اپنے

نین کھوے"

آپ کہیں گے کہ دعوت دی تھی لطیفہ سُننے کی اور لگایا یہ دُکھڑا
رونے۔ سو یہ بکواس بھی بالکل بے محل نہ تھی۔ اس تمہید کی ضرورت اس
لئے پڑی کہ آپ لطیفے کا پورا لطف اُٹھا سکیں۔ اچھا تو سُنئے۔ مگر ہاں
ایک بات کہنی بھول گیا اور وہ بہت ضروری ہے یعنی یہ کہ جو کچھ
میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں وہ الٰہ آباد والوں کو بُرا نہ لگے۔ یہ فقیر تو
اکبر آباد مرحوم کے اجڑے دیار کا رمتا جوگی ہے۔ اسے نہ لکھنو کی پچ
نہ الٰہ آباد سے کد نہ دلّی سے واسطہ۔ صرف اتنا جانتا ہے کہ ستیہ
(سچ) کا بول بالا رہے۔

اچھا لطیفہ سُنئے۔ سُنی ہوئی بات ہے، آنکھوں کی دیکھی نہیں۔
اس لئے عذاب دروغ برگردنِ راوی۔ کوئی چار پانچ برس کی بات
ہے کہ ہنگامۂ انقلاب برپا تھا۔ ملک میں چاروں طرف سے سوائے
'مہاتما کی جے'، کے کوئی آواز کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی۔ لکھنؤ میں
بھی جوش کافی تھا۔ مرد تو مرد عورتیں بھی اور اچھے اچھے گھرانوں کی
عورتیں بے نقاب ہو کر میدان کارِ زار میں نکل آئی تھیں۔ عورتوں کی
ہمت اور بہادری کا ہر طرف چرچا تھا۔ لوگ ان کی ہستی اور حقوق
کے قائل ہو گئے تھے۔ اسی زمانہ میں میونسپلٹی کا الکشن ہونے والا
تھا۔ سوراجیوں نے تو اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن اور ممبری کے
امیدواروں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ چوک وارڈ سے ایک ڈاکٹر صاحب
ممبری کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا خاندان لکھنو کے پرانے
خاندانوں میں تھا۔ پھر اپنے کام میں ہوشیار تھے۔ لوگوں کو ان کی

ذات پر بھروسہ تھا۔ ان کے حامیوں اور مددگاروں کی کمی نہ تھی۔ یقین تھا کہ ممبر ہو جائیں گے۔ پر کوئی شخص کیسا ہی ہر دل عزیز کیوں نہ ہو خار کھانے والے اور مخالف ہر شخص کے ہوتے ہیں کسی صاحب کو ان سے کد تھی۔ ہرانا اور جتانا تو ان کے بس کی بات تھی نہیں پر ڈاکٹر صاحب کو تنگ کرنے کی انہوں نے ٹھانی تھی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے اور بڑے دل لگی باز تھے۔ اور وثیقہ سلامت رہے دل لگی بازوں اور بے فکروں کی اب بھی لکھنؤ میں کمی نہیں۔ اُنہوں نے ایک بی صاحبہ کو اُبھارا کہ ممبری کے لئے کھڑی ہو جائیں اور ڈاکٹر صاحب کا مقابلہ کریں۔ بی صاحبہ لکھنؤ کی مشہور گانے والیوں میں تھیں ان کے بھی ہوا خواہوں اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی۔ میراثی اور سازندے دوڑ دھوپ کے لئے حاضر تھے۔ نئے بگڑے ہوئے تماشبین اور سیٹھ ساہوکار روپیہ خرچنے کو تیار تھے۔ چوک کی عام طوائفیں بے فکرے وثیقہ دار اور دل لگی باز ووٹ دینے کو موجود تھے۔ بی صاحبہ کو بھی اچھی دل لگی ہاتھ آئی۔ دل لگی کی دل لگی اور مشغلہ کا مشغلہ۔ کھڑی ہو گئیں۔ نئی نئی بات تھی۔ گھر گھر یہی چرچا تھا اور شہر بھر میں اس کی دھوم۔ ڈاکٹر صاحب بھی گھبرائے کہ عجب لغویت کا سامنا ہے، اگر ایک طوائف کے مقابلے میں جیتے تو کون سی سرخروئی اور ہارے تو ذلت ہی ذلت۔ پھر یارانِ طریقت کی فقرے بازی مزید براں۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر بی صاحبہ کو پیغام بھیجا کہ پانچسو روپے لے لیں اور بیٹھ جائیں۔ کسی طرح پنڈ تو چھوٹے بی صاحبہ بڑی ستم ظریف تھیں، اُنہوں نے جواب میں کہلا بھجوایا کہ ڈاکٹر صاحب تو بڑے آدمی ہیں اور یہ لونڈی کس قابل ہے پر ایک ہزار

میں نہیں دیتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب ہی بیٹھ جائیں" ڈاکٹر صاحب نے رقم
تگنی کرکے دوبارہ پیغام بھیجا۔ اُس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ "میں روپیہ
کی بھوکی نہیں ہوں۔ میں تو صرف عورتوں کے حقوق کی پیروی کی غرض
سے ممبری کے لئے کھڑی ہوئی ہوں، ڈاکٹر صاحب کسی شریف گھرانے
کی تعلیم یافتہ اور بیدار مغز خاتون کو اپنی جگہ کھڑا کر دیں، میں وعدہ کرتی
ہوں کہ بیٹھ جاؤں گی اور مخالفت نہ کروں گی" اب تو ڈاکٹر صاحب
کا قافیہ بڑا تنگ ہوا، لیکن بڑے گرگ باراں دیدہ تھے اس میدان
کے پُرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے وہ چال چلی کہ بی صاحبہ کی
فقرے بازی کچھ کام نہ آئی۔ الکشن میں شیعہ سُنی کا سوال چھیڑ دیا
لکھنؤ میں شیعہ سُنی کا سوال چھیڑنا گویا بھُس میں چنگاری لگانا ہے
جب زیادہ جوش بڑھتا ہے تو نقضِ امن تک کی نوبت آتی ہے۔
محرم کے زمانہ میں حکومت کو پولیس کا خاص انتظام کرنا پڑتا ہے
آج کل بھی 'مدحِ صحابہ' کا قضیہ اس سلسلے میں چھڑا ہوا ہے اور نقضِ
امن کا اندیشہ ہے۔ شیعہ سُنی کا سوال چھڑتے ہی دودھ کا دودھ
اور پانی کا پانی الگ ہوگیا۔ طوائفوں اور سازندوں، اُن کے حامیوں
اور ہوا خواہوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک شیعہ اور ایک سُنی۔
الکشن ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ لیکن پالا ڈاکٹر صاحب
کے ہی ہاتھ رہا۔ بی صاحبہ ہار گئیں مگر اسپورٹس مین (Sportsman)
تھیں اپنا ووٹ ڈاکٹر صاحب کو ہی دیا اور نتیجہ معلوم ہونے کے
بعد بہ نفس نفیس ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دینے کو پہونچیں۔ ڈاکٹر
صاحب اپنے خیمے کے باہر خوش خوش کھڑے تھے۔ ان کی ٹکڑی کے

لوگ ان کے ارد گرد جمع تھے الکشن کے جوڑ توڑ کا ذکر ابھی جاری تھا کہ بی صاحبہ بھی آ پہنچیں۔ آگے بڑھیں اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرکے بولیں :۔

بی صاحبہ۔ ڈاکٹر صاحب الکشن کی جیت مبارک۔

ڈاکٹر صاحب۔ اجی ہار جیت تو ہوا ہی کرتی ہے، اس میں مبارک کی کیا بات ہے۔

بی صاحب۔ نہیں "مبارکباد" دینا تو میرا فرض ہے، پر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے شہر کی بدنامی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب۔ وہ کیسے ؟

بی صاحبہ۔ اجی الہ آباد والے ویسے ہی روز ہم لوگوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ انہیں ایک موقع اور مل گیا۔ کہیں گے، اور صحیح کہیں گے، کہ لکھنؤ والوں کی نگاہ میں عورت کی ہستی و حیثیت کی کچھ قدر و منزلت ہی نہیں۔ عورتوں کے حقوق کا کچھ پاس و لحاظ ہی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ مجھے الہ آباد والوں کے کہنے سننے کا تو کچھ غم نہیں پر آپ سے شکایت ہے کہ آپ بھی ایسا کہتی ہیں۔

بی صاحبہ۔ جو بات کھری ہوتی ہے کہنے میں آتی ہے۔ اچھا آپ ہی بتائے ڈاکٹر صاحب، دیکھئے قرآن پاک کی قسم ہے سینے پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ کہئے گا کہ آخر اس الکشن کے نتیجہ سے ظاہر کیا ہوتا ہے ؟ یہی نا کہ لکھنؤ میں مرد کم ہیں اور مریض زیادہ۔

اس فقرے پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب کچھ

ایسا سٹ پٹائے کہ جواب دیتے نہ بنی۔
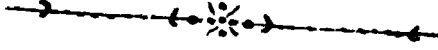
ایلوئی اور ابی لار

پیٹر ابی لار برٹینی کے ایک اعلیٰ اور متمول خاندان سے تھا قدرت نے اس کو صوری اور معنوی دونوں قسم کے اوصاف سے مالا مال کیا تھا۔ اس کے علم وفضل کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ خود فرانس میں اس کے ہم عصروں نے پیرس یونیورسٹی کی منطق و فلسفہ کی کرسی صدارت کو اس کی فضیلت سے زینت دے کر اس کے مرتبہ و شہرت کا اقرار کیا تھا۔ یورپ بھر سے طلبا جوق جوق اس سے درس لینے آتے اور اس کی تقریروں اور تحریروں کے سننے اور پڑھنے کے شیدائی رہتے تھے۔ اس کا رنگ ڈھنگ اپنے سب ہم عصروں سے نرالا تھا اس کے طرز کلام میں جدت اور اس کی تفسیروں اور تشریحوں میں تازگی ہوتی تھی، ابھی وہ صرف سینتیس ۳۷ سال کا تھا کہ پیرس کے مشہور کلیسا نوتردام کے پادری ہونے کی برکت و عظمت اس کو حاصل ہوئی۔ یہ ۱۱۱۶ء کا تذکرہ ہے جس کو اب تقریباً سوا آٹھ سو برس گزرتے ہیں۔

دوشیزہ ایلوئی بچپن کے زمانہ میں ایک کونونٹ کی درسگاہ میں داخل کردی گئی تھی۔ وہیں اس نے تعلیم پائی۔ جب وہ کونونٹ کے پردۂ عصمت سے باہر نکل کر اپنے چچا فلبرٹ کے گھر واپس آئی تو پیرس میں ابی لار کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ابی لار کا نام ہر کہ و مہ کی زبان پر تھا۔ ایلوئی کا اس وقت اٹھارواں سال تھا۔ وہ نہایت حسین تھی اور اس کا حسن و شباب اپنی پوری بہار پر تھا۔ حسن کے

علاوہ اُس نے قدرت سے دردمند دل اور روشن دماغ پایا تھا اُس کے بُشرے سے ذہانت ٹپکتی اور جب بات کرتی تو پھول جھڑتے تھے۔ اُس کے حُسن کا چرچا بھی عام تھا۔ ابی لار اُس کے دیکھنے اور اُس سے ملنے کا شائق تھا۔ حُسنِ اتفاق تھا یا ابی لار کی کوششوں کا نتیجہ کہ وہ فلسفہ کا درس دینے کے لئے ایلوئی کا اُستاد مقرر کیا گیا جب آنکھیں چار ہوئیں اور سلسلۂ ارتباط بڑھا تو ابی لار ایلوئی پر فریفتہ اور ایلوئی ابی لار کی شیدا ہو گئی۔ اور یہ محسوس ہونے لگا کہ گویا قسامِ ازل نے ایک کو دوسرے کے لئے بنایا اور پیدا کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد ابی لار ایلوئی کی محبت میں ایسا ازخود رفتہ ہو گیا کہ منطق اور فلسفے کو خیر باد کہہ کر شعر و شاعری اپنا مشغلہ کر لیا۔ اس کے اشعار اور گیت پیرس کے گلی گلی اور کوچوں کوچوں میں لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ ابی لار اور ایلوئی کی محبت کا راز طشت از بام تھا اگر کوئی بے خبر تھا تو صرف چچا فلبرٹ لیکن تابکے۔ ایک نہ ایک دن تو اُن کی بھی آنکھیں کھلنی تھیں۔ اور آنکھیں کھُلیں تو قہر نازل ہوا اور ایلوئی کے گھر کا دروازہ ابی لار پر بند ہو گیا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح یہ دونوں چوری چھپے ملتے رہے لیکن جب یہ طریقہ نبھ نہ سکا تو ابی لار ایلوئی کو بھگا کر برٹینی لے گیا اور وہاں یہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ایلوئی کے لڑکا ہوا۔ ابی لار برابر ایلوئی سے اصرار کرتا رہا کہ وہ اُس سے شادی کرے لیکن وہ اس اندیشے سے برابر انکار کرتی رہی کہ اگر ایسا ہوا تو ابی لار چرچ (Church) سے

نکال دیا جائے گا اور اپنے ہم عصروں میں اُس کی ذلت ہوگی۔
لیکن ابی لار نے بہت کچھ منت سماجت کر کے بالآخر ایلوی کو شادی پر رضامند کر لیا۔ جب شادی ہوگئی تو یہ دونوں پھر پیرس آئے، لیکن شادی کا معاملہ عرصہ تک پردۂ راز میں نہ رہ سکا اور چچا فلبرٹ کو اس کی خبر ہوگئی۔ اُنھوں نے ابی لار سے اس کا نہایت ظالمانہ اور بے رحمانہ بدلہ لیا۔ اُن ہی کے ایما اور ترغیب سے ایک رات کئی بدمعاش ابی لار کے گھر میں گھس کر اُس پر حملہ آور ہوئے اور اُسے مجروح کیا اور مجروح بھی اس طرح کیا کہ سرچشمۂ حیات جس سے جوانی کے تمام عیش وارمان وابستہ تھے ہمیشہ کے لئے خشک ہوگیا۔ ابی لار شرم و یاس سے پسپا ہو کر پیرس چھوڑنے پر مجبور ہوا اور اسی کی ترغیب سے ایلوئی پرستار دین بن کر کسی کونونٹ میں روپوش ہو کر ہمیشہ کے لئے زندہ درگور ہوگئی۔ کافی عرصہ بعد ایلوی اسی کونونٹ کی ناظمہ کے مرتبے پر پہونچی۔ ابی لار اپنے دشمنوں کے تعاقب اور زد سے زچ ہو کر پریشان و سرگرداں پھرا کیا، کبھی ایک خانقاہ کی خاک چھانتا تو کبھی دوسری کی۔ جن راہبوں اور پادریوں کی صحبت میسر آتی ان کا چال چلن اتنا خراب اور زندگیاں ایسی تباہ اور شرم ناک نظر آتیں کہ اپنا نباہ نہ دیکھ کر وہاں سے بھی پینڈ چھڑا کر بھاگتا۔ غرض کہ اس کے جسم و دماغ کو سکون و آرام میسر نہ آتا۔ ماسوا اس کے ایلوئی کی یاد ہر دم ستایا کرتی۔
ابی لار نے اپنی واردات دل جو اُس پر اس زمانے میں بیتی

نے اپنے ایک مخلص دوست فلنٹس کو خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔ بعد میں یہ تحریر بہت مشہور ہوئی۔ یہ خط جس میں ابی لار نے اپنے سانحۂ محبت کا ماتم کیا تھا کسی طرح ایلوئی کی نظر سے گزرا اور اس بہانے سے حبیب و محبوب میں پھر سلسلۂ نامہ و پیام شروع ہوا کہ جس سے زندگی کا ماتم تازہ بھی ہوتا تھا اور اُن دُکھیا دلوں کو ڈھارس بھی بہم پہنچتی تھی۔ ان میں سے پہلے دو خط جو ایلوئی نے ابی لار کو اور ابی لار نے ایلوئی کو لکھے یورپ کے ادب میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں اور یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کی واقفیت ہے ان خطوط کا اردو میں ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ اسی خیال سے یہاں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اردو علم ادب کے شائقین اور قدردانوں کو بھی ان سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔

تریسٹھ سال کی عمر میں ابی لار بے یار و مددگار، بے کسی کی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ ایلوئی نے اسے اپنے ہاتھوں سے دفنایا۔ بائیس سال بعد ایلوئی بھی اُسی کے پہلو میں دفنائی گئی اور زندگی بھر کے بچھڑے ہوئے یہ دونوں مل کر موت کے آغوش میں سو رہے ہیں۔ پیرس میں "پیری لاشیز" کے قبرستان میں ان محبت پر مٹنے والے شہیدانِ وفا کی تربتیں آج تک ہزاروں دردمندوں کی زیارت گاہ ہیں۔
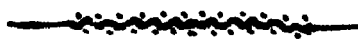
نامہ و جواب نامہ

ایلوئیؔ بنام ابی لار

وہ خط جو تم نے اپنے دوست کی پریشان حالی میں دلاسا دینے کے لئے لکھا تھا اتفاقاً میرے ہاتھ آگیا۔ تمھارے دستخط پہچانتے ہی میں اُسے کھولنے کے لئے بے چین ہو گئی۔ دوسرے کے نام کا خط کھولنا بات تو بد تہذیبی کی ہے لیکن میں تمہاری خیر خبر معلوم کرنے کے لئے ایسی بے تاب تھی کہ اختیار ہاتھ سے نکل گیا اور میں نے یہ بھی سمجھا کہ جو چیز تمہاری ہے اس پر سب سے اوّل حق میرا ہے۔ لیکن بُرا ہو اس شوق و بے تابی کا کہ اُس نے مجھے کس طرح تباہ کیا۔ وہ خط تو میری اور تمہاری وارداتِ دل کا پُردرد دُکھڑا تھا۔ وہ تو ہماری تباہ حالی کے ماتم سے اس طرح بھرا ہوا تھا کہ اس نے میرا دل دہلا دیا۔ پُرانے پیار محبت کی یاد جس کے بھلانے کے لئے میں ہمہ تن کوشاں رہی پھر اس طرح تازہ ہوئی۔ وہ زخم جن کو میں سمجھنے لگی تھی کہ اب مندمل ہوتے جاتے ہیں نئے سرے سے اس طرح ٹیسنے لگے کہ آتش کدۂ محبت کے وہ انگارے جنہیں میں نے خون کے آنسو بہا کر بجھانے کی کوشش کی تھی اور شباب کی مُرجھائی ہوئی بلکہ مُردہ اُمنگوں اور ارمانوں کی راکھ سے جنہیں ڈھانپا تھا پھر ایک بار دہک اُٹھے اور ان کے شعلے مجھے پھونکے دے رہے ہیں۔ کیا ایک دوست کی معمولی سی پریشان حالی نہیں

دلاسا دینے کے لئے اس راکھ کے ڈھیر کا کریدنا اور اس دکھڑے کو دہرانا ضروری تھا؟ . . . . . . میرے آنسوؤں نے تمہاری اس تحریر پر جابجا دھبے ڈال دئے ہیں۔ کاش میں اس پورے خط کو اپنے آنسوؤں سے دھو سکتی اور پھر اسے واپس کرتی تو مجھے کچھ تھوڑی سی ڈھارس ہو جاتی لیکن مجھ سے وہ فوراً ہی واپس لے لیا گیا اور اس کا موقع نہ ملا۔

قبل اس کے کہ میں نے تمہارا یہ خط پڑھا میرا دماغ نسبتہً سکون کی حالت میں تھا۔ محبت کے مارے ہوؤں کو یقیناً اپنے دکھ درد کا احساس آنکھوں ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ تمہارا خط پڑھنے کے بعد ہی سے میرا دکھ درد پھر تازہ ہو گیا۔ دراں حالیکہ ہمارے دشمنوں کا غیظ و غضب بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں اپنے تئیں لعنت ملامت کرتی ہوں کہ میں اپنے سوزِ غم کو اب تک دبائے کیوں بیٹھی رہی۔ کہتے ہیں کہ زمانہ غم و غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ لیکن ہمارے دشمنوں کے غم و غصے کی آگ تو روز بروز بھڑکتی ہی جاتی ہے۔ اگر انہوں نے یہی ٹھانی ہے کہ وہ مرتے دم تک تمہارا پیچھا کرتے رہیں گے اور غالباً مرنے پر بھی تمہاری مٹی خراب کریں گے تو میں دم بخود کیوں رہوں؟ تم پر جو ستم ڈھائے جاتے ہیں مجھے انہیں سننے دو، سوچنے دو، تاکہ میں انہیں دنیا پر طشت از بام کر کے ان دنیا والوں کو شرماؤں کہ انہوں نے تمہاری قدر کرنی نہ جانی۔ جو کچھ تم پر بیتی ہے رتی رتی مجھے لکھو۔ اس سے نہ ڈرو کہ وہ مجھے افسردہ کرے گی۔ میں سب حال جاننا چاہتی

ہوں۔ کہتے تو یہی ہیں کہ دُکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے۔ لیکن میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ دُکھ بھی بانٹا جا سکتا ہے۔ مجھے بھی اپنے آہ و فغاں میں ہم نوا ہونے دو ممکن ہے کہ اس طرح سے میں تمہارا بوجھ بانٹ سکوں۔

یہ بہانا نہ کرنا کہ تم مجھے رُلانا نہیں چاہتے۔ میری ایسی دکھیاؤں کے لئے کہ جو اس سُنسان خاموشی میں زندہ در گور کی گئی ہیں تو بہ و زاری تو مقدر ہے۔ ہمیں اپنا مقدر پورا کرنے دو۔ اگر تم اس کا انتظار کرو گے کہ تم مجھے خوش آیند باتیں لکھو تو عمر بھر لکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ نیک اور سچے لوگوں کے قریب خوش حالی مشکل ہی سے آتی ہے اور قسمت تو ایسی اندھی ہے کہ اگر تم غفیر میں کوئی دل و دماغ والا آدمی بھولے بھٹکے نکل آئے تو اُسے دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا لکھو اور جلدی لکھو۔ معجزوں کا انتظار نہ کرو۔ معجزے شاذونادر ہی ہوتے ہیں اور ہم تو دُکھ درد کے اب ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ خوشی کے مُنہ دیکھنے کے ارمان باقی نہیں کیسی ہی دُکھ بھری داستان کیوں نہ ہو اگر تم مجھے لکھو گے تو میری تسکین ہو گی کہ تم مجھے ابھی بھولے نہیں۔

تمہاری تصویر میرے کمرے میں آویزاں ہے۔ جتنی دفعہ بھی میں اس کے تلے سے گزرتی ہوں میری نظر اُس پر پڑتی ہے۔ دراں حالیکہ جب تم میرے پہلو میں ہوتے تھے تو میں اُنسے کبھی نظر اُٹھا کر نہ دیکھتی تھی۔ جب یہ تصویر جو محض بے جان اور خاموش شبیہ ہے آنکھوں کو اس طرح لطف اندوز کر سکتی ہے تو تمہارے

خط تو جن میں جان بھی ہے اور زبان بھی۔ جو دل کی بے کلی کی تڑپ اور جذبات کے جوش کا آئینہ ہیں اور جن سے گفتگو کی نزاکت اور حلاوت کی چاشنی ٹپکتی اور بعض اوقات بے باکی کے انداز بھی ظاہر ہوتے ہیں میرے لئے کیسے روح افزا نہ ہوں گے؟

ہم ایک دوسرے کو خط تو لکھ سکتے ہیں۔ یہ تو بڑی معصوم سی حرکت ہے۔ اس کی تو ممانعت نہیں ہمارے لئے بس ایک ہی خوشی باقی رہ گئی ہے اور ہمارے دشمن بھی اسے ہم سے نہیں چھین سکتے۔ تمہارے خطوں سے معلوم ہو گا کہ تم میرے شوہر ہو اور میرے خط تمہیں بتائیں گے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ خطوں میں ہم جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ غالباً خط لکھنے کا رواج ہمارے ہی سے حرماں نصیبوں کو دلاسا اور تشفی دینے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔ تمہارے دیدار اور تم سے ملاقات کا جو خط تھا اور جس کو میں اب ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھی اس کی کچھ کچھ تلافی تمہارے خطوں کو دیکھنے اور پڑھنے سے ہو سکتی ہے۔ ان سے مجھے تمہارے دل کا حال معلوم ہوتا رہے گا۔ میں تمہارے دماغ کی کیفیت ... میں دیکھتی رہوں گی میں انہیں سینے سے لگا کر رکھوں گی اور دم بدم پیار کیا کروں گی۔ تمہیں حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

میں نہیں چاہتی کہ لکھنا تمہیں بار ہو جائے۔ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں جو طبیعت میں آئے اور قلم سے نکلے لکھ ڈالو۔ اگر تم نے مجھے یہ نہ لکھا کہ تم اب بھی مجھ سے محبت اور پیار کرتے ہو

تو مجھے جینا اجیرن ہو جائے گا۔ لیکن تمہارا انداز تحریر ایسا ہونا چاہئے کہ جو مجھے قدرتی معلوم ہوں بناوٹی نہیں۔ ایسے بول ہوں جو تمہارے دل سے نکلیں اور میرے دل میں سما جائیں۔ تم نے درد بھرے دکھڑے کو دُہرا کر میرے رنج و غم کو تازہ کیا ہے اب تمہیں زیبا ہے کہ محبت کے پیمانِ وفا کو بھی دُہرا کر میری تسلی تشفی کرو۔

تمہیں یاد ہے کہ میں تمہاری باتیں کس شوق سے سُنتی اور ان میں کیسی محو ہو جاتی تھی گھنٹوں پل مارتے گزر جاتے تھے اور میری تسلی نہیں ہوتی تھی۔ جب تم مجھ سے دور ہوتے تھے تو میں کمرے میں بند ہو کر تمہیں خط لکھا کرتی تھی اور جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ وہ تمہیں پہنچ گیا ہیں بے چین رہتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تمہیں میرے دل کی کیفیت کا پتہ دیں گی۔ مجھے اب یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ جذبۂ شوق کی کوئی انتہا نہ تھی۔ تمہاری محبت کی دھن میں میں نے وہ وہ باتیں کیں کہ جن سے مجھے تنفّر ہوتا تھا۔ میں نے اس کُنج قفس میں بھی ہمیشہ کے لئے بند رہنا صرف اس لئے قبول کیا کہ تم سکون و اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرسکو جذبۂ محبت کی سچائی اور پاکیزگی ہی انسان کو ایسے ارادے کی ہمت دلا سکتی ہے، عیش پرستی اس بار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرے ظالم چچا کا خیال تھا کہ میں شباب کے پیچھے دیوانی اور متوالی ہو رہی ہوں۔ تمہاری جوانی تباہ کر کے اُس نے میرا عیش مجھ سے چھیننا چاہا۔ اس نے ہم عورتوں کی معمولی کمزوری سے میری محبت کا اندازہ لگایا تھا اور مجھے میری کمزوری کی سزا دینی چاہی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں

تم پر نہیں بلکہ تمہاری جوانی پر فریفتہ ہوں اسی لئے اس نے تمہاری جوانی برباد کی۔ لیکن اس کا تیر خطا کر گیا اور وہ گناہ بے لذت کا مرتکب ہوا کیونکہ میں تو تمہاری محبت کی اب بھی ویسی ہی دلدادہ ہوں جیسے پہلے تھی فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اس میں عیش شباب کی آلائش بھی ملی ہوئی تھی۔ دل کے ساتھ ہی ساتھ میرا جسم بھی پیار و محبت کا لطف اُٹھاتا اور حظ حاصل کرتا تھا۔ اب جدائی کے صدموں اور مصیبتوں کی چوٹوں نے اس آلائش کو دور کر کے میرے جذبۂ محبت کو ایسی جلا دیدی ہے کہ اسے اور بھی زیادہ لطیف اور پاکیزہ بنا دیا ہے اور یقین مانو کہ جب تک اس تنِ بسمل میں سانس آتی جاتی ہے میں اپنے پیار اور محبت کی اس لطافت و پاکیزگی کو ہر لمحہ تم پر نچھاور کرتی رہوں گی۔

غالباً جو کچھ میں لکھ رہی ہوں اس کے باور کرنے میں تمہیں تکلف نہ ہوگا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں اپنے محبت کے جذبے کی آزادی کو شادی کے رشتے کی بندشوں میں جکڑنے سے کس قدر گریز کرتی اور گھبراتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ بیوی کے مرتبے کو دُنیا عزت کی نگاہ سے دیکھتی اور مذہب اُسے پاک و متبرک سمجھتا ہے مگر مجھے تمہاری محبوبہ ہونے پر زیادہ ناز تھا اور اسی میں لطف تھا کہ محبت بندشوں میں بندھی ہوئی نہیں بلکہ آزاد رہے شادی کا رشتہ کیسی ہی عزت کی نگاہ سے کیوں نہ دیکھا جائے لیکن بندشوں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ خیال کرتے ہی کہ میرے

شوہر کے دل میں میری محبت باقی رہے یا نہ رہے مگر میں زندگی بھر اُسے پیار کرنے پر مجبور رہوں، مجھے وحشت ہوتی ہے اور بیوی کا نام مجھے ذرا نہیں سہاتا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے تمہاری محبوبہ کہلانے میں لطف آتا تھا۔

لیکن ہاں یہ تو بتاؤ کہ جب سے پرستارِ دین بن کر میں یہاں پناہ گزیں ہوئی تو تم میری جانب سے لاپرواکیوں رہنے لگے؟ تم نے مجھے بھلا کیوں دیا؟ میں یہاں آکر زندہ درگور ہوں تو اپنی خوشی سے نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہاری مرضی کے آگے سرِ تسلیم جھکایا اور تمہارے حکم سے یہاں آئی۔ بتاؤ کہ یہ سرد مہری کیوں ہے یا مجھے بتانے دو کہ میں کیا سمجھتی ہوں؟ بات یہ ہے کہ تم میرے شباب کا عیش لوٹنا چاہتے تھے۔ میں بھولی بھالی تھی میں نے تمہیں سیر کام ہونے دیا۔ جب تمہاری سب خواہشیں پوری ہوگئیں تو اب جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ جب تک میں تمہارے حظ اور جوشِ مسرت کی جانب سے لاپروا رہی تمہیں اس کیفیت میں لطف آتا رہا۔ جب تک میں تم سے گریز کرتی رہی تم میرا پیچھا کرتے رہے لیکن جب میں نے تمہارا دامن پکڑا، جب میں نے اپنا دل سینے سے نکال کر تمہارے قدموں تلے ڈال دیا اور گرویدہ ہو کر تم پر نثار ہونے لگی تو تم مجھ سے دور بھاگے ...... مجھے تو تلخ تجربے نے اس کا قائل کر دیا ہے کہ اگر ہم کسی کے بے حد رہینِ منت ہوتے ہیں تو بجائے اس کے شکر گزار ہونے کے اُس سے آنکھ چرانے

لگتے ہیں۔ غیر معمولی فیاضی کا نتیجہ اور بدلہ لاپروائی ہوتا ہے۔ میں
نے تمہارے آگے نہایت آسانی سے اور بلا کشمکش سر تسلیم
خم کر دیا۔ جو تمہیں ایسی آسانی سے ملا، تم نے لاپروائی سے پھینک
دیا۔ لیکن اس ناشکر گزاری میں بھی شبہ نہیں اور گو ظاہرا
مجھے کسی خواہش و ارمان رکھنے کا اب حق نہیں لیکن اصلیت
یہ ہے کہ میں اب بھی تمہارے پیار اور محبت کے لئے جان دیتی
ہوں۔ جس وقت [illegible] لیا اور اس
کی قسم کھائی تو [illegible] تمہارا وہ آخری خط موجود
تھا کہ جس میں تم نے پیار و محبت کا یقین دلایا اور لکھا تھا کہ تم میرے
ہو چکے اور ہمیشہ میرے ہو کر رہو گے۔ اسی بھروسے اور
تمہارے [illegible] میں نے یہ زندگی گزاری اور آج زندہ درگور ہوں
تم [illegible] کے لئے چکے اور میں تمہارا۔ جو لیا جا چکا اور دیا جا
چکا اب وہ واپس نہیں ہو سکتا۔ تم میرے جذبہ محبت کی
زنجیروں سے جو تم نے خوشی سے پہنی تھیں اب آزاد نہیں
ہو سکتے

یا الٰہی یہ کیا دیوانہ پن ہے! خدا کے گھر میں بیٹھی ایمان
سے منہ موڑ کر کفر کی باتیں کر رہی ہوں۔ فرشتوں سے گھری
ہوئی ہوں لیکن بشر کی دیوانی ہوں۔ اے ظالم! یہ تیری ہی
بے وفائیوں کا خمیازہ ہے سچ ہے ؎

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

کیا یہ یک لخت تعلق کا قطع کر دینا زیبا تھا۔ کاش تھوڑے دن

مجھے دھوکے ہی میں رکھا ہوتا اگر اس سوزِ محبت کی آگ کو میں دھیمے دھیمے بجھتے اور ٹھنڈا ہوتے دیکھتی تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا میری نگاہ میں یہ دھوکا اور فریب بھی لائق درگزر ہوتا لیکن یک لخت یہ قطع تعلق! کیا اس کا تمہارے پاس کوئی عذر ہے؟ میں ملنے کے لئے بے تاب ہوں لیکن اگر یہ کسی طرح ممکن نہیں تو کم از کم اپنے ہاتھ سے چند سطریں تو لکھ بھیجو۔ جس کے دل میں محبت کا درد ہوتا ہے۔ اُسے آنسو بہانا دشوار نہیں تو پھر چند سطریں لکھنی کیوں مشکل ہو جائیں؟ میں ایسا مضمون نہیں چاہتی کہ جس سے تمہاری علمیت یا فضیلت ظاہر ہوتی ہو کہ جس پر تمہاری شہرت مبنی ہے۔ میں تو اُن بولوں کے سُننے کی مشتاق ہوں کہ جو تمہارے دل سے نکلے ہوں اور جنہیں تمہارا قلم بے ساختہ اور روانی سے لکھ سکے۔ میں جب یہاں آکر رُوپوشں ہوئی تو مجھے یہ دھوکا تھا کہ تم میرے اور صرف میرے ہو کر رہو گے اور میں تمہارے قاعدے اور قانون کی پابند رہونگی میں نے پرستارِ دین ہونے کی نہیں بلکہ پرستارِ محبوب ہونے کی قسم کھائی تھی۔ میں نے تو یہاں آکر زندہ در گور رہنا اس لئے قبول کیا کہ یہ تمہاری خوشی تھی جہاں تم نے مجھے رکھا ہے اب تو موت ہی یہاں سے مجھے نکال سکتی ہے۔ بلکہ میں تو مٹی میں مل کر بھی تمہاری میت کی یہیں منتظر رہوں گی اور دنیا کو دکھا دوں گی کہ طاعت و وفا کسے کہتے ہیں۔

پرستارِ دین بننے کے سوانگ رچنے میں کیا راز پنہاں تھا تم سے کیوں چھپاؤں؟ تمہیں معلوم ہے کہ مذہب کا جوش یا مولا

کی لگن مجھے یہاں گھسیٹ کر نہیں لائی تھی۔ تمہارا ضمیر اور تمہارا ایمان
تمہیں خود اس حقیقت سے منکر نہ ہونے دے گا۔ قصہ مختصر میں یہاں
آگئی اور تا بہ زندگی یہیں رہوں گی لیکن اگر تم میری طرف سے
اسی طرح لاپروا رہا کئے اور میں تمہاری محبت کھو بیٹھی تو مجھے اس
کنج قفس میں آکر کیا ملا۔ میں کس امید پر جیتی رہوں یہ تو صحیح ہے کہ
محبت کی مایوسیوں اور تمہاری ذلت و بربادی نے مجھے عصمت و
پاکبازی کا لباس پہنا دیا۔ لیکن یہ غلط ہے کہ مجھے اپنی پرانی
محبت پر اب شرم آنے لگی ہے یا اس سے تائب ہو چکی ہوں
اس پرستارانِ دین کے مجمع میں میں اب تک صرف پرستارِ محبت
ہوں۔ اس مجاہدین صلیب کی دنیا میں اب تک اپنی خواہشات
کی غلام ہوں مگر اصلیت یہ ہے کہ خانۂ دل میں صرف ابی لار کی
پرستش کیا کرتی ہوں۔

میں کیسی گنہ گار ہوں! یا الٰہی! مجھے بخش دے۔ شاید کہ تیرے
کرم و بخشش سے مایوس ہو کر میں یہ واویلا مچا رہی ہوں۔ مانتی
ہوں کہ گنہ گار ہوں لیکن گریہ و زاری اپنے گناہوں کے لئے
نہیں بلکہ محبوب کے لئے کرتی ہوں۔ اپنے گناہوں اور جرموں
پر توبہ وزاری کرتی ہوں لیکن ان توبہ شکنوں میں ہوں کہ جو گناہ
کی لذت اور اس کی یاد کبھی بھول نہیں سکتے۔ عیش نہیں تو
فکرِ عیش ہی سہی۔

یا خدا! یہ کیا تماشا ہے! اپنے گناہوں پر پچھتاتی ہوں اور
تم سے اُن ہی کے سرزد نہ ہونے کی شکایت کرتی ہوں۔ اور کس لئے؟

روپوش تو خانقاہ میں ہوں لیکن دامنِ عصمت چاک کرکے تار تار کئے دیتی ہوں۔ دیکھو، دیکھو! میری تباہ حالی کا تماشا دیکھو کیا میں اپنے فرائض منصبی کو جانتی نہیں؟ جانتی ہوں۔ ؎

جانتی ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اگر محبت کے واسطے سے نہیں تو للہ ترس کھا کر ہی سہی کسی طرح سے اس بد نصیب کو سہارا دو مجھے سہارا دو کہ میں اپنی خواہشوں کو بھول جاؤں۔ اپنی ہستی کو بھول جاؤں اور اگر ممکن ہو سکتا ہو تو تم کو بھی بھول جاؤں اگر تمہارے دل میں درد ابھی باقی ہے تو اپنی محبوبہ کی خبر لو۔ اگر تم میں شفقتِ پدری ہے تو اس معصوم بچے کی تسلی کرو۔ تم پران بولوں کا کوئی اثر نہیں۔ محبت نہ سہی رحم ہی سہی۔ اگر تم نے میری بات پر دھیان دیا اگر تم نے میری درخواست منظور کر لی تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ پھر میں حقیقت میں پرستارِ دین ہو جاؤں گی اور اپنے مرتبے کا اعزاز کروں گی۔ میں تیار ہوں کہ تمہارے نقشِ قدم پر چل کر اس خداوند کریم کی درگاہ میں کہ جس کا رحم بے پایاں ہے، سرنگوں ہو کر ماتھا ٹیکوں اور ناک رگڑوں۔ کیا عجب ہے کہ وہ اپنی بخشش اور کرم سے ہمیں گناہوں کے راستے سے ہٹا کر، اور ہمارے دلوں کو ہر طرح کی آلائشوں سے پاک کر کے رفتہ رفتہ ہماری آنکھیں کھولے کہ ہم اُس کے بخشش و کرم کے نور اور جلوے کو جو اب تک ہماری گنہ گار نگاہوں سے اوجھل رہا، دیکھ سکیں اور روشنی حاصل کر سکیں۔ میرا دل ہمیشہ مائل بہ محبت رہا ہے

یہ ایک دم لاپروا نہیں ہو سکتا اور مجھ ہی پر کیا منحصر انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ باری باری سے کبھی تو ہم جوشِ محبت سے مغلوب ہوتے ہیں کبھی نفرت کا جذبہ ہم پر طاری رہتا ہے۔ جب ایک عمر اس طرح گزرتی ہے تب جا کر کہیں سکون میسر آتا ہے۔ اور یہ امید برابر برقرار رہتی ہے کہ ہم ہمیشہ راندۂ درگاہ ہی نہ رہیں گے اسی لئے اپی لار میں عاجزی سے منت کرتی ہوں کہ اس بندی خانے کی زنجیروں کے بوجھ کو جو میرے پاؤں میں پڑی ہیں ذرا سہارا دے کر ہلکا کر دو۔ میں تو کیفِ مجاز میں ڈوبی رہی تم راہ حقیقت دکھا سکتے ہو تو دکھاؤ۔ روحانیت کا جلوہ کیسا ہوتا ہے؟ معرفتِ الٰہی کسے کہتے ہیں؟ عشقِ حقیقی کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ کس طرح کام کرتا ہے؟ یہ پارس لوہے کو سونا کس طرح بنا دیتا ہے کندن کی طرح کیسے چمکا دیتا ہے؟ اگر تمہیں معلوم ہے تو بتاؤ سکھاؤ۔ تمہارا فرض ہے تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے چہیتے بندوں پر جب بے حد مہربان ہوتا ہے تو ان کے دلوں میں ایسی بے چینی، بے کلی اور تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے متوالے ہو کر وہ اسی کی دھن میں دیوانے ہو جاتے ہیں اور انہیں بس اللہ ہی اللہ دکھائی دیتا ہے جب تک تمہاری آنکھیں اس جلوۂ نور سے منور نہ ہوں۔ جب تک تمہارے دل میں یہ بے کلی اور تڑپ پیدا نہ ہو۔ جب تک تم پر یہ کیفیت اس طرح طاری نہ ہو کہ تم اس سے مغلوب ہو جاؤ۔ اپنے دل میں میرے لئے بھی تھوڑی سی جگہ رکھو۔ مجھے بالکل بھلا نہ دو۔

میرا دل، میری محبت، میری وفا ٹھکرانے کی چیزیں نہیں۔ گو تم سے دور بھاگنا چاہتی ہوں۔ مگر یاد رہے کہ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہ کہنا تو نہیں چاہتی تھی مگر کہنے پر مجبور ہوں۔ لکھتی جاتی ہوں آنسو اُسے مٹاتے جاتے ہیں۔ اب کچھ نہ لکھوں گی بجز اس کے کہ اگر تمہاری یہی مرضی ہے (کاش اس کی ہمت کرسکوں) تو ہمیشہ کے لئے الوداع!
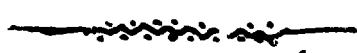
ابی لار بنام ایلوئی

اگر میں یہ جانتا کہ وہ خط جو تمہارے نام نہ تھا تمہارے ہاتھ پڑ جائے گا تو میں اس میں کوئی ایسی بات اپنے دُکھ درد کی نہ لکھتا کہ جس سے پُرانے زخم پھر تازہ ہوں اور رِسنے لگیں۔ میں نے تو اپنے زخموں اور ناسوروں کو اس لئے بے دھڑک اپنے دوست کے سامنے رکھ دیا تھا کہ اُس کو اپنی تکلیفوں کا احساس ذرا کم ہو جائے۔ جو کچھ لکھا تھا وہ اس غرض سے کہ میرے دوست کو اُس سے تسکین ہو مگر نتیجہ یہ نکلا کہ تم کو پریشان کر ڈالا۔ میں نے تمہیں رُلایا ہے تو میں ہی تمہارے آنسو پوچھوں گا۔ آؤ ہم دونوں مل کر آہ و زاری کریں۔ میرے غرور اور میری خودداری نے اس کی اجازت نہ دی کہ میں اپنے دل کے راز کو غیروں پر فاش کرتا لیکن تم نے میرے خرمن صبر پر وہ بجلیاں گرائی ہیں کہ میں بے بس ہو کر اب تمہارے سامنے اپنا تڑپتا ہوا دل نکال کر رکھے دیتا ہوں۔ جس عذاب النار میں میری روح بھٹکی جاتی

جاتی ہے اُس کے شعلے تم تک پہونچیں گے چاہو تو اپنے ہاتھ سینک لینا۔ یہ تو سچ ہے کہ اپنی مصیبتوں سے مجبور ہو کر اور یہ دیکھ کر کہ اب ہماری حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ عیش و آرام کے دن ہمیشہ کے لئے گزر گئے اور اب ان کی یاد کا بھلا دینا ہی عقل کی بات ہے۔ میں نے اس مایوسی کی حالت میں فلسفے اور مذہب کی آڑ لی اور کوچۂ محبت سے دور بھاگ کر اس خانقاہ میں پناہ گزیں ہوا۔ اور ارادہ کیا کہ دین و مذہب کی قسمیں کھا کر اپنا کلیجہ پتھر کا کر لوں گا مگر نتیجہ کیا نکلا؟ میرا جوش محبت ضرور پابہ زنجیر ہے لیکن میرا مَن اور میرا دھیان برابر بھٹکتا رہتا ہے۔ دل سے کہتا ہوں کہ تم کو بھلا دوں گا لیکن یہ سنتے ہی وہ اور بھی زیادہ تمہارے لئے مچلنے لگتا ہے۔ میں محبت کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہوں لیکن وہ اور کڑی پڑتی جاتی ہیں۔ جس سُنسان خاموشی کی دنیا میں میں رہتا ہوں وہ میرے احساس کو اور تیز کرتی ہے۔ روز مرہ کے دھندوں سے جب ذرا بھی فرصت ملتی ہے تو میں اسی خیال میں غرق ہو جاتا ہوں میں نے اپنے دل پر قابو پانے کے لئے ہر طرح کی کوشش کر ڈالی لیکن ناکامی رہی۔ اب تو تھک کر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ چنچل من میرے قابو سے باہر ہے۔ میں اس سے ہار گیا۔ بس طریق دانشمندی یہی ہے کہ میں اپنی کمزوری کو غیروں کی نگاہ سے چھپائے رہوں لیکن تم سے کیسے چھپا سکتا ہوں۔ دیکھو میں کیسا کمزور اور کھویا ہوا ہوں!...

.... اب جبکہ میں زندگی کی نعمتوں سے محروم

کردیا گیا ہوں تو دین و مذہب کا تقاضا ہے کہ میں صرف نیکی و پاکبازی کے راستے پر چلوں لیکن میرا دل و دماغ اب تک محبت و عشرت کے خواب و خیال میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ گو محبوب میرے پہلو میں نہیں لیکن اس کا تصور ہر وقت میرے دھیان میں رہتا ہے۔ تارک الدنیا ہونا عقیدہ و ایمان پر قدم جمائے رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ جب تک خداوند حقیقی اپنے فضل و کرم سے اپنے گنہگاروں پر ابر رحمت نہیں برساتا، وہ صحرا و ریگستان میں بھی گناہ کے راستوں پر بھٹکتے پھرتے اور اُن ہی چیزوں کے پیچھے دوڑتے ہیں کہ جو اُن پر ممنوع ہو چکی ہیں تم سمجھتی ہوگی کہ چونکہ ہماری خانقاہ کی چار دیواری زندگی کے چہل پہل سے خالی ہے اور یہاں موت کا سا سناٹا چھایا رہتا ہے تو ہمارا خواہش و ارمان بھی یہاں آکر مر جاتے ہوں گے۔ ایسا نہیں۔ یہاں کی سُنسان خاموشی تو ہمارے جذبات کو اس طرح برانگیختہ کرتی ہے کہ وہ نکلنے کے لئے تڑپنے لگتے ہیں اور ہم اُن پر قابو نہیں پاسکتے۔ معبود کی عبادت کا موقع تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور خال خال لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اگر مجھے یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو میں تمہیں گمراہ نہ کرتا۔ تم مجھے اپنا استاد کہتی ہو۔ یہ سچ ہے کہ تم میرے زیر نگرانی تھیں اور میں واقعی تمہارے دماغ کو علوم و فنون سے زینت دینا چاہتا تھا مگر ہوا یہ کہ تم اپنی معصومیت کھو بیٹھیں اور میں اپنی آزادی۔ تمہارا چچا جو تمہیں پیار کرتا تھا میرا دشمن ہوگیا اور اس نے مجھ سے بُری طرح

بدلہ لیا۔ میں زندگی کے عیش و مسرت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا اگر اس کے ساتھ ہی ساتھ درد محبت کی کھٹک بھی نکال دی جاتی تو شاید مجھے کچھ تسکین ہوتی۔ میں سمجھتا کہ میرے دشمنوں نے میرے ساتھ یہ ایک سلوک کیا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ جب میں آزاد تھا اور تم میرے پہلو میں ہوتی تھیں تو مجھے اپنے گناہ و جرم کا کبھی اس طرح احساس نہ ہوتا تھا کہ جس طرح اب جبکہ تم صرف میرے تصور میں ہوتی ہو اور میں تمہارے لئے گریہ و زاری کرتا ہوں۔ میں جب تمہارا دھیان کرتا ہوں اور تمہاری محبت یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دیکھو میں کیسا بدقسمت ہوں۔ میں خداوند کریم کے حضور میں توبہ و زاری کے لئے سجدہ اور جبہ سائی کرتا ہوں لیکن میری توبہ قبول نہیں ہوتی۔ میرے درویشانہ لباس پر بھی اُس کی نظر نہیں پڑتی۔ بات یہ ہے کہ میں نے اپنی خواہشوں اور ارمانوں کی آگ کو گریہ و زاری سے بجھا کر ظاہرا راکھ کا ڈھیر لگا دیا ہے لیکن اندر ہی اندر آگ کے انگارے دہک رہے ہیں۔ انسانوں کی نگاہ سے چھپ جائے۔ لیکن اس ذاتِ واحد کی نظر سے کچھ اوجھل نہیں رہتا۔ ہم انسانوں کو دھوکا دے سکتے ہیں مگر اس پر سب آشکارا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری توبہ بھی منظور نہیں ہوتی!

تم لکھتی ہو کہ تم نے میری خاطر پرستارِ دین ہونا قبول کیا۔ شانِ ایزدی میں یہ کلمے بمنزلۂ کفر ہیں۔ ایسے کلمے زبان سے نہ نکالو ورنہ خدا کا عتاب نازل ہوگا۔ میں سمجھتا تھا کہ مدتِ مدید کی

علیحدگی تمہارے خیال و جذبے کو بدل دے گی اور مجھے بھی ہیجانِ
جذبات سے نجات مل جائے گی۔ کیونکہ بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے
کہ جب آنکھ سے دور، تو دل سے بھی دور، لیکن مجھے تو پُرانی محبت
کی یاد اب تک برابر ستائے جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سمندر کا
کنارا اور برٹینی کی فضا میرا دل بہلائے گی۔ دماغی اشغال، روزہ،
نماز، سجدہ اور توبہ تمہارا خیال اور دھیان میرے دل و دماغ
سے مٹا دیں گے لیکن یہ تین سو میل کا فاصلہ اور جفاکشی رائگاں
ثابت ہو رہی ہے۔ نہ سینٹ پال کی تفسیروں اور تشریحوں کا
مشغلہ نہ ارسطاطالیس کا مطالعہ کارگر ثابت ہوتا ہے نہ
روحانی ریاضت ہی کچھ کام آتی ہے۔ میرا سوہانِ روح بڑھتا
ہی جاتا ہے تم اپنی وفاشعاری سے میری اس کش مکش کو اور
زیادہ کیوں بڑھاتی ہو؟ مجھے دور بھاگنے اور چُپ سادھنے
کے طعنے کیوں دیتی ہو؟ پُرانے میل ملاقات کی یاد کیوں تازہ
کرتی ہو؟ ان سے تو میری اذیت میں اور اضافہ ہوتا ہے
کاش ہم منطق و فلسفے سے ایسا سبق حاصل کر سکتے کہ ہم کو اپنے
جذبات پر قابو ہو سکتا! یہ کش مکش، یہ ہیجان، یہ بے بسی تا بکے!
ہماری روحیں دانش و بینش سے بیگانہ اور جذبات کے
ہاتھوں بے بس، اس ویرانے میں کب تک بھٹکتی اور کھوئی
رہیں گی۔ یا الٰہی اس کی کوئی انتہا تو ہونی چاہیئے! مجھے جذبۂ
محبت سے نفرت ہو گئی ہے لیکن محبوب کی ذات اب بھی عزیز تر
ہے۔ ایک سے دوسرے کو کیسے جُدا کروں؟ کیا گریہ زاری:

کرنے سے تنفر پیدا ہو جائے گا؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں؟ لیکن
محبوب کے لئے آنسو بہانے سے میرے دل کو ڈھارس ہوتی
اور عجب قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے۔ رنج و غم کی حالت میں محبت
اور توبہ میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے گناہوں کے
ساتھ محبوب کی یاد اس طرح وابستہ ہوتی ہے کہ دونوں کو
ایک دم علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور شروع شروع میں عشق حقیقی
عشق مجازی کو ایک دم مٹا کر اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نام و نمود
کی بے معنی خواہش، دولت و امارت کا کر و فر، اعزاز و مرتبے
کا ارمان راہِ راست سے میرے قدم ڈگمگانے میں کبھی کامیاب
نہ ہو سکے۔ لیکن تیرے حُسن کے جلوے، تیرے شباب کی پھبن اور
تیری کافر اداؤں نے جو آج بھی میری آنکھوں میں بسی ہوئی
ہیں مجھے گنہ گار بنایا۔ اور اعزاز و تکریم اور نام و نمود کا ارمان
بھی محبت کے جادو کا مقابلہ نہ کر سکا۔ خداوند تعالےٰ نے مجھے
اس کی یہ سزا دی ہے کہ اپنا سایۂ عاطفت مجھ پر سے ہٹا لیا ہے۔
تم تارک الدنیا ہو چکیں، تمہیں دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔
میں بھی پرستار دین ہو کر گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوں، اس
نعمت و برکت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ تو پھر تم میرے عقیدے
اور ایمان اور پرہیزگاری کی آزمائش کیوں کرتی ہو؟ کیا چاہتی
ہو کہ میں اس خانقاہ کو جس میں میں حال ہی میں پناہ گزیں ہوا
ہوں، چھوڑ کر یہاں سے نکل بھاگوں۔ عقیدہ و ایمان کی جو قسمیں
کھائی ہیں اُنہیں توڑ دوں۔ میرے ایمان کا خدا گواہ ہے

وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ میں اس سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ اُس کے عتاب سے کس طرح بچ سکتا ہوں۔ للّٰہ مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو کہ تھوڑی سی تسکین حاصل ہو تم مجھے کوئی بہت بڑی ہستی سمجھتی ہو درآں حالیکہ میں محض ایک ناچیز اور بے بس گنہ گار ہوں میری کمزوریوں پر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جتقدر و اعزاز تمہارے دل میں میرا ہے وہ کس قدر بے معنی ہے۔ میں بارگاہ ایزدی میں سر بسجود ہو کر اور اپنے گناہوں سے تائب ہو کر گریہ وزاری کر رہا ہوں۔ زرا میری اس حالت کو دیکھو اور سوچو کہ کیا اس صورت میں تم پیار اور محبت کا نام زبان پر لا سکتی ہو؟ مجھ سے تقاضائے محبت کر سکتی ہو؟ اگر تم اسے واجب سمجھتی اور اس کی ہمت کر سکتی ہو تو چلی آؤ اور اپنے پاک پیرہن کی دھجیاں اُڑا کر اور اُسے تار تار کر کے میرے اور میرے معبود کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو جاؤ۔ تم میری کمزوریوں سے واقف ہو اور چاہو تو مجھ پر حاوی ہو سکتی ہو لیکن تمہیں یہ زیبا نہیں۔ مجھ سے دور بھاگو اور میری نجات میں حائل نہ ہو۔ میں بڑی عاجزی سے منّت کرتا ہوں۔ اپنی اور تمہاری بربادی اور تباہی بلکہ پرانی محبت کا واسطہ دے کر لجاجت کرتا ہوں کہ مجھے اس آخری بربادی سے بچنے دو۔ تمہارے لئے مجھے بھُلا دینا ہی انتہائے محبت ہوگا میں تمہیں تمام پابندیوں اور واسطوں سے آزاد کر کے خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اب فنافی الحق ہو جاؤ اور پرہیزگاری اور:

پاکیزگی کی ایسی مثال پیش کرو کہ فرشتے بھی تمہارے دامن پر نماز پڑھیں۔ اگر میں تمہیں اس طرح کھو بیٹھوں گا تو سمجھوں گا کہ میں نے سب کچھ پا لیا پھر ہمیں اور تمہیں شرم سے سرنگوں ہونے کی کوئی وجہ نہ رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ تقاضائے ایزدی یہ ہے کہ ابی لار ایلوئی سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور اُسے بھول جائے اور ایلوی بھی ابی لار سے نہ صرف قطع تعلق کرے بلکہ اس کے نام کو بھی اپنی زبان پر نہ آنے دے نہ اس کا تصور دھیان میں لائے۔ یاد محبت کا بھلا دینا ہی سب سے بڑی توبہ ہے اور یہ مشکل بھی ہے۔ محض اپنی خطاؤں کے اعتراف کرنے اور اُن کے دھرانے سے کام نہیں چلتا۔ بعضوں کو اس میں بھی ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ خدا تک پہونچنے کا تو ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اس محبوب کو کہ جس کے اب تک والہ و شیدا رہے اپنی یاد سے بالکل بھلا دیں اور اس خداوند کریم کا کہ جس سے اب تک غافل رہے ہر وقت دھیان کریں۔ یہ مشکل ضرور ہے لیکن اگر ہم اپنی نجات چاہتے ہیں تو کرنا پڑے گا۔ تمہاری مشکل آسان کرنے کے لئے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ کیسا ظلم روا رکھا اور تمہیں کیسا فریب دیا؟ اگر تم اس پر غور کروگی تو تم کو مجھ سے آسانی سے تنفر ہونے لگے گا اور مجھے بھلا دینے میں دشواری نہ ہوگی۔ تم نے کبھی غور کیا کہ میں نے دین و مذہب کی قسمیں کھانے کے لئے پہلے تمہیں کیوں آمادہ کیا.

اور آپ پیچھے کیوں رہا۔ سنو! جب عیش و عشرت کا دروازہ مجھ پر بند ہو گیا اور میں اپنی جوانی کھو بیٹھا تو رشک و حسد کی آگ میرے دل میں اس طرح بھڑکنے لگی کہ دنیا کے تمام مردوں کو میں اپنا رقیب سمجھنے لگا۔ محبت میں بے اطمینانی بہت اور بھروسہ کم ہے۔ میری نظر ہر لحظہ اپنی کمزوریوں اور عیوب کی جانب جاتی تھی اور وہ مجھے ڈرانے لگتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ تمہارا دل تو محبت پر ایسا مائل ہو گیا ہے کہ بلا محبت کئے نہیں رہ سکتا۔ جب میں محبت کے قابل نہ رہا تو تم کسی نہ کسی اور سے محبت کرنے لگو گی۔ دیکھتی ہو رشک کی آگ انسان کو کیا کیا باور کرا سکتی ہے۔ میں تمہاری طرف سے پورا اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے تمہیں ترغیب دی کہ تارک الدنیا ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں باور کرایا کہ ہماری اور تمہاری محبت کی سلامتی کے لئے لازمی ہے کہ تم دین و مذہب کی پناہ کو۔ سوائے کونونیٹ کے کوئی دوسری جگہ مجھے تمہارے لئے محفوظ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ تم میرے کہنے سننے میں آسانی سے آگئیں تمہارے اس بھولے پن نے میری آتش رشک کو کچھ دھیما کیا میں تمہیں خدا کی بھینٹ چڑھا رہا تھا مگر خوشی سے نہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ تمہاری دائمی خوشی اور نجات کا باعث ہو گا بلکہ صرف اس خیال سے کہ اگر میں تمہارے شباب کا حظ نہیں اٹھا سکتا تو یہ کسی دوسرے کے تصرف میں بھی نہ آئے۔ ڈاکو جب کسی مال و اسباب کو اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تو اسے

غارت کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ اور یہی میری نیت تھی کہ جو میں نے تمہیں کونوینٹ میں زندہ درگور رہنے کی ترغیب دی۔ جب تم راضی ہوگئیں تو مجھے اس طرف سے یک گونہ اطمینان ہوا۔ پھر بھی رہ رہ کر شک وشبہ مجھے ستاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ عورتوں کے ارادے پختہ نہیں ہوتے۔ ان میں استقلال نہیں ہوتا۔ جب تک تم بارگاہِ ایزدی میں حلف ہی نہ اٹھا لو اور پرستارِ دین بننے کی قسم نہ کھالو تب تک محض خانقاہ کی چہار دیواری تمہیں کیسے محفوظ رکھ سکتی ہے میں تمہیں اپنے سے اسی وقت جدا کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا کہ جب خدا ہی تمہارا ضامن ہو۔ میں اس کوشش میں سرگرداں رہا اور تمہیں ہر طرح سے ترغیب دیتا رہا...... تم راضی ہوگئیں لیکن تم نے جب تک بارگاہِ ایزدی میں سجدہ کرنے اور پرستارِ دین ہونے کا حلف اٹھا ہی نہ لیا میں برابر ڈرتا رہا کہ تمہارا حسن و شباب میرا منشا پورا نہ ہونے دے گا۔ اور تم دنیا سے پھر دل لگانے لگو گی۔ اس دنیا میں دل لبھانے والی باتوں سے قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ پھر بائیس سال کی عمر میں جو عین شباب اور آزادی کا زمانہ ہوتا ہے۔ کوئی دنیا سے منہ موڑا کرتا ہے؟ پر تم نے کر دکھایا۔ دیکھو میں نے تمہارے ساتھ کیسی زیادتی کی تھی کہ تمہیں ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھتا رہا کیا یہ دوستی اور محبت میں زیبا ہے؟ نہیں نہیں! ایسی خود غرضی تو بمنزلہ دغا، فریب اور قتل کے ہے۔ میں اس کا مجرم ہوں جو دوستی دشمنی کے مترادف ہو، وہ ہر طریق

سے غصہ و حقارت کی سزاوار ہے۔ یہ بھی سُن لو کہ جب مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ تم وفا و محبت کے کوچے میں ثابت قدم ہو۔ تم محض میری ہو اور میری ہی ہو کر رہنا چاہتی ہو، جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ تم میری محبت کی ہر طرح اہل ہو تو میں پھر تمہاری جانب سے لاپروا ہو گیا۔ سمجھنے لگا کہ تمہاری محبت سے سبکدوش ہو گیا۔ یقین کرنے لگا کہ میں تمہیں خدا کے سپرد کر چکا اور اب وہ تمہارا خبرگیراں رہے گا۔ مجھے کچھ واسطہ نہیں۔ میرے رشک و حسد کی آگ بھی بالکل بجھ گئی۔ جب صرف خدا رقیب رہ گیا تو پھر کس کا ڈر۔ اس سکون کی حالت میں دست بہ دعا تھا کہ وہ تم کو اب میری نگاہوں اور میرے دھیان سے بھی اوجھل کر دے۔ مگر میری دعائیں اور میری قربانی سچی اور بے لاگ نہ تھیں محض ذاتی خود غرضی اور مایوسی کا نتیجہ تھیں اسی لئے قبول نہیں کی گئیں۔ اور مجھے یہ سزا دی گئی کہ محبت کی آگ میں میں آج تک جھلس رہا ہوں۔ تمہاری قسموں کا بار اور اپنے جوشِ جذبات کے گناہوں کا بوجھ نہ معلوم کب تک مجھے اس عذاب النار میں پھونکتا رہے گا۔

اگر تم معصومیت اور عاجزی کے ساتھ درگاہِ ایزدی میں گڑگڑاتیں اور خدا تمہاری لجاجت پر رحم کر کے تمہارے دل دماغ کو اپنی روشنی سے منور کرتا تب بھی مجھے بڑی تسکین ہوتی مگر صورتِ حال تو یہ ہے کہ ہم دونوں ناجائز محبت کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ محبت ہمارے پاک پیراہنوں پر بدنما داغ ہے

اور ہمارے عقیدے اور عبادت میں خلل انداز ہے۔ جب میں اس کا
خیال کرتا ہوں تو خوف سے لرزنے لگتا ہوں۔ جب تک اللہ کے
کرم و بخشش کی ضیا ہماری طبیعتوں کو منور نہیں کرتی ہم اس
محبت کے زہر سے بے خبر رہتے ہیں اور اس کا نشہ ہم کو بے خود
رکھتا ہے اور ہم اسی بے خودی میں دیوانہ رہتے ہیں جب ہم کو
اپنی غلطیوں اور گناہوں کا احساس ہونے لگتا ہے اور ہم اپنی
تباہی و بربادی پر گریہ و زاری کرتے اور تائب ہوتے ہیں
تو نجات کی طرف ہمارا پہلا قدم بڑھتا ہے خدا ہماری کمزوریوں
پر ترس کھا کر پہلے ہمیں اپنی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے اور جب
ہم توبہ و گریہ و زاری کرتے ہیں تو ہمیں راہ راست دکھا کر
سہارا دیتا ہے۔ ہم بھی زندگی کے اسی دور سے گزر رہے ہیں۔
اسی سے دل کو دھارس دو کہ ہم سے پہلے اور پاک اور برگزیدہ
ہستیوں پر بھی یہ وقت گزر چکا ہے۔

جب پرستار دین ہونے کی قسمیں کھا کر تم نے اپنے چہرے
پر نقاب ڈالی تو خدائے تعالےٰ نے اپنی بخشش و کرم سے تمہیں
اپنی جانب کھینچا۔ جب تم نے دنیا والوں کو آخری الوداع کہی
تو تمہاری نگاہیں صلیب پر جمی ہوئی تھیں۔ تم نے چھ ماہ تک نہ
مجھے کوئی خط لکھا نہ پیغام بھیجا۔ میں تمہاری اس خاموشی کی قدر کرتا
تھا۔ تمہیں الزام کیسے دے سکتا تھا۔ پر خود تمہاری تقلید نہیں
کر سکا۔ میں نے تمھیں لکھا لیکن تم نے جواب نہ دیا۔ اُس وقت
تمہارے دل تک پہونچنے کی سب راہیں بند تھیں لیکن اس عشرت

کا دروازہ اب پھر کھل گیا۔ خدا نے تمہارے دل میں گھر کیا
تھا لیکن وہ تمہیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ تمہاری آزمائش
کر رہا ہے اس کا پیچھا کرو اور واپس بلاؤ بغیر اس کے سہارے
کے ہم ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتے۔ ہم محبت کے پھندوں میں
اس بری طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ خود بخود آزاد نہیں ہو سکتے
ہماری عشق بازی اور شرارتوں کا چرچا ملک بھر
میں پھیلا ہوا ہے مقدس مقامات میں بھی ان پر اشارے اور
کنائے ہوتے ہیں۔ ہماری دیوانگی ایک افسانہ بن گئی ہے
اس کی حکائیتیں اور روایتیں بڑے شوق سے لکھی جاتی اور
پڑھی جاتی ہیں۔ شباب کی شوخیاں ہماری مثالیں پیش کر کے
معذرت کرتی ہیں۔ من چلے لوگ اپنے جرموں اور گناہوں
کو سنگین نہیں سمجھتے۔ دیکھو ہم کیسے بُرے مجرم ہیں اور ہماری
توبہ کس قدر بعد از وقت ہے۔ کم از کم اس کو بے لاگ اور
سچا تو ہونا چاہیئے تا کہ فرانس والے جو اس افسانہ سے اب
تک لطف اندوز ہوتے رہے اس توبہ سے بھی متاثر اور
مرعوب ہوں۔ ان گناہوں کا کفّارہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ
ہم شرم سے سرنگوں ہوں۔ ہمارے دل توبہ سے ٹوٹے ہوں
اور اپنی گریہ وزاری سے ان بدنما دھبّوں کو جو ہمارے پیرہنوں
پر پڑے ہیں، ہم دھو کر صاف کر سکیں۔ بارگاہِ ایزدی میں
یہ نذرانہ جب ہی قبول ہو گا کہ جب ہماری توبہ سچی ہو گی اور
ہماری گریہ وزاری میں عجز اور درد ہو گا۔

ایلوئی! اس غلبۂ جذبات اور شرمناک کیفیت ہیجان سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کرو اور یاد رکھو کہ بجز خدا کی لگن لگانے کے کسی دوسرے کا دھیان بھی کرنا تمہاری پاکدامنی پر بدنما داغ ہے۔ میں تو یہاں ان کم بخت راہبوں سے گھرا ہوا ہوں کہ جو میری علمیت کی شہرت سے مرعوب اور میرے جسم کی لاغری اور چہرے کی پژمردگی سے بیزار رہتے ہیں۔ انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں ان کی تربیت و اصلاح پر متوجہ نہ ہو جاؤں میری گریہ و زاری ان ضعیف الاعتقادوں کو دھڑکے میں ڈالے رہتی ہے۔ میری حالت پر ترس کھاؤ اور اپنے تئیں آزاد کرلو۔ مجھے لکھو اور اطمینان دلاؤ کہ آئندہ سے تم اپنے مقدس لباس کا احترام کرو گی۔ خدا سے ڈرو گی کہ وہ تمہیں تمہاری کمزوریوں سے چھٹکارا دے۔ اُس سے لو لگاؤ گی کہ وہ تمہیں نیکی کا راستہ دکھائے۔ دین و ملت کی زنجیروں کو سینے سے لگاؤ گی اور عجز و انکسار سے قبول کرو گی تاکہ ایزد تعالیٰ ان کے بوجھ کو ہلکا کرے۔ غلبۂ جذبات، انسانی فطرت میں شامل ہے۔ تشدد بے کار ہے۔ اپنی کمزور بہنوں کی فردگزاشتوں کا اپنی کمزوریوں سے اندازہ لگاؤ اور اپنی تباہی و بربادی کا دھیان کرکے ان کی مدد کرو۔ تم ملت دین کی رہبر اور امام ہو جذبات کی غلام نہ بنو۔ تمہیں ملکاؤں اور شہزادیوں پر حکمرانی کرنی ہے پہلے اپنی ذات پر قابو حاصل کرو۔ اپنے اوسان اور ہوش و حواس پر اختیار پانا سیکھو۔ اگر تمہاری طبیعت کا

میلان محبت کی جانب ہے تو یہ نذرانہ عینی حق کے حضور میں پیش کرو۔ جو زندگی عیش و عشرت میں ضائع کی ہے اس سے تائب ہوا اور میں نے جو تمہیں گمراہ کیا تھا اُس کے لئے مجھے لعنت ملامت اور سرزنش کرو۔ مجھے اپنا دوست نہیں بلکہ دشمن سمجھو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جو شخص تم سے دیکھنے اور ملنے کی معمولی سی امید بھی چھینے لیتا ہے اور تم سے دور بھاگتا ہے وہ تمہارا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو دشمن ہی ہے اور تمہیں اُسے اپنا واقعی دشمن سمجھنا چاہیئے۔ لیکن محبت جب سچی ہوتی ہے تو اُس کا چھوڑنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ تارک الدنیا ہو جانا نسبتہً بہت آسان ہے۔ محبت کا چھوڑنا بڑا کٹھن ہے، میں اس بے وفا اور فریبی دنیا سے ایسا متنفر ہوتا ہوں کہ میں اس کا دھیان بھی کبھی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ لیکن میرا چنچل من تمہارے لئے ہر وقت بے قرار رہتا ہے اور تمہیں کھو کر میرے دل میں وہ ٹیس رہتی ہے کہ جسے عقل و دلیل کسی طرح دور نہیں کر سکتی۔ گو میں نے تمہیں جو کچھ لکھا ہے اپنی کمزوری اور کم ہمتی سے میں اُس سے مکر رہا ہوں لیکن تم اُسے نقش کا الحجر بنا لو اور جب کبھی میرا دھیان کرو تو اُسی بے اعتنائی سے کہ جس کا میں سزاوار ہوں۔ یاد رکھو کہ جب تک میں دنیا کی رنگ رلیوں میں مست رہا میں نے تمہارے بھولے بھالے دل کو بہکا کر اور ورغلا کر تمہیں بربادی اور تباہی میں پھنسایا۔ تمہارا انجام خراب میری وجہ سے ہوا۔ میں بھی تباہ ہوا ہم دونوں ہی غارت ہو گئے۔

لیکن مشیت ایزدی ایسی تھی کہ بالآخر ڈوبتے ڈوبتے اب ہم کنارے آ لگے ہیں۔ بعضوں کو خدائے تعالے تباہی و بربادی میں ڈال کر ہی نجات دلاتا ہے۔ اب تو ایسا کرو کہ تمہاری دعائیں تمہاری گریہ و زاری تمہاری عقیدت و عبادت ہی میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔ گو میں اب تک عشق مجازی کا گنہ گار ہوں۔ یا الٰہی! اگر تو چاہے تو میرے دل میں عشق حقیقی پیدا کر کے میری آنکھوں کو اپنے نور اور روشنی سے منور کر سکتا ہے۔ ایلوئی کی سچی محبت اسی میں ہے کہ اُس کو دھیان سے دور کر کے اُسے تیرے بخشش و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ خط میرا آخری خط ہے اور آخری خطا۔ الوداع! اگر میری مٹی ہیس کی بدی ہے تو میں ہدایت کر جاؤں گا کہ میری لاش تمہاری خانقاہ میں پہونچا دی جائے۔ تم مجھے اب اسی صورت میں دیکھو گی۔ اُس وقت رونا نہیں۔ میرے لئے رونا ہے تو اسی وقت دل کھول کر رو لو اور اس آگ کے شعلوں کو جو مجھے پھونکے دے رہے ہیں اپنے زار و قطار آنسوؤں سے کسی طرح بجھا دو۔ میری لاش دیکھ کر جو خوف ورقت تم پر طاری ہو گی وہ تمہارے عقیدے اور ایمان کو مضبوط بنائے گی اور میری موت تمہیں بتائے گی کہ محبت کر کے کن باتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس پر راضی ہو جاؤ گی کہ مرنے کے بعد تمہیں بھی میرے ہی پہلو میں دفنا دیا جائے۔ میری تربت تمہاری قربت سے زینت و شہرت پائے گی۔ یہ ٹھنڈے راکھ کے ڈھیر شعلے نہیں بھڑکا سکتے ان سے کسی بے عنوانی کا اندیشہ نہیں۔

مہاتما ریولیوشنری کے روپ میں

یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے

نصف صدی سے زیادہ ہونے آئی کہ پنڈت بشن نرائن در نے اپنی مشہور یادگار تصنیف (Signs of the Times) (آثار زمانہ) میں ایک جگہ لکھا تھا کہ "ہم آج ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں لیکن کیا طرفہ تماشا ہے کہ انقلابی ہستیاں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اس طوفانی ہنگامہ کے زمانہ میں ایسی جوشیلی اور طوفانی حُبّ الوطنی کی ضرورت ہے جو بے باک اور بے لاگ ہو۔ مصلحت اندیشی سے دور بھاگے اور نڈر ہو کر اُن تمام بُرائیوں اور اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے جن سے آج ہماری سوسائٹی دوچار ہے۔ سیاسی عذابوں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ سوشل نقائص ناقابل برداشت ہوتے جاتے ہیں اور رسم و رواج کے مظالم بھیانک شکلیں بنا بنا کر ہمیں ڈرا رہے ہیں۔ جب تک تمام قوم یک دل و یک جان ہو کر مجاہدوں کی طرح اُن کے خلاف علم بغاوت نہیں اُٹھائے گی ہماری نجات مشکل ہے۔ ہم کو ایسی مسکین حب الوطنی کی ضرورت نہیں جو اس ست جگ کے انتظار میں جب اصلاحوں کے پودے عرق گلاب سے سینچے جائیں گے چُپ لگائے بیٹھی رہے بلکہ ہمیں ایسی جوشیلی حب الوطنی کی ضرورت ہے کہ جو "مصلحت بین و کار آسان کن" کے مقولے کو ٹھکرا کر روندی اور کچلی ہوئی امیدوں و ارمانوں کے قافلہ کی ہمت و حوصلہ سے

رہبری کرے۔ کیا عجب ہے کہ ایک دن وہ آئے کہ "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" یعنی اس سرزمین سے کوئی ایسا مرد خدا اُٹھے جو زندگی کی مکروہات کی زنجیروں کو توڑ کر اور جو حوادث روزگار کے تھپیڑوں کا مردانہ وار مقابلہ کرکے قوم کی آنکھوں کا تارا، ہمارے ارمانوں کا سہارا، اور دنیا کی امیدوں کا مرکز بن جائے۔ گو اس وقت کسی ایسی ہستی کی ہندستان کے افق پر پرچھائیں بھی دور دور دکھائی نہیں دیتی۔"

اس پیشین گوئی کے ایک نسل کے زمانہ کے بعد جنوبی افریقہ کے ساحل سے ایک نیا چاند نکلا کہ جس کی کرنیں رفتہ رفتہ چودہویں رات کے چاند کی طرح تمام ہندستان پر اپنی روشنی پھیلانے لگیں۔ اور جس نے ہماری آنکھوں کو تراوٹ اور شگفتگی دی۔ نہ صرف یہی بلکہ جس کی آب و تاب کی جھلک نے تمام دنیا پر اپنا نور برسایا۔ پچھلے تقریباً پانچ ہزار برس میں کتنی ہی ایسی اولوالعزم ہستیاں نمودار ہوئیں جنھوں نے جاہل دنیا کو دین و ایمان کے عقیدے کی روشنی بخشی مظلوم اور بے چین رعیت کو استبداد، جبر اور زبردستی کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر آزادی اور ترقی کی راہیں دکھائیں۔ ایسے ایسے جنرل اور ریولیوشنری دنیا کے اسٹیج پر آئے جنھوں نے تہذیب و تمدن کے دھاروں کا رُخ بدل دیا اور ایسے ایسے مفکر اور مدبر پیدا ہوئے کہ جنھوں نے رعیت کے لئے امن و امان اور ترقی و تہذیب کی بساط بچھائی۔ ان کے نام نامی آج باوجود ایک زمانہ گزرنے کے لوگوں کی یاد سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن مہاتما گاندھی

کے سے پایہ کی کوئی دوسری الوالعزم اور عجیب وغریب ہستی دنیا کے پردہ پر اب تک نمودار نہ ہوئی یا تاریخ کے ہزاروں برس کے پُرانے صفحوں میں اس مقابلہ کا کوئی دوسرا نام کہیں دکھائی دیتا ہے، اس کا باور کرانا بہت مشکل ہو گا۔ تاریخ و صحافت کے مشاہیر معاصرین نے مہاتما کا تذکرہ گوتم بدھ۔ عیسیٰ مسیح۔ اور فرانسس اسای کے سے مہاتماؤں کے ساتھ ساتھ کیا ہے۔ اناتول فرانس کی زبانی دہرائی ہوئی ایک روایت ہے کہ "زمانہ" سلف میں جب روما کی شہرت اور اس کی شہنشاہیت اپنے انتہائی عروج پر پہونچی ہوئی تھی تو پونٹس پائیلیٹ نامی ایک رومن جو کچھ زمانہ پیشتر جوڈیا کا گورنر رہ چکا تھا۔ ایک دن اپنے ایک پُرانے دوست سے اتفاقاً ملا، بچھڑے ہوؤں میں بات چیت ہونے لگی اور پچھلے زمانہ کی یادیں تازہ ہوئیں۔ اس کے دوست نے کہا کہ شام کی عورتیں بلا کا ناچ ناچتی ہیں۔ ایک نے تو اسے جوانی کے زمانہ میں اپنا بندۂ بے دام بنا لیا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ کم بخت غائب ہو گئی۔ عرصہ بعد سُنا کہ وہ گیلیلی کے کسی جادوگر یا معجزہ کار کی منڈلی میں شامل ہو کر نکل گئی۔ اس جادوگر کا نام یسوع تھا۔ وہ نزارتھ کا رہنے والا تھا۔ بعد میں وہ کسی جرم میں ماخوذ ہوا اور پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ پائنٹس! "کیا تمہیں اس کا کچھ دھیان آتا ہے؟" پائنٹس پائیلیٹ کی بھویں تنیں۔ اس نے اپنا سر کھجلانا شروع کیا گویا اپنے حافظہ کی تہوں کو اُلٹ پلٹ رہا ہے۔ اس کے بعد ایک لمحہ خاموش رہا اور پھر بولا۔ "یسوع نزارتھ کا رہنے والا! مجھے تو اس نام کے کسی

شخص کا دھیان آتا نہیں،" مگر مہاتما گاندھی کے زمانۂ زندگی میں ہی
اُن کا نام ہندستان کے بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور آج اطراف
عالم میں کوئی ملک یا قوم ایسی نہیں جہاں اور جس میں ان کے نام کے
گُن نہ گائے جاتے ہوں۔ ریوریوشنری (انقلابی) کی حیثیت
سے اُنیسویں اور بیسویں صدی کے دو ہی نام ایسے ہیں جنہیں گاندھی
کے نام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ اول میٹزینی اور دوسرا
لینن۔ میٹزینی آزادی کی دُھن کا متوالا تھا لیکن وہ کبھی میدان
انقلاب کے کارزار میں نہیں اُترا۔ اطالیہ کی آزادی حاصل
کرنے کا سہرا جنرل گیری بالڈی اور اس کے ایک سو سو ہیروں
اور جاں نثاروں کے سر رہا۔ لینن نے کارل مارکس کے فلسفہ کی تعبیر
انقلاب روس کی شکل میں عملی طور سے پیش کی اور آج ایک دُنیا
لینن کے نام کا کلمہ پڑھنے کے لئے تیار نظر آتی ہے۔ لیکن لینن نے
روس کی شہنشاہیت کا تختہ بزور شمشیر اُلٹا اور لینن کے نام لیوا بھی
آج دُنیا کو کمیونزم کا سبق اور کلمہ زبردستی قتل و خون اور غارتگری
کے راستوں سے پڑھا رہے ہیں۔ برخلاف اس کے مہاتما گاندھی
انقلابی اور ریوریوشنری ہوتے ہوئے بھی ستیہ گرہ کے قائل
تھے اور اُنہوں نے تمام عمر ستیہ گرہ کو ہی نعرۂ انقلاب بنایا۔
اور اس کا سبق اپنے ہموطنوں اور دنیا کو کسی کی جان لے کر نہیں
بلکہ اپنی جان پر کھیل کر اور کھو کر سکھایا۔ گاندھی جی جس پایہ کے
مہاتما اور ریوریوشنری تھے اُسی مرتبہ کے پالیٹیشین بھی تھے۔
کامل ایک نسل تک ہندستان کی حکومت اور دولت برطانیہ

کے مدبرین اور وزراءان کے چشم وابرو کے اشاروں پر کان لگائے اور منتظر جائے بیٹھے رہتے تھے اور سلطنت کے ایوانوں اور حکومت کی مجلسوں کی رونق اور کامیابی کا دارومداران ہی کی تنہا ذات پر منحصر تھا۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ مہاتما تین روپوں میں دنیا کے سامنے آئے۔ ایک تو سنت اور سادھو کے روپ میں۔ دوسرے ریوولیوشنری (انقلابی) اور تیسرے پالیٹیشین کی حیثیت سے اور تینوں روپوں میں ان کا سروپ بدر کامل کی طرح پورا اور روشن دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ دُنیا ہے اور وہ بھی دُنیا کے ہی انسان تھے۔ کھلے میدانوں اور سبزہ زاروں کی صاف آب و ہوا چھوڑ کر جب کوئی شہروں اور قصبوں کے گنجلک اور گندی گلیوں میں سے گزرے گا تو خاک دھول اور کیچڑ کے چھینٹے اور دھبے دامن پر ضرور پڑیں گے۔ چنانچہ مہاتما نے جب پالیٹکس کا گنجلک راستہ اختیار کیا تو ان کی شہرت بھی ان دھبوں اور داغوں سے بچ نہ سکی۔ بڑے بڑے مفکر اور مدبر جن میں خود ان کے ہموطن اور انگریز مخالف شامل تھے لاجواب منطق سے ان کی لغزشوں اور بظاہر خامیوں پر اُنگلیاں اُٹھاتے اور قائل کیا کرتے تھے لیکن آج جب وہ دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں تو ان کے مخالفوں کو بھی اس کا اقرار ہے کہ مہاتما کا دامن ہمیشہ بے داغ اور اُجلا رہا۔ غلط فہمی خود ان کی تھی۔ مہاتما کی پوری شخصیت اور ان کی مکمل ہستی پر سرسری نظر ڈالنے کے لئے ایک ضخیم کتاب لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ ایک معمولی مضمون میں اس کا خیال کرنا

یعنی دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہوگا۔ میں تو اس مضمون میں صرف اس پر کہ مہاتما انقلابی کے روپ میں کیسے نظر آتے ہیں، چند اشارے کروں گا۔ اب تک دُنیا کی تاریخ میں جتنے بھی ریوولیوشن (انقلاب) ہوئے ہیں سب میں انقلاب کا مقصد کسی خاص اُصول و عقیدہ کی بناء پر حکومت کا تختہ اُلٹنے اور سوسائٹی کا شیرازہ بدلنے کا ہوتا رہا ہے۔ انقلابی اپنے عقیدے اور مقصد کی دُھن کا تو پکا ہوتا ہے لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جھوٹ اور سچ اچھے اور بُرے کی تمیز اس میں نہیں ہوتی۔ اب تک ہر انقلاب بزورِ شمشیر اور دشمن کو خون و خاک میں ملا کر کیا گیا ہے اور جب جب انقلابیوں میں خود مت بھید ہوا ہے تو ایک دوسرے کے زیر کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا ہے۔ یہی انگریزی انقلاب میں ہوا۔ یہی فرانسیسی اور روسی انقلاب میں۔ چارلس اول کا سر قلم کیا گیا۔ لوئی شانزدہم اور اس کی ملکہ میری آنٹینٹ کو بر سر دار چڑھایا گیا اور شہنشاہ روس بھی تباہ و برباد ہوا۔ آج ان کا اور ان کے حوالیوں موالیوں کا کہیں پتہ اور نشان بھی نہیں ملتا۔ لیکن جب آپ مہاتما گاندھی پر بحیثیت انقلابی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ہستی دُنیا کی دوسری مشہور انقلابی ہستیوں سے بالکل انوکھی اور نرالی نظر آتی ہے۔ مہاتما کے یہاں انقلاب کی اول شرط "اہنسا پرمو دھرما" ہے۔ سچائی، اہنسا اور انسانیت کا جذبہ انقلاب کی تہ میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مہاتما نے تو انقلاب کے معنی ہی بدل دئے۔ وہ "انقلاب زندہ باد" کے نہیں بلکہ ستیہ گرہ کے قائل تھے۔ ستیہ گرہ ہی اُن کا

مقصد اور یہی اُن کا آلہ تھا جس سے وہ حکومت اور سوسائٹی دونوں
میں انقلاب برپا کرنے کے حامی تھے اور کمال یہ ہے کہ وہ ایسے انقلاب
برپا کرنے میں کامیاب ہوئے ۔ فرانسیسی انقلاب کے فلسفہ کی بنار
روسو نے ڈالی اور روبسپیر نے اس طوفان کو برپا کیا۔ کارل مارکس
نے بالشوک عقیدے کی تشریح کی لیکن لینن نے روسی انقلاب کو تکمیل
تک پہونچایا۔ یہاں مہاتما گاندھی ستیہ گرہ کے عقیدے کی بنار
ڈالنے والے تھے ۔ اُنھوں نے ہی انقلاب کی عمارت کی بنیادیں
رکھیں۔ منزل بہ منزل اس کی دیواریں اُٹھائیں اور بالآخر اُس
کی تکمیل کی ۔ مہاتما گاندھی نے مقاومت مجہول اور انارکزم کا سبق
تھورو اور ٹالسٹائے سے لیا تھا۔ لیکن ان اصولوں کی بنار پر
ستیہ گرہ کے عقیدے اور تحریک کی بنار اُنھوں نے خود ڈالی۔
مقاومت مجہول کا اصول کمزور کا ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ اُنھوں نے
ستیہ گرہ کو ایک بہت بڑی روحانی طاقت کے ذریعہ پرورش
کرکے مضبوط ہاتھوں کا آلہ کار بنایا۔ مقاومت مجہول انفرادی
مقابلہ کا ہتھیار تھا۔ گاندھی جی نے پہلی مرتبہ جنوبی افریقہ میں
ستیہ گرہ کے ہتھیار کو اجتماعی تحریک کی شکل دی۔ اور وہ بڑی
حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ ہندستان آکر چمپارن کھیرا
اور بردولی میں ستیہ گرہ کی آزمائش کی اور یہاں کی کامیابیوں
سے اُن کو اپنے اس ہتھیار کے چلانے میں بھروسہ اور اعتقاد
پیدا ہوا۔ چمپارن۔ کھیرا۔ اور بردولی کی تحریکیں مقامی تھیں۔
لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کی نان کوآپریشن کی تحریک تمام ملک پر محیط ہوئی۔

اور اس معنی میں یہ مہاتما گاندھی کا پہلا ستیہ گرہ کا معرکہ تھا۔ جب یہ انقلابی ہنگامہ شباب پر آرہا تھا تو چوری چورا کے خونی فساد نے مہاتما کا ماتھا ٹھنکا دیا اور اُنہوں نے اپنی یہ غلطی تسلیم کرکے کہ لوگ ابھی ستیہ گرہ کے معنی پوری طرح نہیں سمجھے ہیں تحریک کو روک دیا۔ خود اُن کے پیروؤں میں گاندھی جی کے خلاف بدگمانی پیدا ہوئی اور لوگوں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مہاتما نے ایسا کیوں کیا۔ بات یہ تھی کہ عوام نے ابھی ہنگامۂ انقلاب اور ستیہ گرہ کا پورا فرق نہیں سمجھا تھا۔ مہاتما کا انقلاب ستیہ گرہ کا ماتحت تھا اور اُنہوں نے جو کچھ کیا اپنے عقیدے کی پیروی میں کیا۔ دوسری تحریک سول نافرمانی کی تھی جو ۱۹۳۰ء میں مہاتما نے شروع کی۔ ڈانڈی مارچ کہنے اور دیکھنے میں معمولی سی بات معلوم ہوتی تھی لیکن مہاتما کی ذات سے اس کا چرچا چار دانگ عالم میں ہوا۔ مہاتما حکومت کا تختہ اُلٹنے اور اپنی بات منوانے میں کامیاب نہ ہوئے لیکن اُس نے انہیں بددل اور مایوس بھی نہیں کیا۔ وہ مصالحت پر راضی ہو کر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ آخر کار نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بنایا گیا۔ اور اس کے ماتحت صوبوں میں الکشن ہوئے کانگریس کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی اور اکثر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور برطانوی حکومت نے ہندستانیوں کے مطالب کو ٹھکرا کر اور اُن کی رائے کا احترام کئے بغیر ہندستان کو جنگ میں ڈھکیل دیا۔ کانگریسی حکومت نے برطانوی حکومت

کے اس فیصلہ سے کے احتجاج کے طور پر استعفے دیدئے اور ملک میں انقلاب
کے آثار نمایاں ہونے لگے ۔ مہاتما اب انگریزی سرکار سے بالکل مایوس
اور عاجز آ گئے تھے مگر وہ بڑے نباض بھی تھے۔ قوم کے دل کی دھڑکن
اُن کی اُنگلیوں کے نیچے دبی معلوم ہوتی تھی ۔ اُنھوں نے قوم کے مزاج
اور وقت کی پُکار کا صحیح اندازہ لگایا اور پہلے انفرادی ستیہ گرہ
اور پھر عالمگیر انقلابی ستیہ گرہ کا حکم لگایا۔ ملک میں جو طوفانی
انقلاب برپا ہوا، انگریزی سرکار دوران جنگ میں اس طوفان
سے جیسی ہراساں ہوئی اور عالم بدحواسی میں اس نے جو ہوتی اور
اَن ہوتی غیر انسانی حرکتیں کیں، اُن کی یاد ابھی اس طرح تازہ ہے
کہ یہاں دُھرانے کی ضرورت نہیں ۔ مہاتما نے جس وقت "کر گزرو
اور جان دے دو"، کا منتر پڑھ کر پھونکا تھا اُس وقت ان کے
دماغ میں انقلاب کا کیا نقشہ تھا ؟ ان کے کیا منصوبے تھے اور
وہ کیا کرنا چاہتے تھے ؟ یہ تو نہ اُس وقت کسی کو معلوم تھا نہ اس کے
بعد اب پتہ چلانے کا کوئی امکان ہے۔ توڑنے پھوڑنے، تہس نہس
کرنے، اور جلانے اور پھونکنے کی وارداتوں کی بنا پر جو اس بغاوت
میں عام طور سے ہوئیں، مہاتما پر ان کا الزام لگانا محض بہتان ہے۔
مہاتما کی زندگی اور کارناموں کا ہر ورق روز روشن کی طرح ہندستان
کی پچھلی ایک نسل کی تاریخ میں کھلا پڑا ہے۔ اور آج تمام دُنیا اس کی
قائل ہے کہ وہ "اہنسا پرمو دھرما"، کے عقیدے کی ، جیتی جاگتی
مورت اور بولتی چالتی تصویر تھے۔
آیندہ کا مورخ اس ہنگامۂ انقلاب کے متعلق کیا لکھے گا یہ تو

ابھی برسوں آگے کی بات ہے تاہم اس انقلاب میں کیا کیا ہوا اور کس کس طرح ہوا اس کا مختصر سا حوالہ یہاں بے محل نہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں تان کو آپریشن اور سنہ ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی کی تحریک سے سنہ ۱۹۴۲ء کی بغاوت اس معنی میں بالکل مختلف تھی کہ اس کی گھنگھور گھٹائیں ہندستان کے ہر حصّے اور ہر کونے پر چھائی ہوئی تھیں۔ دیسی ریاستیں بھی اس دفعہ انقلاب کی آگ سے بچ نہ سکیں پچھلی تحریکوں میں بھی ہمارے نوجوان طلبا نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکل کر جھنڈے بلند کئے تھے اور نعرے بھی گلے پھاڑ پھاڑ کر لگائے تھے لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ ان کو یہ پتہ چلا کہ بغاوت کس کو کہتے ہیں اور انقلاب کیا چیز ہے۔ اس دفعہ انہوں نے خود بھی اس کا مزہ چکھا۔ اور حکومت کو بھی مزہ چکھایا۔ بغاوت نام ہے ہیجانی کیفیت کا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء کی بغاوت میں بھی ہیجانی کیفیت کی کمی نہ تھی لیکن باوجود اس کیفیت کے بغاوت کا تمام پروگرام ہوش و حواس کے ماتحت عمل آیا جنگی محاذ کے راستوں اور خبروں کا روک دینا اور تہس نہس کرنا۔ سرکاری رسد اور جنگی سامان کا توڑنا پھوڑنا اور تباہ کرنا اس بغاوت کا منشاء اور مسلک تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہندستان کی رعیت اس عالمگیر جنگ میں شریک نہیں ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل کی گئی۔ یہ ضرور ہے کہ انتہائے جوش کی کیفیت میں جہاں ان ہنگاموں اور وارداتوں میں ہزاروں ہندستانی گھائل ہوئے اور سیکڑوں ہی جان سے مارے گئے وہاں چند پولیس والے بھی قتل ہوئے۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہ ایسی بغاوت تھی جس میں رعیت لاکھوں کی تعداد میں

شریک تھی اور پولیس اور فوج نے ایسی ایسی حرکتیں کی تھیں جنھیں دیکھ کر
انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے تو ایسے ہنگامہ میں چند پولس والوں
کا مارا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کچھ لوٹ مار بھی ہوئی۔ لیکن بغاوت
سرکار کے خلاف تھی اور سرکاری مال کا ہی نقصان ہوا۔ دُنیا کے
پردے پر بیسیوں ہنگامے انقلابی نوعیت کے برپا ہوئے تاریخ
ان کے دردناک حادثوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ہندستان
کے اس انقلاب کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی جس کی مثال تاریخ کے
صفحوں میں ملنی بہت مشکل ہے۔ ایک طرف نہتّی رعیت تھی۔ نہتّی
اس لئے نہیں کہ رعیت کو ہتھیار میسّر آنے ناممکن تھے بلکہ اس لئے
کہ اس نے اپنے "ننگے فقیر" سے کشت و خون نہ کرنے کا قول ہارا
تھا۔ ملک کے مختلف مقاموں اور پچاسوں معرکوں میں قوم کے نونہالوں
نے جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے ترنگا جھنڈا بلند کیا،
اپنے سینے پولس اور فوج کی گولیوں اور سنگینوں کے آگے کھول دئے
اور جھنڈے کو اُس وقت تک نیچا نہ ہونے دیا جب تک بیہوشی
یا موت نے ہاتھوں کو مردہ نہ کر دیا۔ اس پر بھی یہ آن بان تھی کہ
اگر ایک کے ہاتھ سے جھنڈا گرتا تو دوسرا نعرہ لگا کر اسے بلند کرتا
اور موت کے گھاٹ اُتر جاتا۔ حتّٰی کہ یا تو پولس تھک کر بیٹھ رہتی
یا باغیوں کے جم غفیر میں جانباز لڑکیاں اور لڑکے ختم ہو جاتے۔
اس طرح سے قوم کے نونہالوں نے جھنڈے کی شان اور ستیہ گرہ
اور مہاتما کی لاج قائم رکھی۔ بہرحال اس انقلاب کے زلزلہ نے
انگریزی حکومت کے آہنی قلعہ کی بنیادوں کو کچھ اس طرح ہلا یا کہ

اس کے ستون اور گنبد ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگے ہند کے ایک حصے یا کونے میں نہیں بلکہ تمام بر اعظم میں لاکھوں انسانوں نے آزادی اور انقلاب کا پرچم اُٹھایا اور انگریزی حکومت کی مشین کے پرزے تہس نہس ہونے لگے۔ لیکن یہ مہاتما کے ہی اسم اعظم پھونکنے کا معجزہ تھا کہ اس وسیع ملک کے ہزاروں میل کے حدود اور رقبہ میں انگریزی قوم کے کسی ایک فرد کا بھی بال بیکا نہ ہوا۔ دُنیا کے انقلابوں میں کوئی ایک انقلاب بھی ایسے حیرت انگیز معجزے کی دوسری مثال پیش نہیں کرسکتا۔ مہاتما نے بچپن ہارا تھا کہ مجھے صرف انگریزی حکومت سے بیر اور نفرت ہے لیکن انگریزی قوم کا میں بہی خواہ ہوں اور اس سے مجھے محبت ہے۔ اُنہوں نے اپنے قول کو پورا کیا اور قوم نے بھی ان کی شرم رکھی اور دنیا آج اُن کی قائل ہے اور مانتی ہے کہ "امن۔ صلح اور آزادی کا ایسا فرشتہ دنیا میں سیکڑوں برس بعد آیا تھا اور اب پھر سیکڑوں برس تک ایسے کسی دوسرے انسان کے پیدا ہونے کی اُمید نہیں[1]"

آخر میں اسی سلسلہ میں ایک بات اور کہنی ہے وہ یہ کہ مہاتما نے جو ستیہ گرہی جدوجہد اور انقلاب کا نیا اور انوکھا راستہ اپنے ہموطنوں کو دکھایا اور جس مسلک پر اُنہوں نے قوم کو کامل ایک نسل تک چلایا وہ کہاں تک کارگر اور کامیاب ثابت ہوا۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ یعنی ایک تو یہ کہ قوم نے ستیہ گرہی انقلاب کے راستہ کو کہاں تک اور کس حد تک قبول کیا اور دوسرے یہ کہ

[1] لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ آخری وائسرائے ہند

یہ ستیہ گرہی انقلاب کا ہتھیار ہمیں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں کسی حد تک مؤثر ثابت ہوا۔ کوئی عقیدہ، ایمان یا اصول یا مسلک ہو۔ کوئی انسان یا چیز ہو اس کا مکمل صورت میں ہمارے سامنے آنا محض ایک معیاری خیال ہوا کرتا ہے ورنہ ارتقائے تمدن کی رفتار میں ہر بات تدریجی ہوا کرتی ہے اور انسان ایک منزل کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری منزل طے کیا کرتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔

جو کچھ اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ آزادی کی جد و جہد کی ہر منزل میں اور بالخصوص آخری ہنگامۂ بغاوت میں قوم نے بہت بڑی حد تک ستیہ گرہی انقلاب کی شان اور ارمان کو پورا کیا۔ جس ہنگامہ انقلاب میں لکھو کھا رعیت نے آزادی کا پرچم اُٹھایا اور ملک کے ہر حصے اور گوشے سے علم بغاوت بلند ہوا اس ہنگامۂ بغاوت میں کسی ایک انگریز کا بھی بال بیکا نہ ہوا۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں۔ یہ ستیہ گرہی انقلاب کی کامیابی کی بیّن علامت اور دلیل ہے سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء کے ہنگامۂ بغاوت نے ہماری آزادی کا راستہ کہاں تک صاف کیا اور یہ ہمیں آزادی حاصل کرنے میں کہاں تک معین و کارگر ہوئی؟ ہندستان میں تو بجز ان انے گنے لوگوں کے جن کی نظریں آئینی اصلاحات اور آئینی جد جہد سے کسی حالت میں بھی اونچی نہیں اٹھیں اور جنہوں نے آخر دم تک انگریزی حکومت کے قول و فعل پر ہر حالت میں بھروسہ کیا، قوم کا یہ یقین اور عقیدہ ہے کہ اگر مہاتما نے ۱۹۴۲ء میں ستیہ گرہی انقلاب کا ہنگامہ برپا

نہ کیا ہوتا تو انگریزی حکومت ہرگز بھی اس طرح سے ہندستان چھوڑ کر اور ہمیں آزاد کر کے نہ جاتی۔

یہ صحیح ہے کہ ہر مسئلہ کے کئی پہلو ہوا کرتے ہیں ایسا ہی اس صورت میں بھی ہے۔ برطانیہ نے جرمنی پر فتح پائی لیکن اس مثال کے مصداق ہو کر کہ جو ہارا وہ مرا جو جیتا وہ ہارا۔ برطانیہ کا کس بل اس جنگ میں کام آچکا تھا۔ اس کے پور کھڈ ھیلے ہو گئے تھے اس کا دیوالہ نکل گیا تھا۔ اسے اپنے ہی جینے کے لالے پڑ رہے تھے۔ دوسروں کو کون سنبھالتا۔ غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ انگریز بیویاں اور مائیں اپنے مردوں اور نونہالوں کو سات سمندر پار اب کٹنے مرنے کے لئے بھیجنے کو تیار نہیں تھیں۔ دو عظیم جنگوں نے انہیں کچھ تجربہ کرا دیا تھا۔ یہ بھی مانا کہ اختتام جنگ کے بعد لیبر پارٹی کی وزارت برسر اقتدار آئی وہ سلجھے دماغ کے لوگ تھے ان کی نیتیں اچھی تھیں۔ اُن میں جبر و تعدی اور حکومت کا وہ جذبہ نہ تھا جو اُن کے پیش رووں میں پایا جاتا لیکن اصلیت یہ تھی اور اُس کا اقبال خود پارلیمنٹ میں ہوا کہ اب جب تک کہ ہندستان کو از سرِ نو فتح نہ کیا جائے (اور اس کی طاقت نہیں) وہاں اطمینان سے حکومت کرنی غیر ممکن ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہوتے ہیں کہ سنہ ۱۹۴۲ء کے ستیہ گرہی انقلاب نے انگریز قوم کو یہ بات ذہن نشین کرا دی تھی کہ ہندستان کے لوگ اب انگریزی حکومت سے منحرف ہو چکے اور بغیر آزادی حاصل کئے نہ رہیں گے۔ "عصمت بی بی از بے چادری"، ہندستان سے اُنہیں مجبوراً رخصت ہونا پڑا اور ہمارا ستیہ گرہی انقلاب مؤثر

اور کارگر ثابت ہوا۔ ذیل کا اقتباس توجہ کا محتاج اور بہت کچھ معنی رکھتا ہے: "اس ایجی ٹیشن کے سلسلے میں اُس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا مفصل بیان اس کتاب کے پچھلے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ اس پر ابھی نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہندستانی تو قطعی یقین کرتے ہیں کہ اُنھوں نے مہاتما کے ہی مسلک اور ستیہ گرہی انقلاب کے راستے سے آزادی حاصل کی ہے اور میں بذاتِ خود بھی اس کا قائل ہوں۔ ستیہ گرہی انقلاب کی جدوجہد نے ہی ہندستان کی روح کو بیدار کیا اور برطانیہ کی حکومت کی قوت کو سلب کیا اور خونی بغاوت کے ہنگامہ کو روک دیا۔ ایک نامور فرانسیسی فسانہ نگار اور ادیب نے اپنے ایک زندۂ جاوید شاہکار میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہاں ارتقائے تمدن کی درندانہ بے رحمیوں کا نام ہی انقلاب ہے لیکن جب اس کے مظالم سر سے گزر چکتے ہیں تب ہی ہم کو اس کا احساس ہوتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ مخلوق کی تادیب اور سرزنش تو بے شک ہوئی پر انسانی نسل نے شاہراہ ترقی میں دو چار قدم بھی ضرور آگے بڑھائے۔" ارتقائے تمدن کی اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری روز مرہ کی زندگی کی بھی اصلیت یہی ہے۔ بچوں کو مار مار کر پڑھایا جاتا ہے تب کہیں زندگی میں آگے چل کر وہ کچھ ترقی کرتے اور اونچی جگہوں پر پہنچتے ہیں۔ یہ تو سب سچ ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی نسل کو ابھی ارتقائے تمدن کی بہت سی

ل۔ مہاتما گاندھی از پولک بریلسفورڈ اور لارڈ پیتھک لارنس۔ اقتباس لارڈ پیتھک لارنس کی تحریر سے کیا گیا ہے۔

سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ ترقی کی راہیں مسدود نہیں ہوتی ہیں۔ زندگی کا ہر لمحہ حرکت اور تبدیلی کا حامل ہوتا ہے۔ فی زمانہ تو دُنیا ایک مسلسل انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ نئی نئی منزلیں دکھائی دیتی اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ انسانی نسل اپنی پُرانی تاریخ اور روایتوں سے ہی سبق حاصل کرتی ہے اور اسی راستے سے ترقی کی منزل پر پہنچتی ہے۔ مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہی انقلاب نے آزادی اور ترقی کا ایک نیا اور سیدھا سادا راستہ دنیا کی مخلوق کو دکھایا ہے عقل و بصیرت سے بعید نہیں کہ مخلوق عالم اپنی پُرانی اور بے ڈھنگی رفتار کو چھوڑ کر اس سیدھے سادے راستہ کو اختیار کرے اور اس پر چلنے لگے۔ اب نہیں دو چار برس یا دس بیس سال بعد سہی۔ کون جانتا ہے اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے! تاہم ممکن ہے!!۔

راجہ رام موہن رائے

اور

برہمو سماج

راجہ رام موہن رائے قصبۂ رادھا نگر میں ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے
آپ کے والدین ویشنومت کے شریف برہمن خاندان سے تھے۔ اس زمانہ
کے رواج کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم علاوہ بنگالی زبان کے فارسی
اور عربی میں ہوئی تھی۔ صوفیاء کرام کے فلسفہ اور تصوف کے رنگ میں
ڈوبی ہوئی شاعری کا آپ کو شروع ہی سے شوق تھا آپ کے مذہبی خیالات
پر اسلام کے عقیدۂ توحید کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا جس کا ثبوت اس سے ملتا
ہے کہ آپ نے کم سنی ہی کے زمانہ میں جو سب سے پہلے تصنیف شائع کی
وہ "تحفۃ الموحدین" تھی۔ یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی اور اس کا دیباچہ
عربی میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلام کی سیرت لکھنے کا بھی
ارادہ کیا تھا لیکن اس کو پورا نہ کر سکے۔ پرانے مذہبی رسوم اور عقیدوں
سے بیزار ہو کر آپ اکثر اپنے والد سے ان پر بحث کیا کرتے تھے لیکن جو
جواب ملتا تھا اس سے تشفی نہ ہوتی تھی۔ فطرت سے دماغ سنجیدہ اور
نکتہ رس پایا تھا اور کم سنی ہی سے تلاش حق میں بے چین رہتے تھے۔
پندرہ ہی برس کی عمر میں گھر چھوڑ کر تلاش رہبر میں نکل کھڑے ہوئے
کہا جاتا ہے کہ تین چار سال ہماچل اور تبت کے کہساروں میں سرگردان

رہے۔ باپ کے اصرار سے گھر واپس آئے۔ لیکن تھوڑے ہی دن کے قیام کے بعد پھر نکل کھڑے ہوئے تقریباً دس برس بنارس میں رہ کر سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور ہندو فلسفہ اور عقائد کا گہرا مطالعہ کیا راجہ رام موہن رائے کے والد ۱۸۰۳ء میں سورگباش ہوئے۔ جس کے بعد آپ نے مرشد آباد میں بودوباش اختیار کی۔ رسالہ "تحفۃ الموحدین" وہیں سے شائع کیا۔ ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۴ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں رہے آپ کے افسر اعلیٰ ایک صاحب مسٹر ڈگبی تھے۔ وہ آپ کے قدر دان بھی تھے اور دوست بھی۔ اسی زمانہ میں آپ نے انگریزی زبان اور انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کیا اور اس پر قدرت حاصل کی۔ علاوہ فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی کے آپ عبرانی اور یونانی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ جس زمانہ میں آپ مسٹر ڈگبی کی ماتحتی میں رنگ پور میں دیوان یا سررشتہ دار تھے، آپ نے اپنے دوست و احباب کے ساتھ مذہبی مسائل پر مباحثوں کا سلسلہ شروع کیا آپ کا موضوع بحث بالعموم بُت پرستی کے خلاف ہوتا تھا۔ رنگ پور کے پُرانے خیال کے طبقہ میں اسی بنا پر آپ کی مخالفت شروع ہوئی لیکن جو بات آپ کو زیادہ شاق گزری وہ خود آپ کی والدہ کی مخالفت اور ناراضی تھی۔ آپ کا خاندان کیسے پُرانے خیال کا تھا اس سے ظاہر ہے کہ جب آپ کے بڑے بھائی کا ۱۸۱۱ء میں انتقال ہوا تو اُن کی بیوی ستی ہونے پر مجبور کی گئیں لہٰذا ستی ہوئیں۔ اس حادثہ کا آپ کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا اور اس روز سے آپ نے یہ پیمان باندھا کہ جب تک ستی کی رسم کو قطعاً بند نہ کرا دیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ آپ کی تقریباً ۲۰ سال

کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ لارڈ ہیسٹنگ کے زمانہ میں یہ قبیح رسم بالآخر
قانوناً ممنوع ہوگئی۔ ملازمت سے دست بردار ہوتے کے بعد آپ نے
۱۸۱۴ء میں کلکتہ میں بود و باش اختیار کی اور اس وقت سے بقیہ تمام عمر
رفاہ عام کے کاموں اور اور مذہبی اور سوشل اصلاح کی کوششوں میں
گزار دی۔

گو راجہ رام موہن رائے کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ
برہمو سماج کا قائم کرنا اور رسم ستی کے خلاف جہاد کرکے اس کا ترک
کرانا تھا لیکن اُن کی کوششیں اُنہیں دو بڑے کاموں تک محدود
نہ تھیں۔ وہ پہلے ہندستانی تھے جنھوں نے اس ملک میں انگریزی
تعلیم کی اشاعت کی سرگرم کوشش کی۔ ۱۸۱۶ء میں اُنھوں نے اپنے
دوست مسٹر ڈیوڈ ہیر (DAVID HARE) کے مشورے اور
امداد سے بنگال کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سر ہائڈ ایسٹ
(Sir Hyed East) سے یہ درخواست کی کہ ہندو لڑکوں کے
لئے ایک ایسا کالج کھولنا چاہئے کہ جس میں انگریزی تعلیم انہیں اُصول
پر دی جائے کہ جیسے یورپ میں۔ چیف جسٹس نے اس خیال کو پسند کیا
اور گورنر جنرل سے اس تجویز پر عمل کرنے کی اجازت چاہی اس کے
حاصل ہونے کے بعد ہندو لیڈروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور تقریباً
نصف لاکھ روپیہ کے کالج کے لئے چندہ بھی جمع ہوگیا۔ لیکن جب ا
ہندوؤں کو یہ معلوم ہوا کہ اس تحریک کا سنگ بنیاد رکھنے والے
راجہ رام موہن رائے ہیں جو رسم ستی اور بُت پرستی کے خلاف
جہاد کرنے کی وجہ سے کافی مطعون ہو چکے ہیں تو ان لوگوں نے

چیف جسٹس سے درخواست کی کہ ان کو کمیٹی میں نہ رکھا جائے اور نہ
اُن سے چندہ ہی لیا جائے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد راجہ رام موہن رائے
کمیٹی سے خود ہی علٰحدہ ہو گئے اور ۱۸۱۷ء میں یہ کالج قائم ہوا جو
پہلے ہندو کالج کہلاتا تھا اور اب پریسیڈنسی کالج کے نام سے مشہور ہے۔
اسی زمانہ میں اُنہوں نے خود ایک انگریزی اسکول ہندو طلبار کے لئے
قائم کیا۔ جس کا نام اینگلو ہندو اسکول (ANGLO HINDOO SCHOOL)
تھا۔ مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور نے جو برہمو سماج کے نامی لیڈر اور رابندر
ناتھ ٹیگور کے والد تھے اسی اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی تھی ۱۸۲۳ء
میں جب کونسل آف ایجوکیشن (Council of Education)
نے یہ طے کیا کہ اس ایک لاکھ روپیہ سے جو گورنمنٹ نے ہندو طلباء
کی تعلیم کے لئے دیا تھا کلکتہ میں ایک سنسکرت کالج کھولا جائے
تو راجہ رام موہن رائے نے اس زمانہ کے گورنر جنرل لارڈ ایم
ہرسٹ (Lord Amherst) کے نام ایک پُر زور اور مدلل
عرضداشت بھیجی کہ سنسکرت کی تعلیم کی جگہ جس کی ہندستان میں
کمی نہ تھی یہ روپیہ انگریزی تعلیم کی اشاعت میں صرف ہونا چاہیے۔
اور گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ بجائے اورنیٹل زبانوں
کی تعلیم کے اس ملک میں انگریزی تعلیم اور نئی روشنی کی اشاعت
ہو۔ اس وقت تو ان کی یہ صدائے احتجاج نقار خانہ میں طوطی
کی آواز ہو کر رہ گئی لیکن بالآخر لارڈ میکالے کی تحریک پر گورنمنٹ
ہند نے یہی پالیسی اختیار کی۔

: راجہ رام موہن رائے پریس کی آزادی کے بھی بڑے

حامی تھے اُنہوں نے خود دو ہفتے وار اخبار شائع کئے تھے۔ ۱۸۲۱ء
میں سمواد کومودی (समवाद कौमुदी) بنگالی زبان میں اور
۱۸۲۲ء میں "مرأۃ الاخبار" فارسی میں نکالا۔ اس کا تعلق کچھ عرصہ
تک بنگال ہیرالڈ (HERALD) سے بھی رہا جو ۱۸۲۹ء میں چار
زبانوں میں یعنی انگریزی۔ فارسی۔ ہندی اور بنگالی میں شائع ہونا
شروع ہوا۔ کلکتہ سے ایک اخبار کلکتہ جرنل (CALCUTTA
JOURNAL) انگریزی زبان میں نکلتا تھا۔ مسٹر جیمس سلک بکنگھم
(Mr James Silk Buckingham) اس کے ایڈیٹر تھے۔
اس اخبار نے کئی معاملوں میں حکومت وقت کی سختی سے نکتہ چینی
کی۔ اس کی پاداش میں حکومت وقت نے اسے بند کرا دیا اور مسٹر
بکنگھم کو حکم دیا کہ وہ دو ہفتہ کے اندر اندر ہندستان سے چلے
جائیں۔ اسی سلسلہ میں گورنمنٹ نے ۱۴ مارچ ۱۸۲۳ء کو ایک آرڈیننس
(Ordinance) شائع کیا کہ جس کی رو سے ہر اخبار
نکالنے والے پر لازمی تھا کہ وہ اس کے لئے لائسنس حاصل کرے۔ جو
آرڈی ننس جاری کئے جاتے تھے وہ باضابطہ قانون تسلیم نہیں
کئے جا سکتے تھے جب تک کہ سپریم کورٹ کے روبرو پیش ہو کر اُن کی رجسٹری
نہ ہو جائے۔

راجہ رام موہن رائے نے اس آرڈی ننس کے خلاف سپریم
کورٹ میں ایک عرضداشت پیش کی اور دو وکیل عدالت میں اس کی
پیروی کے لئے مقرر کئے۔ سپریم کورٹ نے اسے محض اس وجہ سے
خارج کر دیا کہ عدالت میں معاملہ پیش ہونے سے پہلے ہی چیف جسٹس

حکومت سے وعدہ کر چکے تھے کہ یہ آرڈیننس رجسٹرڈ ہو جائیں گے۔
اس پر انہوں نے شہنشاہ برطانیہ کی بارگاہ میں اپیل کی لیکن وہ بھی
پریوی کونسل نے ۱۸۲۵ء میں رد کر دی۔

جیسا کہ پیشتر بیان کیا جا چکا ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی
زندگی کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے برہمو سماج قائم کیا۔ عہد
جدید میں وہ پہلے ہندستانی تھے کہ جس نے مذہبی اور سماجی اصلاح کا بیڑا
اٹھایا تھا اور اس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی۔ انہوں نے کسی نئے مذہب
یا دین کے پیشوا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ ان کا شمار پیشوایان دین میں
ہو سکتا ہے۔

ان کی عظمت یہ ہے کہ وہ پہلے مدبر اور مصلح قوم تھے کہ جنہوں نے
ایسے زمانہ میں جب قوم اور ملک پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ہم کو
شمع ہدایت روشن کر کے صحیح راستہ بتایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو مذہب
اور شاستر بت پرستی کی تلقین نہیں کرتا نہ ایسی قبیح رسمیں کہ جیسے ستی
وغیرہ اس کی رو سے جائز ہیں۔

ہندو مذہب کی بنیاد ویدوں اور اپنشدوں پر ہے اور ہم کو
ان کی پیروی کرنی چاہیئے۔ کرم کانڈ کی ریتیں اور پروہتوں اور
گرودں نے جو پھکنڈ پھیلائے اور جن کی آج ہم اندھی تقلید کر رہے
ہیں وہ ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم سے کوسوں دور ہیں ہمیں
اس راستہ کو کہ جس پر ہم بھٹک رہے ہیں چھوڑ کر اپنی قدیم راہ پر
چلنا چاہیئے اور سوسائٹی کی شیرازہ بندی کے لئے ضروریات زمانہ
اور عقل سلیم جن اصلاحوں کی ضرورت ہمیں محسوس کراتی ہیں اُن پر

عمل کرنا چاہیئے۔ انہیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اسی غرض سے انہوں نے ۱۸۱۵ء میں آتمیا سبھا کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی تھی جس میں مذہبی مسائل پر غور و بحث ہوا کرتی تھی اس میں کلکتہ کے اکثر نامور احباب مثل پرنس دوارکا ناتھ ٹیگور برج موہن معظم دار۔ ہلدر بوس اور راج نراین سین وغیرہ شامل تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ویدانت سوتر لکھا تھا۔ منڈک اور منڈک اپنشد کا بنگالی اور انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور مخالفین کے قائل کرنے کے لئے انگریزی اور بنگالی میں کئی رسالے شائع کئے۔ Defence of (Hindu Theism اور A Sound Defence of Monomeratiqal of Vedas- خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایک جانب تو ان کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے ہم قوموں کو غلط رسم و رواج اور مذہبی گمراہی سے ہٹا کر اصلاح اور وحدانیت کے راستہ پر لائیں۔ دوسری جانب یہ کہ وہ ہندوؤں کو عیسائی ہونے سے بھی بچائیں۔

چنانچہ ان کو نہ صرف اپنے ہم قوموں کی بیجا مخالفت کا مقابلہ کرنا تھا بلکہ عیسائی مشنریوں کے پروپگنڈے کا بھی جواب دینا تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۵ء تک یعنی تقریباً دس سال وہ اسی عظیم جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہے۔ آتمیا سبھا پہلی ہی کوشش تھی۔ ناکام رہی۔ مگر اس سے وہ بددل نہ ہوئے اور ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج قائم کی اور اس کی بنیادیں پختہ کیں۔ اس کے فوراً بعد ہی ان کو ولایت

یعنی انگلستان جانا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے پیشتر تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست کی ہوائے تند نے سلطنت مغلیہ کی ٹمٹماتی ہوئی شمع حیات کو گل نہیں کیا تھا۔ خاندان بابر کا آخری جانشیں برائے نام "شہنشاہ" کہلاتا تھا۔ بادشاہ نے اپنی شکایتوں کی دادرسی کے لئے رام موہن رائے کو راجہ کے خطاب سے سرفراز کرکے اپنا سفیر مقرر کیا تھا تاکہ وہ ولایت جاکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی بارگاہ میں دفتر شکایات پیش کرکے ملتجی رحم و کرم ہوں۔ گورنر جنرل نے تو تسلیم نہیں کیا کہ رام موہن رائے راجہ کے خطاب کے مستحق یا سفیر ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کو ولایت جانے سے بھی باز نہیں رکھا۔ چنانچہ ۱۸۳۰ء میں راجہ رام موہن رائے ولایت گئے۔ ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ "شہنشاہ دہلی" کے وظیفہ میں تین لاکھ سالانہ کا اضافہ ہوگیا۔ ولایت میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ان کی دعوت کی۔ شہنشاہ برطانیہ کی ملاقات کا شرف بھی اُنہیں حاصل ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کا جائزہ لینے کے لئے جو پارلیمنٹری کمیٹی مقرر ہوئی تھی اُس کے روبرو شہادت دینے کے لئے راجہ رام موہن رائے مدعو کئے گئے اور اُنھوں نے ہندستان کے حالات اور اُس کی شکایتوں پر نہایت آزادانہ شہادت دی۔ رسم ستی کے حامی جو گورنر جنرل کے احکام کے خلاف پریوی کونسل میں اس کی نظر ثانی کرانا چاہتے تھے اُن کی کوششوں کے مسترد کرانے کے لئے بھی راجہ رام موہن رائے موقع پر موجود تھے اور اُنھی کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ گورنر جنرل کا حکم پریوی کونسل سے بھی بحال رہا ورنہ

کی رسم قبیحہ ہمیشہ کے لئے قانوناً ناجائز قرار دی گئی اور ترک ہوئی بھارت کا یہ لائق فرزند مادر وطن کی آغوش میں خواب جاوداں کی نعمت سے محروم رہا۔ خاک پاک ہند کے نصیبوں میں یہ سعادت نہ تھی۔ کارکنان قضا و قدر نے اسے ولایت کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں یہ مصلح قوم دار فانی سے کوچ کر کے راہی ملک جاودانی ہوا۔

برہمو سماج ۱۸۲۰ء میں قائم ہوئی۔ اس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے کہ جو ہر قسم اور ہر طریق کی بُت پرستی سے احتراز کر کے توحید پر ایمان لائے تھے۔ اُن کی دعا کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وید منتروں کے ساتھ وعظ ہوتا تھا اور بھجن بھی گائے جاتے تھے۔ برہمو سماج کے ٹرسٹ ڈیڈ (Trust Deed) کی رو سے سماج کے مندر میں کسی قسم کی مورت۔ تصویر یا نقش و نگار کا لانا یا رکھنا ممنوع تھا۔ کسی قسم کی قربانی یا نذر و نیاز بھی ناجائز تھی۔ صرف ایسی ہی وعظ تقریریں بھجن یا دعائیں سماج میں ہو سکتی تھیں کہ جن کا تعلق توحید پر ایمان رکھنے اور اس ایمان پر عمل کرنے سے ہو، جن کی غرض ایمان و اخلاق کی پیروی اور تمام دین و مذہب سے رواداری اور آشتی پر مبنی ہو۔ بُت پرستی۔ اوہام پرستی۔ پیری مُریدی اور پُرانے رسم و رواج کے پاکھنڈوں کے خلاف جہاد کرنا اور ایسی اصلاح کی طرف قوم کو توجہ دلانا کہ جو عقل سلیم قبول کرتی ہو۔ اور ہمارے ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم و تلقین کے موافق ہو برہمو سماج کا اولین فرض قرار دیا گیا تھا۔ راجہ رام موہن رائے کی وفات کے بعد برہمو سماج کے معتقدین کا جوش کچھ عرصہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ ۱۸۴۲ء میں مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور نے جو رویندر ناتھ ٹیگور کے والد تھے برہمو سماج میں ایک

تازہ روح پھونکی اور اس کے دائرۂ اثر کو بڑھایا۔ لیکن مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور کے زمانہ میں برہمو سماج کے عقیدوں اور تلقین میں ایک نئی تبدیلی ظہور پزیر ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے کی تلقین یہ تھی کہ تم کو وید اور اپنشدوں کی تعلیم اور عقل سلیم کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اُنھوں نے ہندوؤں کے قدیم وید اور شاستروں کی ہدایت سے روگردانی کو روا نہ رکھا تھا۔
رشی دیوندر ناتھ ٹیگور کی تعلیم و تلقین کلیتاً یہ تھی کہ ہم کو اپنے ضمیر اور عقل سلیم ہی کو اپنا رہبر اور ہادی ماننا چاہیئے۔ برہمو سماجیوں کے لئے وید اور اپنشد وہ مرتبہ نہیں رکھتے جو مسلمانوں کے نزدیک قرآن پاک یا عیسائیوں کے نزدیک بائبل کا ہے۔ اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں تو برہمو سماج کا اثر ضرور بڑھا لیکن عوام سے اس کا تعلق بالکل قطع ہو گیا۔ کیشب چندر سین کے سماج میں داخل ہونے کے بعد سے سماج کے طور و طریق میں اور بھی تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں اُنھوں نے دیوندر ناتھ ٹیگور کی تلقین کو اس منطقی حد تک پہنچایا کہ برہمو سماج کے اراکین میں سے جو چند افراد جنیو پہنتے تھے وہ حق وعظ و تلقین سے خارج کر دیئے گئے اور اکثر ایسے طریقوں اور دستوروں کی جانب پیش قدمی کی کہ جو عیسائیت سے ملتے جلتے تھے۔ اس سے برہمو سماج میں تفرقہ پڑا اور کیشب چندر سین نے پُرانے سماج سے علیحدہ ہو کر ایک نیا برہمو سماج قائم کیا۔ پُرانے برہمو سماج کا نام آدی برہمو سماج ع1ے اور کیشب چندر سین کی سماج کا نام ہندوستان کی برہمو سماج قرار پایا۔ مشاہیر بنگالہ میں کیشب چندر سین کی ہستی بڑی نامور اور ممتاز سمجھی جاتی ہے۔ اُنھوں نے برہمو سماج کے عقیدوں اور اصولوں کی

نہایت جوش سے تلقین کی لیکن ان کے اپنے عقیدوں اور خیالوں میں عیسائیت کا رجحان اس قدر بڑھتا گیا اور اس کا اثر سماج کے طریقوں اور دستوروں پر نمایاں ہونے لگا کہ برہمو سماجی بالآخر اُن سے منحرف ہونے لگے۔ اُنہوں نے ایک کمزوری یہ بھی دکھائی کہ اپنی لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بہار سے اپنے اصول کے خلاف پُرانے رسم و رواج کے مطابق کرنی منظور کر لی۔ اُس روز سے برہمو سماج میں اور تفرقہ پڑا اور بابو انند موہن بوس اور اُن کے رفقاء نے کیشب چندر سین سے علیحٰدہ ہو کر سادھارن برہمو سماج کے نام سے اپنی سماج الگ قائم کی۔

باوصف اس کے کہ برہمو سماج کے بانیوں میں ایسے ایسے رہبرانِ کامل شامل تھے کہ جیسے راجہ رام موہن رائے، مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین۔ اور اس کا معیار، اس کا عقیدہ اور فلسفہ انسانی دماغ کی رفعت و پرواز کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ تحریک ملک میں خاطر خواہ نہیں پھیلی۔ اس کا دائرہ اثر بنگالہ تک محدود رہا۔ اور بالآخر وہاں بھی ٹھٹھر کر رہ گئی۔ عوام نے اسے قبول نہیں کیا۔ اور یہ ہوتا بھی کیسے؟ دُنیا میں وہی مذہب پھیلے اور عوام کے دلوں پر اُن ہی کا سکہ جما کہ جن کے بانیوں نے رسول یا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے پیام کو کلام الٰہی سے منسوب کیا۔ برہمو سماج کے بانیوں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ان کا عقیدہ اور ان کی تلقین تو یہ تھی کہ عقل سلیم کی ہدایت ہر شخص کی زندگی کا دستور العمل ہونا چاہیئے۔ اس کا اپنا ضمیر اس کا ہادی اور رہبر ہو۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ اور بلند خیال

تو اُسے سمجھ سکتے تھے۔ لیکن عوام کی فہم کی رسائی سے یہ بالا تر تھا۔ ایک مصنف نے خوب لکھا ہے کہ برہمو سماج کے اصول عقیدے اور فلسفہ ایسے خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں کا گلدستہ ہیں کہ جو چمن کی تمام کیاریوں سے چُن کر تیار کیا اور سجایا گیا ہو۔ اس کی زینت اس کی خوشبو ہمارے دماغوں کو اُسی وقت تک معطر کر سکتی ہے کہ جب تک یہ پھول کملا نہ جائیں۔ بخلاف اس کے ہمارے پُرانے مذہب اُن تناور درختوں کی مانند ہیں کہ جن کی جڑیں زمین میں گہری چلی گئی ہیں اور جو سالہا سال تک پھلتے پھولتے اور بارآور ہوتے رہتے ہیں۔ برہمو سماج کی تحریک مشرق اور مغرب کے بہترین فلسفہ کا عطر مجموعہ ہے مغرب سے جو نئی روشنی ہندستان میں آنا شروع ہوئی تھی اُس کا اثر اس پر معلوم ہوتا تھا۔ یہ ٹھیٹھ شُدیشی نہیں کہی جاسکتی۔ یہی باتیں تھیں کہ جنہوں نے برہمو سماج کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔

بایں ہمہ برہمو سماج نے ہندستان کے نئے دور میں سماج کے سُدھار کے لئے وہ کام کیا اور ایسا راستہ نکالا کہ جس کی بدولت ہم آج ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ مذہبی سماجی اصلاح کے میدان میں برہمو سماج ہی پہلی تحریک ہے کہ جس نے ہندو مذہب میں مورتی پوجن، ذات پات کی چھوت چھات اور گروؤں اور پروہتوں کے پاکھنڈوں کے خلاف جھنڈا اُٹھایا اور ہر طرح کی اوہام پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ گو برہمو سماج کی تحریک ایک تناور درخت کی طرح بارآور نہ ہو سکی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نئے دور میں راجہ رام موہن رائے کی الوالعزم ہستی ہی ایسی تھی کہ جس نے سب سے پہلے ہندستان کی زمین میں اصلاح کا بیج بویا اور سوا سو برس پہلے کے گھٹاٹوپ اندھیرے

میں ان ہی کی ذات تھی کہ جس نے سب سے پہلے شمع ہدایت روشن کی تھی وہ نہ صرف اولوالعزم مصلح قوم بلکہ اعلیٰ پایہ کے مدبر۔ حامی آزادی اور سچے محب وطن بھی تھے۔ میدان سیاست میں جو مرتبہ دادا بھائی نوروجی کا ہے سماجی اور مذہبی اصلاح کے میدان میں وہی مرتبہ راجہ رام موہن رائے کا ہے۔ ہندستان کبھی ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ ہم جو اپنے مذہب و تمدن کی محفل آج از سرِ نو آراستہ کر رہے ہیں ملک کی آزادی اور ترقی کی جتنی منزلیں بھی ہم نے آج تک طے کی ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے جو ولولے آج ہمارے دلوں میں جوش زن ہیں وہ اسی بزرگ کی ذات بابرکات کا طفیل ہے۔

سوامی دیانند سرستی اور آریہ سماج

(۱)

سوامی دیانند سرستی ۱۸۲۴ء میں ریاست موروی کاٹھیاواڑ، گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصلی نام مول شنکر تھا۔ آپ کے باپ اُما شنکر پُرانے خیال کے برہمن تھے اور شیومت کے پیرو سوامی دیانند کی زندگی کے حالات بہت سیدھے سادے اور مختصر ہیں۔ آپ نے زندگی کے ۲۵ سال ہندو خیال کے مطابق سچّے برہمچاری کی حیثیت سے گزارے اور باقی ۲۵ برس سنیاسی کی حیثیت سے۔ آپ کو ساری عمر ایک ہی دُھن رہی یعنی تلاشِ حق۔ نصف زندگی تلاشِ حق میں گزاری اور نصف اپنے علم سمجھ اور ضمیر کے مطابق حق و راستی کی اشاعت میں۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کی سنسکرت کی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۴ سال کی عمر میں آپ کو ویدوں کے اکثر حصّے برزبان تھے اور سنسکرت کی گرامر سے بھی واقفیت حاصل تھی۔ آپ کی لڑکپن کی زندگی میں دو واقعات ایسے گزرے کہ جنھوں نے آپ کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر کیا۔ اور آپ کی تمام زندگی کی کایا پلٹ کر دی۔ یہ تھے تو بہت ہی معمولی جو کم و بیش ہر شخص کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہیں اور لوگ اُنھیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن سوامی دیانند کو قدرت نے سوچنے والا دماغ

اور دردو والا دل دیا تھا ان پر ان حادثوں کا غیر معمولی اثر ہوا شِورا تری کے
روز آپ اپنے باپ کے ساتھ شوجی کے مندر میں ایا ستیا اور رات جگن
کر رہے تھے اور سب تو آدھی رات کے بعد سو گئے یا اونگھنے لگے
لیکن آپ نے برابر جاگتے رہنے کی کوشش کی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شیوجی
کے لنگ پر جو بیل پتر پھول اور چاول چڑھائے گئے تھے۔ چوہے اور
چوہیاں ایک ایک کرکے لنگ پر چڑھ کر انہیں کترتے اور اٹھائے لئے
جاتے ہیں۔ یہ نظارہ سوامی دیانند سے پیشتر ہزاروں نے دیکھا ہوگا اور
آج بھی ہزاروں یہ تماشا دیکھتے ہوں گے۔ اور صبح اٹھ کر بھول جاتے
ہوں گے۔ لیکن سوامی دیانند نے چودہ برس ہی کی عمر میں دماغ پر زور
دے کر توجہ کی تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ دیوتا ایشور کی شان میں چوہے
اور چوہیاں ایسی گستاخی کس طرح کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد
کو جگایا اور حیرت کے ساتھ ان سے حقیقت آشکارا کرنے پر اصرار
کیا۔ والد نے جو جواب دیا اور سمجھایا اس سے ان کی تشفی نہ ہوئی۔
مندر سے سیدھے گھر گئے۔ اپنا برت توڑا۔ مٹھائی کھائی اور سو رہے۔
اور اسی روز سے بت پرستی کے خلاف اور مورتی کھنڈوں کے
حامی ہو گئے۔ سات برس اور سنسکرت کے علم و ادب اور فلسفہ ویدانت
کے مطالعہ میں گزارے دوسرا واقعہ جو اس زمانہ میں ان پر گزرا وہ ان
کی بہن اور چچا کی موت تھی۔ یہ دونوں ان کو بہت عزیز تھے۔ اس کے بعد
سے وہ زندگی اور موت کے مسائل پر غور کرنے لگے اور ترک دنیا اور
یوگ ابھیاس نیت باندھی۔ جب ان کے باپ کو لڑکے کی طبیعت
کا رجحان معلوم ہوا تو انہوں نے چاہا کہ ان کی شادی کرکے ان کو

دنیا داری کے جھگڑوں میں پھنسا دیں لیکن سوامی دیانند اپنے عقیدے کے سچے اور دھن کے پکے تھے۔ شادی کی تاریخ سے دو چار روز پیشتر گھر چھوڑ کر نکل گئے اور سادھو ہو گئے۔ اُسی روز سے اپنا نام بھی بدل دیا اور دیانند کہلانے لگے۔ یہ ۱۸۴۵ء کا واقعہ ہے کہ آپ جب ۲۱ برس کے تھے پورے ۱۵ برس تک آپ گرو اور حق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ہمالیہ اور وندھیاچل کی چوٹیوں اور گنگا اور نربدا کی وادیوں اور گھاٹیوں کو چھان ڈالا۔ ویدانیت اور یوگ کے علم و عمل پر قدرت حاصل کی اور بہت سے گروؤں اور استادوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن اس سے بھی تسکین نہ ہوئی۔ آخرش آپ نے متھرا پہونچ کر سوامی ورجانند نامی ایک عالم متبحر کے سامنے زانوے ادب تہ کیا اور ویدوں کا مطالعہ اُن کی ہدایت کے مطابق گہری نظر سے کیا۔ سوامی دیانند ورجانند جی کے پاس ڈھائی برس رہے۔ چلتے وقت گرو نے اُن سے دکھشنا مانگی تو مٹھی بھر لونگیں اُن کے قدموں کے آگے ڈال دیں۔ گرو نے اُن کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دکشنا کے عوض اُن سے یہ پیمان کرایا کہ یہ عمر بھر ویدوں کی تعلیم کا پرچار کریں اور مورتی کھنڈوں کا جھنڈا اُٹھائیں گے اس کے بعد اور اس طرح سے سوامی دیانند اپنے گرو سے رخصت ہوئے ۱۸۶۳ء میں آپ نے ورجانند جی کو چھوڑا اور پھر پورے بارہ برس تک ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے پنڈتوں اور آچاریوں سے بحث و مباحثہ اور شاسترارتھ کئے۔ آپ سنسکرت کے جید عالم تھے۔ آپ کی وجاہت نہایت شاندار تھی۔ تقریر کرنے کا ملکہ حاصل تھا آواز نہایت بلند اور بارعب تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپ کی شخصیت میں کچھ

ایسی کشش اور جادو تھا کہ لوگ آپ کی تقریریں سُننے جوق جوق جمع ہوا کرتے
تھے۔ اس عرصہ میں آپ نے گوالیار۔ جے پور۔ لشکر۔ اجمیر۔ ہردوار اور
صوبجات متحدہ کے اضلاع کا دورہ کیا۔ ویدوں کی پرانی تعلیم اور مورتی
کھنڈوں کا پرچار کیا۔ بنارس میں پنڈتوں سے ایک بہت بڑا شاستزارتھ
ہوا لیکن ان لوگوں نے مباحثہ میں چال بازی اور دھاندلی کی اور مشہور
کردیا کہ سوامی دیانند کو شکست دی۔ بنارس سے آپ کلکتہ گئے اور برہمو سماج
کے لیڈروں سے ملے۔ ان لوگوں نے آپ کی آؤ بھگت کی مگر ان سے
بھی آپ کا اختلاف ہی رہا۔ آپ ویدوں کو الہامی کتاب یقین کرتے اور
اُن کے آگے کسی کی سند نہ مانتے تھے۔ برہمو سماج والے اس کے قائل نہ
تھے۔ بمبئی میں پرارتھنا سماج والوں سے بھی گفتگو رہی لیکن وہاں بھی اختلاف
رہا۔ محض بحث و مباحثہ اور ذاتی طریق و تبلیغ کو ناکافی سمجھ کر آپ نے یہ
ارادہ کیا کہ ویدوں کی تعلیم و تلقین اور دین و ایمان کی اشاعت کے لئے
باقاعدہ کوئی سوسائٹی یا سماج قائم کریں چنانچہ آپ کی کوشش سے اپریل
۱۸۷۵ء میں بمبئی میں آریہ سماج قائم ہوئی۔ اسی زمانہ میں آپ نے
ستیارتھ پرکاش لکھ کر شائع کی اور بنگال کے مشہور برہمو سماجی لیڈر
کے مشورہ اور تاکید سے بجائے سنسکرت کے ہندی میں تقریر کرنے کا دستور
اختیار کیا جس سے آپ کو اپنے پرچار کے کام میں بہت مدد ملی۔ اس زمانہ میں ایک
تبدیلی آپ کے خیالات اور عقیدوں میں یہ ہوئی کہ فلسفہ ویدانیت اور یوگ
کی کریاؤں سے برگشتہ ہو کر اب آپ خالص ویدک دھرم کے معتقد و
مؤید ہو گئے اور اپنا بہت سا وقت ویدوں کے ہندی میں ترجمہ کرنے اور
اُن کی تشریحیں لکھنے میں صرف کیا کرتے اس کے علاوہ اب آپ کا باقی

وقت آریہ سماج کی شاخیں قائم کرنے اور ویدک پرچار میں صرف ہوتا۔ علاوہ صوبجات متحدہ کے مختلف اضلاع کا دورہ کرنے کے۔ آپ دہلی دربار کے موقع پر دہلی گئے اور وہاں سماج کا کام کیا۔ پنجاب والے دہلی سے آپ کو پنجاب لے گئے۔ آپ کی جیسی کچھ کامیابی آریہ سماج کو مقبول بنانے میں پنجاب میں ہوئی کہیں نہیں ہوئی۔ آپ نے فیروز پور۔ راولپنڈی اور جہلم گوجرانوالہ۔ ملتان اور امرتسر میں آریہ سماج کی شاخیں قائم کیں اور لاہور کو آریہ سماج کا صدر مقام قرار دیا۔ اسی زمانہ میں آپ کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ کرنل آلکٹ اور میڈیم بلوسکی نے آپ کی بہت قدر اور عزت کی اور مل کر کام کرنے کا وعدہ کیا۔ دو برس تک سوامی دیانند اور تھوسوفیکل سوسائٹی والوں نے مل کر کام کیا لیکن اختلاف بڑھتے گئے اور بالآخر آریہ سماج سے تھوسوفیکل سوسائٹی کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اپنے عمر کے آخر زمانہ میں راجپوتانہ کا دورہ کیا اور مودوہ۔ بنیرا۔ چتوڑا اور اندور میں آریہ سماج کی شاخیں قائم کیں۔ پھر اودے پور، شاہ پورہ اور جودھپور پہنچے۔ وہاں بھی کامیاب رہے۔ جودھپور میں بیمار ہوئے۔ وہاں سے لوگ آپ کو آبو پہاڑ لے گئے مگر چند ہی روز بعد پھر اجمیر لے آئے اور وہیں ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو ۵۹ برس کی عمر میں قضا کی۔ ایک روایت ہے کہ اُن کو کسی طوائف نے زہر دلوایا جو مہاراجہ جودھپور کی منظورِ نظر اور اُن پر بہت حاوی تھی اور جس کے خلاف سوامی جی نے اپنی تقریروں میں بہت کچھ کہا تھا۔

یوں تو اپنے اپنے حلقوں میں جو لوگ اونچے خاندان سے ہوتے ہیں اور اپنی برادری میں ذی اثر سمجھے جاتے ہیں بڑے آدمی کہلاتے

ہیں ذی اثر حکام اور شہر کے معتدین کا شمار بھی بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے۔
فی زمانہ جو لوگ بہت مالدار اور روپیہ والے ہوتے ہیں عوام کی اصطلاح
میں اُن کو بڑا آدمی کہا جاتا ہے اور علمیت اور قابلیت کے لحاظ سے بھی
جن کا مرتبہ اونچا ہوتا ہے خواص کے دائرے میں اُن کو بھی بڑے آدمی
کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے لیکن انسان کا وقت بگڑنے اور مرنے کے بعد دُنیا
والے اُن کو بھلا دیتے ہیں۔ اصل میں بڑے آدمیوں میں اُن ہی ہستیوں
کا شمار ہو سکتا ہے کہ جو دُنیا میں کچھ کر کے عوام و خواص کے دلوں پر اپنا
ایسا سکہ بیٹھا جاتے ہیں کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ اُن کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔
بڑے آدمیوں کا پہلا جوہر یہ ہوتا ہے کہ اُن کا تخیل وسیع اور اُن میں
جدت ہوتی ہے۔ اُن کی نظر عمیق، معمولی باتوں کی سطح سے گزر کر حقیقت و
اصلیت کی گہرائیوں تک پہنچ سکتی ہے وہ معمولی بات اور خیال میں ایسی
جدت پیدا کرتے ہیں جو ہم کو انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ جو نظارہ سوامی دیانند
نے شوراتری کے مندر میں دیکھا وہ بہت معمولی تھا۔ ہم میں سے بہتوں
نے یہ نظارہ دیکھا ہوگا اور آج بھی ایسے نظارے دیکھتے ہیں لیکن ہم پر
اُن کا اثر نہیں پڑتا۔ سوامی دیانند اس معمولی سی بات کی حقیقت و
اصلیت تک پہنچے اور اسی روز سے بُت پرستی کے خلاف اور مورتی
کھنڈوں کے حامی ہو گئے۔ بڑے آدمیوں کا دوسرا خاصہ یہ ہوتا ہے
کہ وہ اپنے خیال اور عقیدے کے سچے اور پکے ہوتے ہیں۔ دُنیا کی
بڑی سی بڑی طاقت کا خوف حد درجہ کی مصیبت اور اذیت اور بڑی
سی بڑی ہمت کا لالچ اُن کو اپنے خیال اور عقیدہ بدلنے پر مجبور نہیں
کر سکتا۔ ان کا خیال اور عقیدہ اپنی سچائی کے لحاظ سے اٹل ہوتا ہے۔

یا یوں کہئے کہ عقیدے اور ایمان کی سچائی سے اُن کا خمیر گندھا ہوتا ہے۔
تیسری بات یہ کہ وہ دُھن کے ایسے پکے ہوتے ہیں کہ اپنے خیال اور عقیدے
کے پھیلانے اور اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے
ہیں۔ اسی دُھن میں جیتے اور اسی دُھن میں مر جاتے ہیں۔ ان سب پر ان کا
یہ جوہر فوقیت رکھتا ہے کہ ان کی شخصیت میں کچھ ایسا جادو اور ایسا مقناطیس
ہوتا ہے کہ خواص تو خواص عوام بھی بے ارادہ اور بے کوشش اُن کی
طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور اس شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم رہتا ہے۔
یوں تو یہ خاصیتیں اپنی اپنی جگہ اکثر لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔
بعض لوگ سچائی کا پتلا ہوتے ہیں بعض اپنی دُھن کے پکے ہوتے ہیں بعض میں
قوتِ عمل ایسی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ نہایت اونچا مرتبہ حاصل کرتے اور
کچھ کر کے دکھا جاتے ہیں، لیکن ایسی ہستیاں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں۔
جن کی ذات ان جوہروں اور خصوصیتوں کا مجموعہ ہو۔ جو ہستی ان
صفات کا مظہر ہوتی ہے وہ یقیناً بڑا آدمی کہلانے کی مستحق ہے۔ اور
اس میں شبہ نہیں کہ اولوالعزم ہستی کے یہ سب جوہر سوامی دیانند سرسوتی
کی ذات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کا شمار یقیناً
دُنیا کے بڑے آدمیوں میں اور ہندوستان کے بہت بڑے آدمیوں میں
کیا جاتا ہے اور آئندہ بھی کیا جائے گا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے آریہ سماج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوئی۔ سوامی جی
نے اور اُن کے بعد آریہ سماج نے تقریباً ۳۰ یا ۴۰ سال تک بڑی سرگرمی
سے ویدپرچار کا کام جاری رکھا اس کے بعد اب ۴۰ یا ۵۰ سال سے
آریہ سماج نے عملی کام کی طرف بھی توجہ کی۔ پہلا کام تعلیم کی اشاعت تھا۔

شمالی ہند کے اکثر اضلاع میں اسکول اور کالج کھولے۔ یتیم خانہ اور بیوہ آشرم قائم کئے۔ اچھوت ادھار کی بلیغ کوشش کی۔ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اور قحط اور سیلاب کی مصیبتوں میں اپنے بھائیوں کو امداد پہنچائی لیکن اُسی زمانہ میں باہمی اختلافات پیدا ہوئے اور سماج میں دو پارٹیاں ہوگئیں۔ ایک پارٹی کے لیڈر لالہ ہنسراج اور لالہ لاجپت رائے تھے اور دوسری پارٹی کے لیڈر مہاتما منشی رام جو بعد میں سوامی شردھانند کے نام سے مشہور ہوئے۔ اختلاف اس پر تھا کہ تعلیم کس قسم کی دی جائے لالہ ہنسراج کی پارٹی نے لاہور میں (D.A.V. College) قائم کیا اور مروجہ انگریزی تعلیم کی حمایت کی۔ مہاتما منشی رام نے رشی کیش ہردوار میں گروکل قائم کیا اور پرانی ویدک تعلیم کی حمایت کی۔ ایک وجہ اختلاف یہ بھی تھی کہ سماجیوں کو گوشت کھانا روا ہے یا نہیں۔ پچھلے پندرہ یا بیس برس سے سماج نے اپنی توجہ کی باگ زیادہ تر شدھی اور سنگٹھن کی طرف پھیر دی ہے جس کی بدولت دونوں فریقوں کو اختلاف باہمی پس پشت ڈال کر ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

اس عقیدے کے ماننے والے کہ وید الہامی کتاب ہے سماج کے دائرہ کے باہر بہت ہی کم ہوں گے اور اس کے یقین کرنے والے تو غالباً سماج میں بھی سب نہیں۔ تو سماج کے باہر تو شاذونادر ہی ہوں گے۔ کہ موجودہ دور تہذیب میں جو آئے دن ترقیاں ہو رہی ہیں وہ تمام علوم و فنون۔ سائنس کے کرشمے اور ایجادیں جو نئی روشنی کے جلوہ ہائے رنگین ہیں ان سب کا پتہ ویدوں سے لگتا اور ان کا نشان ویدوں میں ملتا ہے۔ زمانہ کی روش کو دیکھتے ہوئے اور تاریخ سے جو سبق

حاصل ہوتا ہے اُس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کا یقین کرنا بھی مشکل ہے
کہ اب مذہبی تبلیغ کا وہ زمانہ باقی رہ گیا ہے کہ جب کسی نئے پیغمبر یا مذہب
پر جمہور ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ایمان لاتے اور اس کا کلمہ پڑھنے
کو تیار ہو جاتے تھے۔ لہذا شدھی کی تحریک سے یہ امیدیں باندھنا کہ وہ
اُن لوگوں کو جو عیسائی یا مسلمان ہو گئے ہیں کسی کثیر تعداد میں پھر ہندو یا
آریہ بنا کر ہندو قوم کی قوت واثر میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی کر دے گی۔
قرین قیاس نہیں۔ میں اپنی رائے عاجزکے مطابق شدھی اور سنگٹھن کی
تحریک کو وہ اہمیت دینے کو تیار نہیں جو بالعموم اُسے دی جاتی ہے میرے
خیال میں تو سوامی دیانند اور آریہ سماج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے
کہ ایسے نازک وقت میں کہ جب ہندو قوم اوہام پرستی جہالت اور کمزوری
سے مفلوج ہو کر قعر مذلت میں پڑی ہوئی تھی۔ جب کہ گروؤں۔ پجاریوں
پروہتوں اور مہنتوں نے اُس کو ذات کے مت بھید چھوت چھات اور
کرم کانڈ کی ریتوں کے جال میں پھنسا رکھا تھا اور اُس پر ایسا اندھیرا چھایا
ہوا تھا کہ کوئی دوسرا راستہ نہ دکھائی دیتا تھا۔ سوامی دیانند نے اس
اندھیر نگری میں وہ مشعل ہدایت روشن کی (احتجاج اور جہاد کا وہ جھنڈا
اٹھایا کہ جس سے مُردہ قوم میں جان پڑ گئی۔ میری نظر میں تو سوامی دیانند کو
آریہ سماج کا وقار اسی وجہ سے ہے کہ یہ ہندو پروٹیسٹینٹزم
(HINDU PROTESTANTISM —) کی تحریک کے اس
سلسلہ کی کہ جسے مہاتما گوتم بدھ نے شروع کیا تھا اور نانک اور کبیر نے
آگے بڑھایا یہ آخری کڑی ہے۔ ہندو قوم کی کیفیت نرم زمین کے بیلدار
کی سی ہے جو بھی باہر سے آیا اُس نے اس غریب کو رُعب داب دکھا کر

دبا لیا اور اُس نے اُس کے آگے سر جھکا لیا۔ حملہ آور سے مقابلہ کرنا ہماری خاصیت نہیں۔ ہم میں برداشت کی قوت تو بہت زیادہ ہے لیکن مقابلہ کی سکت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان یہاں آئے تو اُنھوں نے لاکھوں کی تعداد میں ہمیں مسلمان کر لیا۔ عیسائی آئے تو اُنھوں نے عیسائی بنا لیا۔ ہم ایک بھی عیسائی یا مسلمان کو ہندو نہ بنا سکے۔ آریہ سماج شدھی کی تحریک نے اس کی ایک حد تک تلافی کی۔ لیکن آریہ سماج کا اصل معجزہ تو یہ ہے کہ اس نے نیم مُردہ قالب میں جان ڈال دی۔ ہندو قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہندوؤں کو سکھایا کہ مدمقابل سے گردن اونچی کرکے اور خم ٹھونک کر کس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے۔ آریہ سماج نے اپنی تعلیم و عمل سے یہ جو سبق ہندوؤں کو دیا اس کے احسان سے ہندو قوم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

بایں ہمہ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جہاں سماج نے ہندو قوم میں نئی روح پھونکی۔ اس میں مقابلہ کی سکت پیدا کی۔ اسے پجاریوں اور پروہتوں کے پھندوں سے چھڑایا اور اس کے اوہام پرستی کے جال کو کاٹا وہیں یہ ہماری متحدہ ہندستانی قومیت کے معیار اور ارمانوں کے پورا ہونے میں حائل بھی ہوئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سماج کے لیڈر ہی اُس کے کلیتاً ذمہ دار ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ متحدہ ہندستانی قومیت کے معیار کے حاصل کرنے میں صرف سماج ہی ہمارے راستے میں حائل ہے اور بھی بہت سی رُکاوٹیں ہیں لیکن آریہ سماج بھی ان میں شامل ہے۔ غریب ہندستان کی بیماری ہی کچھ ایسی پیچیدہ واقع ہوئی ہے کہ جو دوا بعض تکلیفوں اور کمزوریوں کے

دور کرنے کے لیے دی جاتی ہے وہی اور نئی اور دوسری تکلیفیں پیدا کردیتی ہے۔ آریہ سماج کی قدامت پسندی کا رویہ اور مسلک نئی روشنی کے پھیلنے اور نئی فضا کے دور میں ترقی کرنے کے راستے میں بھی رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ تاہم آریہ سماج کی خدمات اور قوم کو جگانے میں جو حصّہ اُس نے لیا ہے۔ بھلائی نہیں جاسکتیں۔ آریہ سماج کے متعلق ابھی چند ضروری باتیں اور کہنی ہیں کہ جن کے بغیر یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا۔

یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ قومیں اور تہذیبیں اپنے دور زندگی میں کبھی اقبال اور عروج کی منزلیں طے کرتی ہیں، کبھی ذلت اور پستی کے قعر میں گرتی ہیں، کبھی بنتی ہیں کبھی بگڑتی ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کا دور ختم ہونے پر پھر اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ ہمارا ملک اور ہماری قوم بھی قدرت کے قانون کی اس زد سے نہ بچ سکی، ہم نے بھی بلندی اور پستی کے بہت سے دور اپنی زندگی میں دیکھے۔ یہ بات ہمارے ساتھ البتہ انوکھی ہوئی کہ ہم کو زمانہ مٹا نہ سکا، باوصف اس کے کہ اب ہندو قوم، ہندو دھرم اور ہندو تہذیب پانچ ہزار برس کی پُرانی ہونے کو آئی لیکن اس کی ہستی نہ مٹ سکی۔ بقول اقبال

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ‌ ‌ ‌ برسوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

تاہم پچھلے دو ڈھائی سو برس میں جو وقت ہم پر گزرا ہے، جس ذلت اور پستی کے قعر میں ہم پڑے رہے ہیں اُس کی مثال ہماری تاریخ میں بھی کم ملے گی۔ کمزوری اور نفاق نے ہمارے شیرازے کو بکھیر کر ہمیں پریشان کر رکھا تھا۔ ہماری بے حسی کی یہ کیفیت تھی کہ ہم کو اپنی ذلت کا

بھی احساس نہ رہا تھا۔ ہندو سماج، جات پات کے فرق اور چھوت چھات کی زنجیروں میں ایسا جکڑ گیا تھا، اور پیشوایان دین نے اپنی توقیت قائم کئے رکھنے کے لئے کرم کانڈ کی ریتوں اور رسموں کے جال میں اس کو ایسا پھنسا دیا تھا کہ ہم نے ہندو دھرم کی وحدانیت، حقانیت اور روحانیت اس کے فلسفے، عقیدوں اور اصولوں سے منہ موڑ کر بے شمار اوتاروں دیوتاؤں، دیویوں اور مہنتوں کو اپنا خدا مان لیا اور ان ہی کی پوجا پاٹھ تیرتھ جاترا اور اشنان دھیان کو اپنا دھرم سمجھنے لگے۔ استری سماج اور اچھوت جاتیوں کے ساتھ جس ذلت اور شرم کا ہمارا برتاؤ رہا، اُس نے قوم کی کمر توڑ دی اور سماج کی ہستی کو خاک میں ملا دیا۔ مختصراً ہندو قوم، ہندو دھرم اور ہندو تہذیب پر ایسی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور پستی و ذلت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ بس ہماری ہستی کا مٹنا ہی باقی رہ گیا تھا، اسے مشیتِ ایزدی کہئے کہ زمانہ نے پھر کروٹ بدلی۔ اس تاریکی میں روشنی کی جھلک نظر آئی۔ ہندوستان کو برطانیہ سے واسطہ پڑا، یورپ کی تہذیب، کلچر اور سائنس نے ہم پر اثر کرنا شروع کیا، اور اس نئی روشنی سے ہماری آنکھیں کھلنے لگیں۔ سو برس ہوئے کہ ہم نے ہندو سماج کے سُدھار کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں برہمو سماج قائم کر کے وحدانیت کا نعرہ بلند کیا، ذات کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی۔ کرم کانڈ کی زنجیروں کو توڑا اور ستی کی سی مذموم و ظالمانہ رسم کو مٹایا، لیکن برہمو سماج نے جیسے جیسے ترقی کی منزلیں طے کیں اس کا تعلق ہندو قوم سے منقطع ہوتا گیا اور اُس نے ایک نئے دین و مذہب کی صورت اختیار کر لی، اس کا اثر قوم کے پڑھے

لکھے اور اونچے درجے کے لوگوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا۔ کچھ دنوں بعد برہمو سماج جمود و خمود کے آغوش میں جا سوئی۔ سوشل کانفرنس کی تحریک نے بھی سماج سدھار کا کام شروع کیا۔ رشی راناڈے اس تحریک کے روح رواں تھے۔ اس کا اثر تو بظاہر کم ہوا لیکن تمام ملک کے پڑھے لکھے لوگوں تک پھیلا اور اب بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ سماج سدھار کی ان دونوں تحریکوں پر یورپ کی نئی تہذیب اور نئی روشنی کا بہت گہرا اور پائدار اثر پڑا تھا۔ ان تحریکوں کے خیالات اصول اور طریقے مغربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس لئے طبعاً ان کا اثر بھی انہیں طبقوں اور لوگوں تک محدود رہا جو نئی روشنی اور نئی تعلیم سے بہرہ یاب ہوئے تھے۔ یہ فخر آریہ سماج ہی کو حاصل ہے کہ سماج سُدھار کی تحریکوں میں صرف اسے ٹھیٹھ دیسی تحریک کہا جا سکتا ہے اور اسی لئے اس کا بہت گہرا اور پائدار اثر پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ عوام پر بھی ہوا ہے۔ سدھار کی تحریکوں میں قبول عام کا جو شرف آریہ سماج کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو نہیں ہوا۔

پہلا دور

آریہ سماج کا عقیدہ اور دعویٰ ہے کہ قرآن اور انجیل کی طرح وید بھی الہامی کتاب ہے، مذہب، اخلاق، فلسفہ، سائنس اور دنیا کے جتنے علم و فن ہیں اُن سب کا خلاصہ ویدوں میں موجود ہے۔ اور زمانہ کے تہذیب و تمدن نے اب تک جو کچھ ترقی کی ہے اور سائنس کی وہ سب ایجادیں اور کراماتیں جن سے آج ہماری آنکھیں چکاچوند ہوتی ہیں، ان سب کا پتہ ویدوں میں چلتا ہے، اور ہمارے قدیم ویدک دھرم نے اب سے صدیوں پیشتر ہی اس ترقی کی

سب منزلیں طے کرلی تھیں یہی ہمارا قدیمی مذہب ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ مذہب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سب خرافات ہے۔ ویدک دھرم نہ صرف آریہ ورت کے ہندوؤں کا دھرم تھا بلکہ اس کی روشنی تمام مہذب دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا عقیدہ اور دعوئی ہے کہ آریہ ورت اپنی گزری ہوئی عظمت واقبال اور عروج کی منزل پر پھر پہنچ سکتا ہے اور ہماری نجات اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ ویدک دھرم اور اپنی قدیم تہذیب کو از سرِ نو زندہ کریں اور ویدک دھرم کے جھنڈے نہ صرف تمام بھارت ورش میں بلکہ چار دانگ عالم میں گاڑدیں۔ رشی دیانند کی امت نے اپنے مشن کی عظمت سے متاثر ہوکر اپنے عقیدے کے جوش میں ایک طرف تو مورتی پوجا کی مخالفت کی، اور جات پات کے اختلاف، چھوت چھات کے جھگڑے اور کرم کانڈ کی ریتوں اور رسموں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اونچا کیا، دوسری طرف وہ ویدک دھرم کی فوقیت کا اعلان کرکے دیگر مذاہب کی مخالفت کے میدان میں اُتر آئی، اور جن لوگوں نے ہندو دھرم سے مُنہ موڑ کر دیگر مذاہب کے دامن میں پناہ لی تھی اُنھیں شدھی کا پرچار کرکے پھر ویدک دھرم کا حلقہ بگوش بنادیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے اُنیسویں صدی کے ختم ہوتے تک آریہ سماج کامل پچیس ۲۵ برس تک اپنے عقیدے کے جوش میں لڑتی رہی اور اُس نے دیگر مذاہب و فرقہ ہائے ہنود میں کھلبلی مچادی۔ اس لڑائی میں جیساکہ ہونا لازمی تھا اس کے تیور چڑھے ہوئے تھے اور لب و لہجہ بھی درشت تھا۔ اسی لئے آریہ سماجیوں کو لڑاکا سمجھا جانے لگا۔ لیکن ان کے جوش و

خودبخشش میں کمی نہیں ہوئی۔

جو اُن ہونی باتیں تھیں اُن میں تو آریہ سماج کو کامیابی نہیں ہوئی لیکن آریہ سماج کے بڑے سے بڑے مخالف بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ اس نے ہندو سماج کے مہمل اُصول، زیادتیوں اور کمزوریوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے صدیوں بعد پھر ایک مرتبہ گوتم، کبیرا اور نانک کی یاد کو تازہ کردیا اور ہندو قوم کے مُردہ جسم میں نئی روح پھونک کر اسے پھر ایک مرتبہ جیتا جاگتا دنیا کے سامنے لاکر کھڑا کردیا، اور یہ بہت بڑا کام تھا جو آریہ سماج نے کیا۔ اسی لحاظ سے رشی دیانند کی عظمت پرانے رشیوں اور مُنیوں سے کم نہیں۔

دوسرا دور

آریہ سماج کی زندگی کا دوسرا دور بیسویں صدی کے شروع سے شروع ہوا۔ سماج کے لیڈروں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اُن کو اپنے مشن میں محض ویدک دھرم کی فوقیت پر زور دینے اور ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے لوگوں سے مناظرہ و مباحثہ کرنے اور شدھی کا پرچار کرنے سے کامیابی نہیں ہوسکتی، اُن کی دوراندیشی نے اُن کو بتایا کہ آریہ سماج کی بنیادیں مضبوط کرنے اور اس کو پبلک میں مقبول بنانے کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان عملی کاموں کو اپنے ہاتھ میں لیں کہ جن سے عوام کی جہالت دور ہو، اُن کو اپنے یہاں کی بُری رسموں کا حس پیدا ہو اور وہ ان کو دور کرنے کے لئے امادہ ہوجائے۔

سماج نے اپنی سچائی، ہمدردی اور ایثار کی مثالوں سے لوگوں کے دلوں میں اس طرح گھر کرلئے کہ وہ خود بخود اس طرف کھنچنے لگے چنانچہ شمالی ہندوستان میں آریہ سماج نے تمام بڑے بڑے شہروں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں

بھی اپنے گروکل کالج اور اسکول قائم کرکے عام لوگوں کی تعلیم کا بڑے پیمانہ پر انتظام کیا۔ لڑکیوں اور عورتوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جگہ جگہ مدرسے قائم کئے اور سب سے پہلے اس طرف پیش قدمی کی۔ یتیموں کی غور و پرداخت کے لئے یتیم خانے کھولے، عقدِ بیوگان کا پرچار کیا۔ بیواؤں کی شادیاں کرائیں اور بے کس و بے نوا بیواؤں کے لئے بدھوا آشرم کھولے۔ جب کبھی قحط پڑا یہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کی مدد کے لئے دوڑے۔ زلزلوں اور سیلاب کے طوفانوں میں انہوں نے مصیبت زدوں کی امداد کی۔ جات پات کی تفریق کو دلیری کے ساتھ مٹانے کی کوشش کی اور اچھوت ادّھار کے کاموں میں جس کا آج کل بہت چرچا ہے انہوں نے ہی سب سے پہلے قدم بڑھایا اور زبانی جمع خرچ سے قطع نظر کرکے بہت کچھ عملی کام کی بنیاد ڈالی۔ مختصراً ہندو سماج کے سدھار کا جو کچھ اور جیسا کچھ کام آریہ سماج نے پچھلے پچاسی برس میں کیا ہے اس پر وہ بجا طور سے فخر کرسکتی ہے اور ہندو قوم اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔

تیسرا دور پچھلے دس پندرہ برس سے آریہ سماج کی کیفیت اور حالت میں کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں کہ جن سے ایک نئے دور کا پتہ چلتا ہے اور اس کو بجا طور سے سماج کی زندگی کا تیسرا دور کہا جاسکتا ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر نئی تحریک کو اپنے قدم جمانے میں تین صورتیں پیش آتی ہیں۔ شروع شروع میں تو لوگ اسے نئی اور انوکھی بات سمجھ کر اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ لیکن جب مذاق اڑانے سے کام نہیں چلتا اور وہ اپنے قدم جمانے لگتی ہے تو پھر اس کی شدّت سے مخالفت کرتے ہیں اگر اس مخالفت کو وہ جھیل گئی

اور کامیابی سے اس کا مقابلہ کرلیا تو پھر اس کا لوہا ماننے لگتے ہیں جس سے اس کے طرفداروں اور پیرووٴں کی جماعت بڑھنے لگتی ہے۔ پچھلے پچاس برس میں آریہ سماج ان دونوں دوروں سے گزر چکی اور دس پندرہ برس سے اس کا اب وہ تیسرا دور شروع ہوا ہے کہ جب ہندو قوم اس کی فوقیت، اس کی طاقت اور اس کے قومی جوش کی قائل ہو کر اس کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر آریہ سماج بھی اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھ کر ہر ضرورت کے موقع پر یعنی جب کبھی اور جہاں ہندو قوم کو باہر والوں سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس کی حمایت میں سینہ سپر نظر آتی ہے، پبلک بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اور اس کی مقبولیت عوام میں بڑھتی ہے، آریہ سماج کے قدردان اور خیرخواہ ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے ایک معنی میں یہ خوشی اور مبارکباد کا موقع ہے، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک اور لحاظ سے کم سے کم میرے نزدیک یہی وقت آریہ سماج کی زندگی میں سب سے زیادہ آزمائش اور امتحان کا ہے۔ سماج کا موجودہ رویہ خطرہ سے خالی نہیں، یہ اور بات ہے کہ ابھی خطرہ ہماری آنکھ سے اوجھل ہے اور ہم اُس کی طرف سے غافل ہیں۔

(۲)

جہاں تک میری واقفیت ہے اور میری سمجھ کام کرتی ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ رشی دیانند نے جو پیغام ہندو قوم کو دیا اور آریہ سماج جو مشن لے کر ہمارے سامنے آئی وہ یہ تھا کہ مورتی پوجا چھوڑ کر توحید کا نعرہ بلند کرو۔ چھوت چھات کا جھگڑا اٹھا کر سماج کو جات پات

کی تفریق اور قید سے آزاد کرو۔ گرووٴں، پروہتوں اور مہنتوں کی زبردستیوں سے سرکشی کر کے کرم کانڈ کی ریتوں کے جال کو توڑو اور اچھوت جاتیوں اور استری سماج کا ادھار کرو۔ مختصراً ہندو سماج کے جسم میں اوہام پرستی اور جہالت، شک وشبہ کا جو زہر ہزاروں برس سے سرایت کر گیا ہے اور جس نے ہمارے ہڈی پسلی رگ وپٹھوں، گوشت پوست سب کو مجہول اور کمزور کر رکھا ہے، اس کو کسی طرح سے نکال باہر کرو۔ کامل ۵۰ برس تک آریہ سماج نے ہندو قوم کے ان جھگڑوں، برائیوں اور کمزوریوں کے خلاف نہایت جوش سے جہاد کیا۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے اس کی توجہ اور جوش اندرونی خطرہ کے خلاف کم ہو رہی ہے، یعنی سماج کے کارکنوں کا رویہ اپنے مشن کی اصلی غرض کی طرف سے سست پڑتا نظر آتا ہے اور یہ صورت خطرے سے خالی نہیں۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ ابھی سماج کے لیڈر خود اس خطرہ کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ یہ اندرونی خطرہ کسی طرح سے بیرونی خطرہ سے کم نہیں بلکہ اس وقت اس سے کہیں زائد ہے، کیونکہ اول تو دیگر مذاہب کے جو حملے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں وہ ہندو قوم کے لئے ایسے خطرناک نہیں ہیں جیسے کہ خود ہماری اندرونی کمزوریاں اور وہ زہر کہ جو ہمارے خون میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جس کو باوجود ہزاروں برس کی کوشش کے ہم ابھی تک دور نہیں کر سکے۔ اگر دیکھا جائے تو ہندو قوم ہندو دھرم اور ہندو تہذیب پر اس ہزاروں برس کی زندگی میں نہ معلوم باہر والوں کے کتنے ہی حملے ہوئے اور سنگین ہوئے، بعض اوقات قوم نے ان

کے آگے سر بھی جھکا دیا لیکن اپنی ہستی کو مٹنے نہیں دیا۔ کوئی ہمارے تہذیب و تمدن کا بال بیکا نہ کر سکا۔ یہ حادثات فصلی بیماری سے زیادہ نہ تھے۔ جب کبھی ان کا حملہ ہوتا ہے تو ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ لیکن سمجھدار معالج اُن زہریلے جراثیم کے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو تمام جسم اور قویٰ کے لئے باعث اضمحلال ہوتے ہیں اور جن کی یہ چھوٹی موٹی بیماریاں محض بیرونی علامات ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کے مذہبی یا شہری حقوق کی محافظت کے لئے متعدد سبھائیں اور انجمنیں مثلاً آل انڈیا ہندو مہا سبھا وغیرہ موجود ہیں۔ لیکن اُس زہر کے نکالنے اور اُس دشمن سے لڑنے کے لئے کہ جو اندر ہی اندر ہندو سماج کو کھائے اور اُسے تباہ کئے جا رہا ہے صرف ایک ہی ایسی طاقتور اور جاندار تحریک ملک میں کام کر رہی ہے کہ جس کا لوہا ہندو سماج اب ماننے لگی ہے اور وہ آریہ سماج ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی تحریک کیوں نہ ہو، اُس کے کام کرنے والوں کی قابلیت، ہمت اور جوش محدود ہوتا ہے غیر محدود نہیں، آریہ سماج بھی اس قانون قدرت سے مبرا نہیں، جب اس کے کام کرنے والوں کا جوش سیاسی و نیم سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہو جائے گا تو اُس کا اپنے اصلی مشن کے پورا کرنے کی طرف سے شست پڑنا یقینی ہے۔ علاوہ اس کے ایک اور بات بھی ہے جس کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ کل تک تو آریہ سماج مورتی پوجا کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھی، اور آج مندروں کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہونے کو تیار ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ آریہ سماج کے عقیدہ و ایمان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، لیکن موجودہ صورت حال میں مصالحت

(Compromise) اور (Acquescence) رواداری کی روح کام کر رہی ہے۔ جب دین و ایمان کے معاملہ میں مصالحت سے کام لیا جاتا ہے تو وہ شکست پڑنے لگتے ہیں۔ یہی خطرہ ہے کہ جس سے آریہ سماج کو اس وقت سامنا ہے ہندو قوم۔ ہندو دھرم اور ہندو تہذیب کی گزشتہ کئی ہزار برس کی زندگی میں جو اقبال اور زوال بلندی اور پستی کے دور گزرے ہیں اُن کی یاد ہمارے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے، اُن پر ایک سرسری نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ تاریخ ہمیں کچھ سبق سکھاتی ہے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ جس خطرہ کا میں نے ذکر کیا ہے وہ محض خیالی یا وہمی نہیں بلکہ کچھ اصلیت رکھتا ہے۔ جو لوگ میری طرح ویدوں کو الہامی کتاب نہیں سمجھتے یا جو اس کے قائل نہیں کہ ہمارا قدیم مذہب اور تہذیب ہی تمام ترقی و عروج کی آخری منزل ہیں اُن کی نگاہ میں اگر آریہ سماج کی قدر و منزلت ہے اور وہ دل سے اس تحریک کی ترقی کے خواہشمند ہیں تو محض اس لئے کہ ایسے نازک وقت میں کہ جب ہماری قوم ہمارا دھرم اور ہماری تہذیب، اوہام پرستی، جہالت اور شک و شبہ کا شکار ہو رہی تھی۔ سوامی دیانند نے اس کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اُپنشدوں کے زمانہ سے لیکر اب تک جب کبھی ہم پر ایسا وقت پڑا ہے۔ کسی نہ کسی مرد خدا نے ہماری صحیح رہنمائی کی ہے، راجہ جنک اور دوسرے رشیوں نے اُپنشدوں کے زمانہ میں گوتم بدھ نے اپنے وقت میں، اور اسی طرح وشنو سنتوں اور بھگتی مارگ پر چلنے والوں نے شاکت مت اور وام مارگیوں کے پھندوں سے نجات دلا کر ہم کو صحیح راستہ دکھایا ہے۔ راجہ رام موہن رائے

اور برہمو سماج اور دیانند سرستی اور آریہ سماج احتجاج، ہنود کی اسی تحریک مسلسل کی آخری کڑکیاں ہیں اور اسی سلئے یہ ہمیں عزیز ہیں۔ جن خدا کے بندوں نے وقتاً فوقتاً بغاوت کا جھنڈا بلند کیا، اُن سب کو ایک ہی دُھن تھی یعنی وہ قوم کے جسم میں ایک نئی اور تازہ روح پھونک دیں اور جن خرابیوں نے مذہب میں گھر کر لیا تھا اُن کو مٹا کر سچائی کی طرف لوگوں کو متوجہ کریں تاکہ جات پات کی تفریق مٹ جائے اور دیوی دیوتاؤں کو چھوڑ کر لوگ ایشور کی وحدانیت پر ایمان لے آئیں ہندو پروٹسٹنٹزم (HINDOO Protestantism) کی اس تحریک کا جو کئی مرتبہ اُبھری اور پھر دب گئی ہماری زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ یہی بہت بڑی وجہ ہوئی ہے کہ جس سے بلندی اور پستی کے اتنے دور گزرنے اور عمر دراز ہونے کے باوصف ہماری ہستی آج تک مٹنے نہیں پائی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا سکتا کہ اِس تحریک کو وہ کامیابی حاصل نہ ہوئی کہ جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی۔ ہماری اوہام پرستی اور جہالت نے جب کبھی زور پکڑا اُس نے اُس پر غالب آکر اُسے دبا دیا لیکن مرض کو دور نہ کر سکی، مٹا نہ سکی۔

ازمنۂ ماضیہ میں سیدھے سادے منتروں سے ایشور کی اُشتت (ثنا و صفت) کرنا اور ہَوَن کی آہوتی دینا ہمارا ویدک دھرم تھا۔ لیکن پیشوایان دین کی تاویلات نے اُنھیں مسخ کر کے رسوم کا ایک گورکھ دھندا بنا دیا۔

اُپنشدوں کی تعلیم و تلقین نے درِ معرفت و حقیقت وا کیا اور برہمنوں نے ان کی فضیلت کے آگے سر بھی جھکا دیا مگر سکھایا یہی کہ ریاضت و نفس کشی اس کی کلید ہیں اور ہم ان ہی کریاؤں کے جال میں پھنس کر

رہ گئے۔ جب شاکیہ منی گوتم نے اس کارِ عظمت انجام کیا اور بودھ گیان کی روشنی اس دیس میں پھیلی تو عرصہ تک برہمن خاموشی سے اس کے آگے سر جھکائے موقع کے منتظر رہے۔ جب بودھ مت کمزور پڑنے لگا تو شری شنکر اچاریہ نے یہ اُپدیش دیا کہ ویدانیت اور فلسفہ اپنی اپنی جگہ بڑی کارآمد چیزیں ہیں مگر اس کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے چند صاحب دماغ ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے ان ہندوؤں کے ادّھار کی بھی کوئی تدبیر ہونی چاہئے جن کی تعداد لاکھوں نہیں کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان کے لئے مختلف اوتاروں، دیویوں اور دیوتاؤں کے مندر بنائے گئے اور مہنتوں کے مٹھ اور گدیاں قائم کی گئیں۔ بودھ بھگوان کی فضیلت کے لحاظ سے ان کو بھی مورتیوں اور مندروں میں اونچی جگہ دی گئی۔ بودھ مت کے گیان دھیان کو سُنا اَن سُنا کر کے دیس نکالا دیا گیا۔ لیکن ہندو بودھ بھگوان کو پوجنے لگے۔ ہماری اَن گنت جاتیوں اور متوں میں بودھ مت بھی ایک جاتی ہو کر مل گیا۔ جب کبیر اور نانک نے توحید کا نعرہ لگایا اور اونچ نیچ اور جات پانت کے فرق کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو ہندوؤں نے ان کے آگے بھی سر جھکا دیا، ان کی فضیلت کو مانا، انہیں اپنے اوتاروں اور دیوتاؤں کے پہلو میں جگہ دی۔ اور نانک پنتھی، کبیر پنتھی دادو پنتھی سب کو ہندو سماج کے وسیع دامن میں سمیٹ لیا۔ اور آپ لکیر کے فقیر بنے وہی پرانی لکیر پیٹتے رہے۔ الغرض ہندو سماج کے جسم میں اس کے گوشت پوست اور اس کے خون میں بلکہ اس کی رگ رگ میں ہر جاندار اور غیر جاندار چیز کے پوجنے اور جات پانت کے فرق کا زہر اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کو ہزاروں برس سے

ان باتوں کی ایسی بُری عادت پڑی ہوئی ہے کہ وہ کسی طرح نکلتا ہی نہیں۔ یہ عادت کسی طرح چھٹتی ہی نہیں، جہاں کہیں اور جن جن لوگوں میں بھی ہمارا خون دوڑ رہا ہے، وہاں یہ زہر موجود ہے۔ ہم نے مسلمانوں کے آگے سر تو جھکایا لیکن ذات کے داغ سے ان کو بھی نہ بچنے دیا۔ دیہات میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے نومسلم ہیں جو جات پانت کے جھگڑے میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہماری پرانی ریتوں رسموں کے پابند ہیں۔ ہندستانی عیسائیوں کا بھی یہی حال ہے۔ کم سے کم شادی بیاہ کے معاملہ میں اونچی اور نیچی ذات کی تفریق ان میں بھی کی جاتی ہے۔ اگر میرے ساجی بھائی بُرا نہ مانیں تو میں یاد دلاؤں گا کہ اُن کے یہاں بھی ذات کے باہر شادیاں بہت کم ہوتی ہیں، اور تو اور اس اندھیر کو دیکھئے کہ نیشنل کانگریس کے الکشن میں بھی جتھا بندی اکثر ذات کی تفریق پر ہوتی ہے۔ حاصل کلام اس مرض کے عود کرنے اور زور پکڑنے سے جس نقصان اور خطرے کا ہم کو اندیشہ ہے اُس کے آگے اُن حملوں کی کوئی حقیقت نہیں جو باہر والوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اوہام پرستی اور جہالت، شک اور شنکا کے دبانے کے لئے جو سب سے زیادہ ہمارے لئے خطرناک ہیں اور جو آج ہمارے جسم کو کمزور اور کھوکھلا کر رہے ہیں، کوئی طاقتور تحریک ہے تو آریہ سماج ہے۔ اگر یہ آج اپنی طاقت اور جوش کو غیر ضروری باتوں میں صرف کرتی ہے یا اپنے ایمان اور عقیدے کو (Compromise) مصالحت اور (Acquiescence) رواداری کی اسپرٹ سے شست اور کمزور ہونے دیتی ہے تو یہ خطرہ محض وہمی اور خیالی نہیں بلکہ حقیقی

ہے کہ ایک دن ہندو جاتی رشی دیانند کو بھی دیوتا قرار دے کر اپنے
مندروں میں اُن کی مورتی پوجنے لگے گی اور آریہ سماجی بھی نانک پنتھی
کبیر پنتھی، دادو پنتھی اور دوسرے پنتھوں کی طرح ایک پنتھ یا ذات
ہو کر ہندو سماج اور ہندو جاتی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جائیں گے۔
میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ہو کر رہے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ایسا ہوتا معلوم
ہوتا ہے۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ آریہ سماج کے کام کرنے
والوں کا جو رویہ اس وقت نظر آتا ہے اُس سے اس خطرے کا
اندیشہ ہے کہ جس کا ذکر میں نے اس مضمون میں کیا ہے اور اس لئے
سماج کے لیڈروں کی توجہ کا مستحق ہے۔ اس پر متوجہ ہونا یا نہ ہونا
ان کا کام ہے۔

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

رشی راناڈے

اور

انڈین سوشل کانفرنس

(۱)

مہادیو گوبند راناڈے ۱۸ر جنوری ۱۸۴۲ء کو مقام نفد ضلع ناسک صوبہ بمبئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سرکاری دفتر میں محرر تھے۔ راناڈے چت پون برہمن خاندان سے تھے۔ مہاراشٹر میں چت پون برہمن بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں اور اس کے مشاہیر اور لیڈر زیادہ تر اسی ذات سے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ حکمراں پیشواؤں سے لے کر راناڈے۔ گوکھلے۔ تلک۔ آگرکر۔ بھنڈارکر وغیرہ تک سب اسی ذات میں پیدا ہوئے۔

راناڈے کی ابتدائی تعلیم کوھلاپور میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۵۶ء میں الفنسٹن ہائی اسکول بمبئی میں داخل ہوئے اور تین سال میں میٹریکولیشن یعنی انٹرنس کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا ۱۸۶۴ء میں بمبئی یونیورسٹی سے اول درجہ میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ آپ اُن طلباء میں سے تھے جن کا شمار بمبئی یونیورسٹی کے اولین گریجوئیٹوں میں ہوتا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی آنرز میں کامیاب ہونے پر بمبئی یونیورسٹی کے سب سے پہلے فیلو منتخب ہوئے۔ حصول تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ آپ الفنسٹن کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے بی۔ اے کے طلباء کو درس بھی دیتے اور مرہٹی زبان و ادب کے امتحانوں کے ممتحن بھی مقرر ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اقتصادیات کا گہرا مطالعہ کیا اور مرہٹی زبان و ادب سے پوری واقفیت

حاصل کی۔ آپ کچھ عرصہ تک اخبار ہندو پرکاش (हिन्दु प्रकाश) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ تحصیل علم کے شوق و شغف درس و تدریس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ کی بینائی پر اس کا بہت خراب اثر پڑا۔ ایک زمانہ میں اندیشہ تھا کہ شاید نعمت بصارت سے بالکل محروم ہو جائیں گے مگر اس کی نوبت تو نہ آئی لیکن شروع ہی سے اس میں فرق ضرور آگیا جسیم قوی الجثہ تھے۔ مبدء فیاض نے اُنہیں فکر عالی اور دل درد مند عطا کیا تھا۔ قومی خدمت کا جوش اور کام کرنے کی عادت اس عالم جید کی سرشت میں تھی ۱۸۶۶ء میں حلقہ بگوشانِ سرکار میں، داخل ہو کر دو سال تک حکومت بمبئی کے مترجم (السنۂ مشرقیہ Oriental Translator) رہے۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے ریاست اکل کوٹ کے دیوان اور پھر ریاست کولھاپور کے جج بھی رہے۔ ۱۸۶۹ء میں پھر بمبئی آئے اور تین سال تک الفنسٹن کالج کے شعبہ انگریزی اور تاریخ کے عہدۂ پروفیسری پر مامور رہے، اس عرصہ میں کئی ماہ عارضی طور پر عدالت خفیفہ کی ججی اور ہائی کورٹ کی نائب رجسٹراری کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ بالآخر ۱۸۷۱ء میں مستقل طور پر پونہ میں عہدۂ سب ججی پر فائز ہوئے اور باستثنا تین سال جب کہ آپ کو باہر رہنا پڑا ۱۸۹۳ء تک اسی پر متمکن رہے۔ اس طویل مدت میں پونہ کی پبلک لائف یعنی مہاراشٹر کی سیاسی اور سماجی زندگی آپ کی توجہ کا مرکز رہی اور جس عمارت کا سنگ بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں نے رکھا تھا وہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کر کے ایک ایوان عالی شان بن گئی۔

آپ کے ورود پونہ سے ایک سال بیشتر ہی وہاں سار وجنک سبھا
(सरव जानिक सभा) کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی تھی جس
کی غرض یہ تھی کہ رعیت کی شکایات حکومت وقت کے سامنے پیش کرکے
اُن کی دادرسی چاہیئے۔ مسٹر رانا ڈے اس کے ممبر ہو گئے اور عرصۂ
دراز تک اس کے روحِ رواں رہے۔ اسی انجمن کے ذریعہ اُنہوں نے
مہاراشٹر کی سیاسی اور سماجی زندگی میں جان ڈالی اور اقتصادی
و تعلیمی معاملات کی گتھیاں سُلجھانے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۱ء میں جب ایک
پالیمنٹری کمیٹی (Parliamentary Commitee)
ہندستان کے مالی معاملات پر غور کرنے اور اس کی پیچیدگیوں کو حل
کرنے کے لئے قائم کی گئی، تو آپ نے سار وجنک سبھا کی طرف سے
مہاراشٹر میں ایک تحقیقاتی کمیٹی اس مقصد سے قائم کرکے اس کی رپورٹ
شائع کی۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار ہوا تو آپ نے سار وجنک سبھا کی
طرف سے ملکۂ معظمہ کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جس میں درخواست
کی گئی تھی کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری عطا کی جائے۔ اسی
سال کے ہولناک قحط کی سار وجنک سبھا کے نمایندے کو موقع پر بھیج کر
تحقیقات کرائی۔ تمام حالات و واقعات کی روداد شائع کی، اور حکومت
وقت جو کچھ اس معاملہ میں کر رہی تھی اس کو مدنظر رکھ کر رعیت کی آہ و
فغاں کی صدا کانوں تک پہنچائی۔ ۱۸۷۸ء میں حکومت کو رعایا کی
ضروریات و مشکلات کی طرف متوجہ کرنے کے لئے سار وجنک سبھا کا
سہ ماہی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ ہندوستان کی ردی زراعتی حالت
اور مسائل اراضی بھی آپ کی تحقیق و توجہ سے محروم نہ رہے اور حکومت

وقت کی پالیسی آپ کی نکتہ چینی کی آماجگاہ بن گئی ۱۸۷۹ء کے دکن اگریکلچرسٹ بل (The Deccan Agriculturist Bill) پر آپ کی اصلاحوں کے نقوش مرتسم تھے۔

۱۸۸۱ء میں جب حکومت ہند نے صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ لوکل باڈیز (LOCAL BODIES) یعنی ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ کو کچھ اختیارات دئے جائیں اور مقامی انتظامات کے لئے ان کی مالی امداد کی جائے تو آپ نے سار وجنک سبھا کے پرچہ میں ایک سلسلہ مضامین لکھ کر رعیت اور حکومت دونوں کو اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دلائی اور رائے عامہ کی ترتیب و تربیت کا کام انجام دیا۔

آپ کی وسعت خیال نے صوبائی تنگ نظری کے حدود سے نکل کر دیسی ریاستوں کے آئین حکومت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ سار وجنک سبھا کے آرگن کے ۱۸۸۱ء کے اوراق شاہد ہیں کہ جو تجاویز و مسائل آج معرض بحث میں لائے جارہے ہیں وہ اسی زمانے میں آپ کی زیر توجہ تھے۔ سبھا کا یہ رسالہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی اور تعلیمی غرضکہ جملہ ملکی اہم مسائل اور کار آمد و قابل توجہ مضامین کا حامل ہوا کرتا تھا۔ اور ان میں سے زیادہ تر مسٹر راناڈے کے رشحات قلم کا نتیجہ ہوا کرتے تھے۔ ۱۵ سال تک پبلک کی سیاسی تعلیم کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ لیکن آپ کی سرگرمیاں صرف سار وجنک سبھا تک محدود نہ تھیں، اسی چوتھائی صدی میں پونہ میں جتنے بھی پبلک کام شروع ہوئے یا پبلک انجمنیں قائم ہوئیں وہ سب اسی شیدائے وطن کی مساعی کی مرہون منت ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اس قسم کے اداروں

دو چار ہی نہ تھے، اُن کی تعداد قریب قریب ۲۲ تھی۔

اس زمانہ میں جبکہ رباب ہستی کا ہر تار نغمۂ انقلاب سے معمور ہے، مسٹر رانا ڈے کی کوشش شاید وہ خراج تحسین حاصل نہ کر سکیں جس کے وہ حقیقی معنی میں مستحق ہیں لیکن ان کی عظمت کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں اس دور ہلاکت و نکبت کا تصور کرنا چاہئے کہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کی نبضیں ڈوب رہی تھیں۔ اور ایک ایسے مسیحا نفس کی ضرورت تھی جو ان میں روح ارتقا پھونک کر اُنہیں ورطۂ ہلاکت سے بچا لے۔ وہ زمانہ کانگریسیوں اور لیگیوں کا زمانہ نہ تھا۔ ایک ناخدا تن تنہا سر فروشانہ کشتیٔ قوم کو بحر طوفاں خیز سے نکال کر لب ساحل تک پہنچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

اسی زمانہ میں مسٹر رانا ڈے کی زندگی میں دو تین ایسے واقعات رونما ہوئے جو دلچسپ ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہیں اور ہم کو بتاتے ہیں کہ اس ملک میں سوشل ریفارمر کو کیسی مشکلات اور آفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پبلک خدمات انجام دینے والے کس طرح حکومت وقت کی نظروں میں مشتبہ اور پبلک میں مطعون ہوتے ہیں۔ مسٹر رانا ڈے باوصف سرکاری ملازمت کے سماجی اور سیاسی معاملات میں علانیہ حصہ لیتے اور سرگرمی ظاہر کرتے تھے۔ حکام بالا دست کو یہ ناگوار گزرتا تھا اتفاقاً اسی زمانہ میں کہ جب وہ پونہ میں تھے اور ان کی پبلک سرگرمیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ پونہ اور پونہ کے گرد و نواح میں چند شورش پسند افراد کی سازش سے حکومت کے خلاف کوئی نہ کوئی شگوفہ کھلتا رہتا تھا۔ ایک دو سرکاری عمارتیں جلا کر خاک کر دی گئیں۔ گورنمنٹ کو یہ شبہ ہوا کہ

اس سازش کی پشت پناہ مسٹر راناڈے ہیں۔ چنانچہ وہ پونہ سے ناسک تبدیل کر دیے گئے۔ انہوں نے اس کی پروانہ کی اور ناسک میں بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ آپ نے وہاں ایک انجمن مرہٹی زبان اور لٹریچر کو فروغ دینے کے لئے قائم کی، ایک پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی، ٹاؤن ہال بنانے کا ارادہ کیا اور پراتھنا سماج (प्रार्थना समाज) کی بھی ایک شاخ کھولی۔ حکومت کے شبہات اور بڑھے اور فوراً ہی آپ ناسک سے دھولیا کے کورد یہہ ضلع میں تبدیل کر دیے گئے۔ اتفاق کہ جب پونہ والی سازش کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو یہ عقدہ کھلا کہ اس سازش کے خاص مجرم کا نام بھی راناڈے ہے اور اسی وجہ سے پولس اور سرکاری حکام کو مغالطہ ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں معاملات سلجھ گئے۔ حکومت کو اپنی غلطی معلوم ہوگئی اور وہ بمبئی کے پریزیڈنسی مجسٹریٹ مقرر کر کے وہاں بھیجے گئے، لیکن چند ماہ بعد ہی آپ کا تبادلہ اپنی مستقل جگہ پونہ کی سب ججی پر ہو گیا۔ اس دفعہ آپ ۱۲ سال برابر پونہ میں رہے اور بالآخر جسٹس تیلنگ (तेलंग) کی وفات پر ان کی جگہ بمبئی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

ایک اور واقعہ جو قابل ذکر ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ پرانے رواج کے مطابق مسٹر راناڈے کی شادی لڑکپن میں اس وقت ہوئی کہ جب وہ بارہ برس کے اور اُن کی بیوی نو برس کی تھیں۔ ۱۸۷۱ء میں جب وہ پونہ میں سب جج مقرر ہوئے تو اُن کی بیوی سکھو بائی کی صحت خراب رہنے لگی۔ باوجود غور و پرداخت اور علاج و معالجے کے بیچاری کی حالت ابتر ہی ہوتی گئی اور آخر کش وہ چل بسیں۔ اُن کی

وفات کو تین مہینے بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ مسٹر راناڈے کے والد ان کے سر ہو گئے اور انہیں مجبور کیا کہ وہ دوسری شادی کرلیں۔ بات یہ تھی کہ مسٹر راناڈے کے والد نہایت پرانے خاندان اور دقیانوسی خیال کے بزرگ تھے۔ وہ صاحبزادے کے انقلاب انگیز خیالات اور سرگرمیوں کے نہ صرف قطعی مخالف تھے بلکہ انہیں یہ خوف بھی دامنگیر رہتا تھا کہ کہیں دوست احباب کے کہنے سننے سے کسی بڑی عمر کی پڑھی لکھی لڑکی یا کسی بیوہ سے شادی نہ کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے درپردہ ایک پرانے خیال کے خاندان والوں سے بات چیت کرکے ایک کم سن لڑکی سے ان کی نسبت قرار دیدی، بلکہ لڑکی کو پوتنہ بلوا لیا۔ اور بیٹے سے باصرار کہا کہ اگر تم شادی نہ کروگے تو دو خاندانوں کی عزت میں بٹہ لگ جائے گا اور لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ مسٹر راناڈے نے لاکھ کہا کہ اول تو میں اب شادی کرنے ہی کا نہیں اور کی بھی تو کسی بیوہ سے ہرگز میں کروں گا۔ پھر میں تیس برس کا ہوں۔ شادی کے معاملے میں مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے۔" لیکن والد بزرگوار نے ایک نہ سنی اور یہ وہ دھمکی دی کہ جس کا ایک سپوت پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ مسٹر راناڈے نے مجبوراً اپنی ذلت اور شرمندگی گوارا کی باپ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا اور غریب لڑکی یعنی منسوبہ کی زندگی تباہ ہونے سے بچالی۔ مسٹر راناڈے کی ناموافق واقعات میں کچھ عرصہ اس کا چرچا رہا اور اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں لیکن آپ نے اسے خاموشی سے گوارا کیا۔

حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ شادی جو ایسی زبردستیوں اور ناگواریوں کا نتیجہ تھی، محبت و تعلقات ازدواجی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ثابت

ہوئی۔ مسٹر راناڈے نے اپنی بیوی رما بائی کو پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ وہ حقیقی معنی میں اُن کی ہمدم اور رفیق زندگی ثابت ہوئیں پبلک سرگرمیوں میں وہ اکثر اُن کا ساتھ دیتیں اور ہاتھ بٹاتی تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ تقریباً ۲۰ سال زندہ رہیں اور وہ کام کر کے گئیں کہ جس سے آج تک اُن کا نام نہ صرف پونہ میں بلکہ تمام مہاراشٹر میں ہر عورت اور بچہ کی زبان پر ہے۔ پونہ کا مشہور ادارہ "سیوا سدن" (सेवा सदन) جو عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اُن کی بہبودی و ترقی کی غرض سے کھولا گیا تھا اور جس کی شاخیں آج مہاراشٹر کے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں ان کی اور مسٹر دیو دھر مرحوم کی کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اسی زمانہ کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ سوامی دیانند سرستی نے جب ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی تو پونہ کا بھی دورہ کیا۔ مسٹر راناڈے نے سوامی جی کی آؤ بھگت اور اُن کے کام میں اعانت کی۔ چنانچہ جب سوامی جی پونہ میں پبلک لیکچر دیا کرتے تھے تو مسٹر راناڈے برابر ان میں شریک ہوتے اور تقریریں کیا کرتے تھے۔ سناتن دھرمی ہندوؤں اور پرانے خیال کے لوگوں میں سوامی جی کے خلاف بڑا جوش تھا۔ ایک الوداعی جلسہ میں ان لوگوں نے ایسا ہنگامہ برپا کیا اور سوامی جی اور مسٹر راناڈے پر جلسہ ہی میں ایسے اینٹ پتھر برسائے کہ اگر پولس مداخلت نہ کرتی تو سوامی جی کا اس غول بیابانی کے درمیان سے بچ نکلنا غیر ممکن تھا۔ اس ہنگامہ میں مسٹر راناڈے پر بھی حملے ہوئے اور اُنہیں چوٹ بھی آئی لیکن جب پولس نے باز پرس شروع کی اور ہنگامہ

کرنے والوں کو اپنی گرفت میں لیا تو ان کے گڑگڑانے پر مسٹر رانا ڈے
کو ترس آگیا اور اُنھوں نے اپنے بیان میں ان مخالفین کے خلاف ایک لفظ
نہ کہا۔ پونہ واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی مسٹر رانا ڈے
(The Deccan Agriculturist Relief Act)
کے عمل درآمد کے سلسلہ میں جو مقدمات دائر ہوتے تھے اُن کے فیصلہ کرنے
کے لئے اسسٹنٹ اسپیشل جج مقرر کئے گئے۔ آپ نے اس عہدے کے
فرائض کو اس خوبی سے انجام دیا کہ اسپیشل جج کے رخصت پر جانے
کے بعد آپ ہی چیف اسپیشل جج مقرر کئے گئے۔ لارڈ وری گورنر صوبہ بمبئی
آپ کی قابلیت کے قدرداں تھے اس لئے اُنھوں نے آپ کو بمبئی
لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا اور ۱۸۸۶ء میں جو فنانس کمیٹی گورنمنٹ
ہند نے تخفیف مصارف کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مقرر کی تھی آپ
اُس کے بھی ممبر نامزد کئے گئے۔ مسٹر رانا ڈے کی کوششوں اور سرگرمیوں
کا دائرہ اب پونہ اور بمبئی سے تجاوز کر کے تمام ہندوستان پر پھیلا ہوتا جاتا
تھا۔ جن ۷۲ بزرگوں اور لیڈروں نے ۱۸۸۵ء میں بمبئی میں یکجا ہو کر انڈین
نیشنل کانگریس کا سنگ بنیاد رکھا ان میں آپ کا نام نامی بھی شامل ہے۔
آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل سوشل کانفرنس
اور ۱۸۹۰ء میں مغربی ہندوستان کے انڈسٹریل کانفرنس کے پہلے
اجلاس مدراس اور پونہ میں منعقد ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں دکن کالج پونہ
میں آپ کی وہ معرکۃ الآرا اور یادگار تقریریں ہوئیں کہ جس میں آپ
نے ہندوستانی اقتصادیات کے اصول و عمل کی تشریح کرتے ہوئے
انگریزی ماہرین اقتصادیات، مثل جان اسٹورٹ مل وغیرہ کے

اصول و پالیسی کی رد و قدح کر کے ان کو ہندوستان کے لئے مضر اور غلط ثابت کیا اور گورنمنٹ ہند کو متنبہ کیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں "آزادیٔ تجارت کا خیال اور اصول (Principle of Free Trade) ملک کے حق میں نقصان دہ ہے۔ یہ ملک زرعی ہے اسی لئے مفلس ہے۔ یہاں صنعت و حرفت کے فروغ دینے اور اس کے لئے "تحفظ" کی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

یوں تو ملک کی ترقی و بہبودی کے سلسلہ میں تعلیمی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی ہر قسم کی تحریکیں مسٹر راناڈے کی دوربیں نظر کا مرکز رہیں اور اُن کی ذات سے کارنمایاں ظہور پذیر ہوئے لیکن ملک میں سماجی اصلاح بالخصوص انڈین سوشل کانفرنس کی تحریک کے ساتھ ان کا نام نامی خاص طور سے وابستہ ہے کیونکہ وہی اس تحریک کے بانی اور روح رواں تھے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں آپ کی توجہ اور اثر سے سماجی اصلاح کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور ہر صوبہ سے اس کی حمایت میں آوازیں اُٹھنے لگیں لیکن سیاسی تحریک کے بالکل برعکس سماجی اصلاح کو پُرانے خیال کے لوگوں اور جمہور عوام کی شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ خاص کر خود شہر پونہ میں مخالفین کے لیڈر مسٹر تلک تھے۔ اُن کے مشہور اخبار کیسری نے موصوف کو پریشان کر رکھا تھا دونوں قدم قدم پر حملہ پر حملہ کرتے تھے۔ پہلا معرکہ (The Age of Consent Bill) کے پاس ہونے کے موقع پر ہوا۔ سوشل رفارمروں کی تحریک پر گورنمنٹ نے اس بل کو کونسل میں پیش کیا۔ پبلک کی طرف سے مخالفت اور موافقت میں اکثر جگہ جلسے ہوئے۔ اس کے بعد پونہ میں بھی مسٹر تلک نے ایسا ہی جلسہ کیا۔

مضلحین نے بھی جواب میں جلسہ کیا۔ تلک اور ان کے ساتھیوں نے اس جلسہ کو درہم برہم کر دیا۔ اتفاق سے مسٹر راناڈے اس وقت پونہ میں نہ تھے احمد نگر اور شولاپور کا دورہ کر رہے تھے۔ وہاں اُنہوں نے بل کی حمایت میں تقریریں کیں۔ بل کے منظور ہو جانے پر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اسی زمانہ کا ایک قابل ذکر واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جسے آج پچاس سال ہوتے ہیں پُرانے خیال کے لوگوں میں سماجی اصلاح کی مخالفت کیسی زبردست تھی اور کام کرنے والوں کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عیسائی مشنریوں کی کسی میٹنگ میں پونہ کے اکثر سر برآوردہ احباب مدعو تھے۔ ان میں مسٹر راناڈے اور مسٹر تلک بھی تھے۔ جلسہ کی کارروائی ختم ہوتے پر چاء اور بسکٹ سے تواضع کی گئی۔ اس کے لئے یہ لوگ تیار نہ تھے۔ انہیں تعجب ہوا۔ بعض نے چائے برائے نام پی۔ زیادہ تر نے آہستہ سے پیالہ سامنے سے سرکا دیا۔ دوسرے روز اخبار میں جلسہ کے شرکار کے نام شائع ہوئے اور کہا گیا کہ ان لوگوں نے عیسائیوں کے ساتھ چائے پی۔ اس میں مسٹر راناڈے اور مسٹر تلک دونوں کے نام پیش پیش تھے۔ شہر میں ہنگامہ اور آفت مچ گئی۔ سری شنکر آچاریہ کا فتویٰ (व्यवस्था) حاصل کیا گیا کہ اگر دونوں مردود پرایشچت سے یعنی (प्रायश्चित) کفارہ نہ کریں تو قوم اور برادری سے خارج کر دئے جائیں۔ چنانچہ مسٹر تلک اور مسٹر راناڈے دونوں کو توبہ اور پرایشچت کرنی پڑی۔ مسٹر راناڈے چونکہ سوشل رفارمر تھے اس لئے ان کو یہ خاص طور سے شاق گزرا۔

آج بیسویں صدی کے وسط میں ہمارے ملک اور ہماری قوم نے

جو ترقی کی ہے وہ حوصلہ افزا ہے۔ نہ صرف سیاسی میدان میں اب سوراج کی منزل قریب تر نظر آتی ہے بلکہ سماجی اصلاح کے شعبہ میں بھی ہم نے وہ ترقی حاصل کی ہے کہ جس سے ہمارے حوصلے بڑھتے ہیں۔ وہ سماجی مسائل کہ جن کی طرف نصف صدی پیشتر ہم نے توجہ کی تھی یعنی عورتوں کی تعلیم، کم سنی اور بیواؤں کی شادی، ذات پات کا فرق، غیر ولایتوں کا سفر۔ اچھوتوں کی ناگفتہ بہ حالت، اب یا تو پوری طرح حل ہو چکے ہیں یا بہت جلد حل ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ اور نئے سماجی مسائل پیدا ہو گئے اور ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ اچھوت اُدھار کی طرف تو مہاتما گاندھی اور کانگریس اپنی پوری توجہ مبذول کر رہے ہیں اور گو سوشل کانفرنس کا وجود اب قائم نہیں، عورتوں کی بہبودی و آزادی کے مسئلے کا حل عورتوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، صنفِ نازک کے طبقے سے ایسی ایسی صاحب دماغ اور نامور خاتونیں اُٹھی ہیں کہ جن کا نام نامی آج ملک میں ہر کہ ومہ کی زبان پر ہے۔ سرلا دیوی چودھرانی اور کملا دیوی چٹوپادھیا، مسز وجے لکشمی پنڈت اور مسز سروجنی نائڈو کے نام نامی سے کون نہیں واقف۔ مسز سروجنی نائڈو اور مسز پنڈت کی شہرت تو سات سمندر پار تک ہے۔ لیکن ایک نگاہ اس زمانہ پر ڈالئے کہ جو راناڈے مرحوم کا زمانہ تھا۔ نہ کانگریس تھی نہ سوشل کانفرنس۔ عورتوں کی ترقی و آزادی کا تو ذکر ہی کیا، عورتوں کے تعلیم دینے کا خیال بھی کفر سے کم نہ تھا۔

چونکہ مسٹر راناڈے ہر اصلاحی تحریک کو نہایت فراخ حوصلگی سے لبیک کہا کرتے تھے اور اس میں قومیت و مذہب کو دخل نہ دیتے تھے

اس لئے مسٹر تلک اور اُن کی پارٹی کو اُن سے اور رفارم پارٹی سے پُرانی پرخاش تھی اور جیسے جیسے مسٹر تلک کا اثر اور رسوخ عام پبلک میں بڑھتا گیا رفارم پارٹی کی مخالفت کا بھی جوش ترقی کرتا گیا۔ سار وجنک سبھا ان کے قبضہ میں آ چکی تھی۔ میونسپلٹی کے انتخاب میں بھی مسٹر راناڈے کے رفقار کو شکست اور مسٹر تلک کے پیروان طریقت کو کامیابی ہوئی تھی۔ مسٹر تلک خود بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ عوام الناس سماجی اصلاح کی تحریک سے صرف بدکتے ہی نہیں بلکہ اس کے مخالف تھے۔ مسٹر تلک اور مسٹر راناڈے کے اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سیاسی معاملات اور سیاسی تحریکات میں دونوں لیڈروں کے نقطہ ہائے نظر اور طرز عمل میں بُعد المشرقین تھا۔ مسٹر تلک کا مزاج وطبیعت اُن لوگوں کی سی تھی کہ کہ جو اپنے مخالفین کو معاف نہیں کرتے۔ رفارم پارٹی سے کد بڑھتے بڑھتے ۱۸۹۵ء میں حد سے تجاوز کر گئی۔ اس سال انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس پونہ میں منعقد ہونا قرار پایا۔ شروع ہی سے یہ ہوتا چلا آتا تھا کہ کانگرس اور سوشل کانفرنس کے اجلاس ایک ہی زمانہ اور ایک ہی جگہ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ کانگریس کے اجلاس ختم ہونے پر سوشل کانفرنس اُسی پنڈال میں ہوا کرتی تھی۔ مسٹر تلک اور اُن کی پارٹی کو اس معاملہ میں مسٹر راناڈے کو نیچا دکھانا منظور تھا۔ پونہ اور مہاراشٹر میں شور وغوغا مچا کہ کانگرس کے پنڈال میں سوشل کانفرنس ہرگز نہ ہو۔ گو کانگرس کی کمیٹی نے سوشل کانفرنس کو پنڈال میں جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دیدی تھی لیکن مسٹر تلک کی پارٹی کی جانب

سے اس قدر ہنگامہ برپا اور جوش ظاہر کیا جا رہا تھا کہ فساد ہونے کا اندیشہ تھا۔ مسٹر راناڈے نے رفع شر کے خیال سے یہی مصلحت سمجھی کہ سوشل کانفرنس کا اجلاس کانگرس کے پنڈال میں نہ کریں۔ چنانچہ اُس سال سوشل کانفرنس کا اجلاس پونہ میں فرگسن کالج کے احاطہ میں ہوا۔ گو بعد ازاں اور تمام صوبوں میں پھر حسب دستور کانفرنس کا اجلاس کانگرس کے ساتھ ہی ساتھ اُسی پنڈال میں ہوتا رہا۔ یہ آخری معرکہ اور ہنگامہ تھا کہ جس کا سامنا مسٹر راناڈے کو پونہ میں کرنا پڑا۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں مسٹر راناڈے بمبئی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری سات سال اُن کے بمبئی میں ہی گزرے۔ اپنے منصب کے فرائض نہایت قابلیت اور آزادی سے ادا کرنے کے علاوہ اُن کا زیادہ تر وقت سوشل کانفرنس کی تحریک کے پھیلانے اور اُس کے فروغ دینے میں صرف ہوتا تھا۔ وہی اس تحریک کے روح رواں تھے۔ اور اُن کے سالانہ ایڈریس جو وہ کانفرنس میں پڑھتے تھے نہ صرف اب تک یادگار ہیں بلکہ جب تک ہندوستان کی آزادی اور ترقی کی جدوجہد جاری ہے یادگار رہیں گے۔ وہ بمبئی یونیورسٹی کی سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی تھے۔ اُن کی سب سے زیادہ یادگار کوشش یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ مرہٹی زبان اور مرہٹی علم و ادب بھی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ گو اُن کی یہ کوشش اُن کی زندگی میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی لیکن اُن کے مرنے کے چند روز بعد ہی یونیورسٹی اس تجویز پر عمل پیرا ہوئی۔ سماجی تحریک

کے تو مسٹر راناڈے روح رواں تھے ہی لیکن ان کی تحریرات و تصنیفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی علم و فلسفہ اقتصادیات پر بھی اُن کو بخوبی عبور تھا۔ اس شعبہ میں اُن کی تحریریں اور تقریریں آج تک سند مانی جاتی ہیں۔ اور آخر عمر میں اُنہوں نے اپنی تحقیقات سے ہندوستانی تاریخ کے خزانہ کو بھی مالا مال کیا۔ "پیشواؤں کی ڈائری" اور "مرہٹہ قوم کا عروج و اقبال" ان کی تاریخی تصنیفات میں خاص طور سے قابل ذکر اور بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ آخر الذکر تصنیف کی وہ صرف پہلی ہی جلد لکھ سکے، آیندہ جلدوں کی تکمیل سے پہلے ہی داعی اجل کو لبیک کہا اور ہندوستان اُن کے فیض و برکتوں سے ۱۶ر جنوری ۱۹۰۱ء کو ہمیشہ کے لئے مرحوم ہو گیا۔

پرارتھنا سماج

(۲)

بمبئی میں ۱۸۲۹ء میں پرم ہنس سبھا کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی جس کی غرض قیود ذات کا توڑنا تھا اس کے ممبر نیچ ذات کے لوگوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتے تھے اور چھوت چھات کے جھگڑوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ سبھا چند سال قائم رہی اور پھر ختم ہو گئی لیکن جب کیشب چندر سین بنگال سے "برہمو سماج" کا پیام لیکر دورہ کرتے ہوئے بمبئی پہنچے تو اُن کے جوشیلے لیکچروں نے تن مُردہ میں روح پھونکی اور "پرم ہنس سبھا" کے پُرانے ممبروں نے متحد ہو کر ڈاکٹر آتمارام پنڈورنگ کی رہنمائی و رہبری میں ایک نئی انجمن قائم کی جس کی اغراض

تھیں، قیود ذات کا توڑنا، صغرسنی کی شادی کے خلاف کوشش کرنا، ازدواج بیوگان کی حمایت کرنا اور تعلیم نسواں کا پھیلانا۔ مذہبی اصلاح کا کام بھی کچھ دنوں بعد اس کے دائرۂ عمل میں شامل ہوگیا۔ ۱۸۶۷ء میں یہ انجمن باقاعدہ مرتب ہوئی اور اس کا نام "پرارتھنا سماج" رکھا گیا۔ اس کے اصول اور عقائد تو تقریباً وہی تھے کہ جو "برہمو سماج" کے تھے لیکن اس نے برہمو سماج سے الحاق اس لئے منظور نہیں کیا کہ ایک تو برہمو سماج میں بنگال میں مناقشے ہو رہے تھے، دوسرے کیشیب چندر سین نے برہمو سماج کو بہت کچھ عیسائیت کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ پرارتھنا سماج کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور اس کا کام ترقی کرتا گیا۔ اس کے حامیوں میں شیو نرائن گوکھلے۔ وی۔ آر۔ شندے۔ دی۔ اے سکھٹانکر۔ ڈی۔ جی۔ وید۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اور سب سے زیادہ سرگرم ممبر بلکہ اس کے روح رواں مسٹر رانا ڈے تھے۔ بعد میں سر نرائن چند اورکر نے بھی شامل ہو کر اس میں کام کیا۔ پرارتھنا سماج اب بھی بمبئی میں قائم ہے اور اس کی شاخیں علاوہ بمبئی کے صوبۂ مدراس میں بھی ہیں۔ سماجی اصلاح کی تحریک کو پرارتھنا سماج نے بڑی تقویت دی، بالخصوص بمبئی میں۔

انڈین نیشنل سوشل کانفرنس

(۳)

انڈین نیشنل سوشل کانفرنس ۱۸۸۷ء میں وجود میں آئی۔ اس کا پہلا اجلاس مدراس میں ہوا تھا۔ اس کے بانی اور روح رواں مسٹر راناڈے تھے۔ اس کے سالانہ اجلاس انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ ہی ساتھ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ کانگرس کے اکثر نامور لیڈر اور ڈیلیگیٹ اس میں شرکت کیا کرتے تھے۔ اس کی شاخیں سوشل رفارم ایسوسی ایشن کے نام سے مختلف صوبوں میں قائم ہو گئی تھیں اور صوبجاتی کانفرنسیں بھی مختلف صوبوں میں ہر سال ہوا کرتی تھیں۔ اکثر ہندو ذاتوں کی سبھائیں، انجمنیں، اور کانفرنسیں جو سماجی اصلاح کی تحریک سے ہمدردی رکھتی اور اس کی پیروی کرتی تھیں۔ اس کانفرنس سے ملحق تھیں۔ غرضکہ یہی تمام ملک میں سماجی اصلاح کی مرکز اور اس کی رہنمائی کرتی تھی۔ ذات پات اور چھوت چھات کی تفریق کا مٹانا غیر ممالک اور سمندر کے سفر کی ترغیب دینا، نیچ ذاتوں کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا، تعلیم نسواں کی ترغیب و ترقی کی کوشش کم سنی کی شادی کے خلاف آواز بلند کرنا، اور ازدواج بیوگان کو رواج دینا وغیرہ وہ سماجی مسائل تھے کہ جن کو سوشل کانفرنس نے حل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور سالہا سال وہ اس توجہ اور کوشش کا مرکز رہی۔ یوں تو کانفرنس کو مقبول بنانے اور اس کے مقاصد کو ترقی دینے کے سب ہی کام مسٹر راناڈے کی مساعی جمیلہ کا کرشمہ تھے لیکن ان افتتاحی ایڈریسوں کا سلسلہ ۱۳ سال تک یعنی تادم واپسیں جاری رہا۔

جو صاحب موصوف کانفرنس کے اجلاسوں میں ہرسال پڑھا کرتے علمیت اور جامعیت فصاحت و بلاغت، دانش مندی و دوربینی، مصالحت و شیریں کلامی کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہوتا تھا، سامعین کے لئے اُن کا نقطہ لفظ سچائی۔ پاکیزگی اور جذبۂ حب الوطنی اور جوش اپنے دامن میں لئے ہوتا تھا۔ اگر سماجی اصلاح کی تحریک کے عقائد وایمان اور اصول و طرز عمل یا اس سے واقفیت کی خواہش ہے کہ وہ کونسی طاقت تھی، وہ کون سا جادو تھا کہ جس نے اس میں جان ڈالی اور اس کو ملک میں مقبول بنایا تو ان تقریروں اور تحریروں کو غور و توجہ سے پڑھئے اور سوچئے۔ یہاں ٹوٹے پھوٹے فقروں میں ان کا ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ مسٹر راناڈے کی وفات کے بعد پہلے سرنرائن چند اور کرپھرا اور بہت سے اصحاب اس کے رہنما اور لیڈر رہے اور ۳۰ برس تک یہ تحریک دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی، لیکن کانفرنس کے سالانہ جلسے اس جاذبیت اور کشش سے محروم ہو گئے جو راناڈے مرحوم کے زمانہ میں ان کا طرۂ امتیاز تھیں کیوں؟

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

سوشل کانفرنس غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے طوفان کی ہل چل میں جہاں کانگریس کا نظام درہم برہم ہوا اور بہت سے ادارے تہ و بالا ہوئے وہاں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہ تو ضرور ہے کہ پچھلے پچاس سال میں وہ مسائل کہ جن کے حل کرنے کا بیڑا اس نے اُٹھایا تھا بہت کچھ حل ہو گئے اور جو رہ گئے ہیں ہوتے جاتے ہیں، لیکن اس کی تحریک اور اس کے کام کے جاری رہنے کی ابھی ضرورت شدید ہے اور عرصہ تک رہے گی۔ خوشی

کا مقام ہے کہ نیچ ذاتوں کے اُدھار کا کام تو مہاتما گاندھی نے اپنے ذمہ لے لیا ہے اور ہریجن سیوک سنگھ (HARIJAN SEVAK SANGH) اس کو باقاعدہ اور خوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ رہے سوشل اصلاح کے وہ نئے مسائل یعنی ہندوؤں میں طلاق کا رائج ہونا عورتوں کو حق وراثت ملنا۔ غیر قوموں کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج دینا وغیرہ وغیرہ یہ کام عورتوں کی کانفرنس یعنی ( ) ہمت و استقلال سے کر رہی ہے ان مسائل کا حل بھی عورتوں ہی کی کوشش سے ہو سکتا ہے۔ یہاں سوشل کانفرنس کی ۵۰ سالہ تاریخ یا رو مُداد دُھرانا منظور نہیں۔ نہ اس کا موقع ہے نہ گنجائش، لہٰذا اس مضمون میں مختصر یہ بتانے کی کوشش کی جائیگی کہ سوشل کانفرنس اور اصلاحی تحریکوں سے کس طرح اور کن کن باتوں میں مختلف تھی اور اس کے بانی نے اس کو کن عقیدوں اور اصولوں کو مدنظر رکھ کر قائم کیا تھا اور کس طرز عمل پر کاربند ہو کر یہ جاری رہی اور اس نے ترقی کی۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ سوشل کانفرنس آریہ سماج یا برہمو سماج کی طرح کوئی مذہبی اصلاح کی تحریک یا مذہبی جماعت نہ تھی، اس کو صرف سماجی اصلاح سے سروکار تھا۔ اس میں سب قوموں اور فرقوں کے لوگ خواہ ہندو ہوں۔ مسلمان۔ عیسائی ہوں یا پارسی، یکساں طور پر شریک ہو سکتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بالعموم اس کے حامی اور اس میں شریک ہونے والے ہندو ہی تھے۔ لیکن اس کا دروازہ کسی پر بند نہ تھا۔ چنانچہ ایک زمانہ میں سر اکبر حیدری مرحوم

اس میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ بعض عیسائی بلکہ انگریز مشنری بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں، بالخصوص ہندوؤں کے جتنے بھی رسم و رواج ہیں، کیا طرز بود و ماند کیا خورونوش کیا مرگ و زیست سب پر مذہب کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی آپ اصلاح کا نام لیں اور خیال کریں سب سے پہلے مذہب ایک سد سکندری نظر آتا ہے۔ شاستر اور پُران کی سند پیش کرنی لازم آتی ہے۔ اس لئے کسی اصلاح کے بھی پیش کرنے اور مقبول بنانے کے لئے لوگوں کو قائل کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا قدیم شاستر اور وید اصلاح کے خلاف نہیں بلکہ ہند قدیم میں ہمارے بہت سے رسم و رواج وہی تھے کہ جن کی آج ہم حمایت کرتے ہیں۔ درمیانی زمانہ میں ان کی صورت بگڑ گئی۔ اب اصلاح ہونی چاہئے۔ سوشل رفارم والوں اور مسٹر راناڈے کو اس سعی میں مجبوراً مذہب کی آڑ لینی پڑی اور اس سے مفر ممکن نہ تھا، لیکن آریہ سماج والوں کی طرح کہ جو ویدوں کو الہامی کلام یا الہامی کتاب مانتے ہیں اور جن کے عقائد و ایمان کی اساس و بنیاد احکام وید ہیں، سوشل کانفرنس والوں کا دستور حیات اس نوع کی کوئی چیز نہیں ہے۔ عقل سلیم اور ضمیر کی ہدایات ان کی مشعل راہ عمل ہیں۔ اگرچہ آریہ سماج کے سے جوش و خروش سے یہ معرا ہے۔ اور اس ملک کی ہر تحریک کی قبولیت و بقا کی ضامن مذہب کی پشت گری ہے جس کے فقدان کے باعث تعلیم یافتہ طبقہ نے بتدریج اس کی طرف توجہ کی۔ لیکن جو ہمہ گیر اور پائدار اثر اس نے کیا ہماری سوسائٹی کا کایا پلٹ اس کی شاہد ہے۔ سوشل کانفرنس کی تحریک اور آریہ سماج میں ایک

بین اختلاف یہ ہے کہ سماج کی تعمیر کلیتہً دیسی مواد و مصالح سے کی گئی ہے۔ اس کا بلند ترین مطمح نظر یہ ہے کہ آج بیسویں صدی میں پانچ ہزار سال پہلے کے ہند قدیم کو کسی طرح اس کے اصلی رنگ روپ میں جیتا جاگتا ہمارے سامنے لا کھڑا کرے۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتے تھے۔ ان کے دماغ پر ایک یہی خیال مسلط تھا جسے اُنھوں نے بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کر کے اپنی ہمت و استقلال سے ہندوستان بھر میں پھیلا دیا۔ مسٹر راناڈے کا دماغ نہایت جامع اور وسیع تھا۔ اُن کے عقیدے۔ ایمان۔ اصول اور طرز عمل مشرق و مغرب دونوں کے بہترین خیالات اور کلچر کا مجموعہ تھے۔ اسی سے اُنھوں نے سوشل کانفرنس کے پودے کی آبیاری کی تھی اور وہ ہندوستان کو ایسا چمن بنانا چاہتے تھے کہ جس میں مغرب کے پھولوں کا رنگ روپ اور مشرق کے پھولوں کی بو باس ہو۔ ہمارے پُرانے خزانے میں جو کچھ اثاثہ موجود ہے اسے محفوظ رکھنا چاہئے لیکن غیر ولایتوں سے علم و فضل۔ سائنس فلسفہ اور کلچر سے اس میں جو اضافہ ممکن ہے اُس کے حاصل کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ اسی عقیدے اور اصول پر اُنھوں نے سوشل کانفرنس کی بنیاد رکھی تھی اور اسی طرز عمل پر وہ کاربند رہے۔

سماج اپنی حیات کے لئے جس جذبہ کی منت کش ہے اُس کا ذکر ابھی ابھی ہو چکا ہے۔ وہ تنِ مُردہ میں روح پھونکنے کی مدعی ہے اس کا نعرۂ جنگ یہی ہے لیکن کانفرنس اس سعی کو تحصیل حاصل سمجھتی ہے وہ یقین رکھتی ہے کہ یہ مُردہ اب کسی مسیحا کے قم باذنی کہنے سے

حیات نو سے معمور نہیں ہو سکتا۔ اس کا منتہائے نظر ایک نیم جان کا کایا پلٹ ہے۔ اسی مباحثہ اور معرکہ کو انگریزی میں (REVIVAL (REFORM (Controversy کی کہتے ہیں۔ امراؤتی کانفرنس کے اجلاس میں مسٹر راناڈے نے جو ایڈریس پڑھا تھا وہ آج بھی اس سلسلہ میں غور و توجہ کا محتاج ہے۔ ان اختلافات کے علاوہ آریہ سماج اور برہمو سماج سے سوشل کانفرنس اس لحاظ سے بھی ممیز و ممتاز ہے کہ دونوں سماجوں نے عقیدے اور اصول کی بناء پر ہندو قوم سے بغاوت اور قطع تعلق کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ مسٹر راناڈے اور سوشل کانفرنس والے "بغاوت" کے طریقے کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہندو قوم سے وابستہ رہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اگر ہم قوم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس کی کایا پلٹ کر سکتے ہیں تو ہم کو قوم ہی کے دامن سے پیوستہ رہنا پڑے گا تاکہ اندر ہی اندر اصلاح ممکن ہو۔ یہ کام عَلَم بغاوت اٹھا کر اور دامن سے دور رہ کر نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے غافل نہ تھے کہ مصالحت اور دبنے کے طریقے کے معنیٰ طول عمل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ جس انقلاب کی وہ تمنا رکھتے ہیں وہ طالب وقت ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی۔ وہ اس پر بھی شکیبا تھے کہ اس کام کی داغ بیل ڈال کر زمین تیار کر دیں اور بیج بو دیں، کھیت کو پانی دے کر فصل تیار کرنا، اس کا کاٹنا اور اس سے فائدہ اُٹھانا آیندہ نسلوں کا کام ہوگا۔

آپ مسٹر راناڈے کی اعلیٰ اور نادر شخصیت اور ان کی اولوالعزم

ہستی کا صحیح اندازہ اُس وقت تک نہیں کر سکتے کہ جب تک آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ اُن کے دل و دماغ کی نشو و نما کن خیالات و جذبات سے ہوئی تھی۔ اُن کے مسلک زندگی کی تہ میں کس عقیدے اور ایمان کی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ وہ کون سے بنیادی اصول تھے کہ جن پر وہ عمر بھر کاربند رہے۔ اس کی توضیح اور بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے کہ جس کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ موقع۔ تاہم اس مضمون کی تکمیل کے لئے لازمی ہے کہ اس بارے میں مختصراً کچھ ضرور کہا جائے۔
مسٹر راناڈے کا پہلا عقیدہ یہ تھا کہ جس کو وہ ایمان کی طرح عزیز رکھتے تھے کہ باوصف اس ذلیل اور گری ہوئی حالت کے جس میں آج ہم اپنے تئیں دیکھتے ہیں اور جو ہماری ہمت کو پست کرتی ہے ہمارا ملک اور ہماری قوم ایک دفعہ پھر اُبھرے گی اور ہم منزل مقصود تک پہونچ کر رہیں گے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر بنی اسرائیل کی چند ہزار کی قوم کا تہذیب و تمدن کی شاہراہ سے ہٹ جانا اور تتر بتر ہو کر دنیا بھر میں بکھر جانا لیکن پھر بھی سیکڑوں برس بعد تک اپنی ہستی کا قائم اور منزل مقصود کے ارمان کا تازہ رکھنا ایک معجزہ ہے، تو کیا ہماری کروڑوں کی قوم کا ترقی و اقبال کی بلندی سے گر کر مائل بہ زوال ہو کر اور تقریباً پانچ ہزار سال تک ادبار کے مختلف درجے طے کر کے آفات ارضی و سماوی کے مقابلہ کی تاب لا کر آج تک اپنی ہستی قائم رکھنے بلکہ عروج و اقبال کے ارمان ظاہر کرنے میں مشیت ایزدی کو دخل نہیں؟ مشیت ایزدی کی توفیق کا عقیدہ تو فرداً فرداً ہر شخص کے ضمیر و ایمان کا سوال ہے لیکن اس موقع

کون انکار کرسکتا ہے کہ پچھلے پانچ ہزار سال میں نہ معلوم کتنی قومیں اُبھریں اور مٹ گئیں۔ کیسی کیسی تہذیبوں اور تمدنوں کی نشو و نما ہوئی اور وہ خاک میں مل گئے۔ تاریخ ان عبرت ناک واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن ہماری قوم نے اس طویل زندگی کی نہ معلوم کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد آج بھی اپنی ہستی کو مٹنے نہ دیا بلکہ جیتی جاگتی اُبھرنے کے ارمان ظاہر کر رہی ہے۔ کیا یہ ہمت افزا نہیں ؟

مسٹر وانا ڈے کا صرف یہی عقیدہ نہ تھا کہ ہمارے ملک اور ہماری قوم کے عروج و اقبال کا افتاب پھر ایک بار نصف النہا پر پہنچے گا، بلکہ وہ تو یہ بھی یقین کرتے تھے کہ ہم پر جو پچھلے سیکڑوں برسوں میں بندگی، بیچارگی اور بے کسی کی اُفتادیں پڑیں اُن میں بھی خدائے کارساز کی مشیت کار فرما تھی۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ ہم کو ان سے سبق دے اور ہم غیروں کی ماتحتی اور بندگی میں رہ کر زندگی کے نظام و تربیت کا وہ سبق سیکھیں کہ جس کی ہم کو ضرورت ہے۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں مشیت ایزدی اور مصلحت خداوندی پر اعتقاد رکھنا یا نہ رکھنا تو ہر شخص کے ذاتی خیال اور ایمان کا سوال ہے مگر اس تاریخی واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہم نے گزشتہ ہزار سال کی مدت میں جو جو افتادیں ہمارے مقدر میں تھیں، اُٹھائیں لیکن اس عرصہ میں بہت کچھ حاصل بھی کیا کہ جس کا اقرار نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ بہت سے وہ علوم و فنون کہ جن سے ہم بے بہرہ تھے ہم نے

مسلمانوں سے سیکھے۔ ہمارے تہذیب و تمدن فلسفہ۔ آرٹ اور کلچر
پر اسلامی تہذیب و تمدن فلسفہ آرٹ اور کلچر کا نہایت پائدار اور
نمایاں اثر پڑا اور اس خلط ملط سے نہ صرف ہندوستانی کلچر کی
بنیاد پڑی بلکہ ہم نے زندگی کے بعض شعبوں میں خاطر خواہ ترقی کرکے
ان میں چار چاند لگائے۔ ہماری سیرت اور خصلت میں جو خامیاں
تھیں مسلمانوں کی صحبت اور اثر سے نکل گئیں، اس کا ثبوت تاریخ
کے اوراق سے ملتا ہے۔ جس وقت مسلمانوں کے حملے ہندوستان
پر شروع ہوئے ہمارے راجپوت سوربیرا اور سورما اور اُن کی فوجیں
مسلمان حملہ آوروں کے مقابلہ میں اس طرح تتر بتر ہو کر بکھر گئیں کہ
جیسے ریت کے تودے آندھی کے طوفان میں غبار ہو کر اُڑ جاتے ہیں،
لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں مرہٹوں اور سکھوں نے
جب کروٹ بدلی اور سنبھالا لیا تو دکن میں شیواجی اور شمال میں
رنجیت سنگھ کی ہمرکابی میں قوم اس طرح سینہ سپر ہوئی کہ ایک
آہنی دیوار تھی کہ جس سے مقابلہ کرنے والے آکر ٹکراتے تھے۔
رنجور ہوتے تھے لیکن کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ علم تاریخ
فن سپہ گری، آئین ملک گیری اور ملک داری میں ہم نے مسلمانوں
کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

اب انگریزوں کے دور حکومت میں ڈیڑھ سو برس سے ہماری
آنکھیں نئی روشنی سے کسب ضیا کر رہی ہیں، جذبۂ حب الوطنی
جوش آزادی۔ آئین و دستور جمہوریت۔ شہری زندگی کی ذمہ داریاں
اور فرائض۔ مخلوق کی بہبود کے لئے مل جل کر کام کرنے کی عادت

وغیرہ وغیرہ انسانی سرشت و سیرت کے وہ خصائل ہیں کہ جن کی ہم ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں میں کمی تھی اس کی تربیت اور عادت اب انگریزی دورِ حکومت میں ہوتی جاتی اور بڑھتی جاتی ہے اور یہ یقیناً منزلِ آزادی کے طے کرنے کا لازمی توشہ اور زادِ راہ ہے۔

دوسرا خیال جس کو مسٹر راناڈے کے دستورِ زندگی کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیئے یہ تھا کہ ہماری بہبودی اور ترقی محض اس سے نہ ہوگی کہ ہم سوسائٹی کی بعض بُری رسموں اور رواجوں کی اصلاح کریں یا ظاہرا سوٹ بوٹ پہن کر، ہوٹلوں میں کھانا کھاکر نیا چولا بدل کر رفارمر کہلانے لگیں بلکہ ترقی و اصلاح کا راز یہ ہے کہ وہ تنگ، پست اور دقیانوسی خیالات کو جو صدیوں سے ہمارے دل و دماغ کا آج جزو ہو رہے ہیں، جو ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکے ہیں، اور جن کے باعث ہر قبیح رسم کے دور کرنے یا اصلاح کے وقت ہمارے قدم ٹھٹکتے اور آگے بڑھنے سے رُکتے ہیں اُن کو کسی طرح سے دماغ سے نکالا اور اُن کی اصلاح کی جائے۔ مثلاً کوئیں کے مینڈک کی سی زندگی بسر کرنا اور کنوئے ہی کو اپنی دنیا سمجھنا ہماری فطرت ثانیہ ہو گئی ہے۔ اس دنیا سے باہر جو عالم آباد ہے ہم اُس سے بیگانہ ہیں۔ ہندوؤں کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہو کر لامحدود فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور وہ خود ساختہ قیود کے دام میں ایسے گرفتار ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے سب سے الگ تھلگ اپنی دنیا بنالی ہے اور اس کی حدود سے باہر قدم نہیں نکلتا۔ یہ زہر آج سے نہیں بلکہ

صدیوں سے ہمارے رگ وپے میں ساری وطاری ہے۔ وید اور شاستر کی سند۔ گروؤں اور پروہتوں کی چیرہ دستیاں۔ پنچایت والوں کا خوف اور ایسے ہی دیگر خارجی اثرات کے آگے ہم ہمیشہ سر جھکانے کو تیار ہیں لیکن خود اپنے ضمیر اور دین و ایمان کی ہدایت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں جھوٹ۔ فریب دغا مکاری۔ چوری۔ بدمعاشی۔ بدچلنی اور سیکڑوں ایسی ہی برائیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ان برائیوں کا رواج عام ہے اس لئے ہم ان سے چشم پوشی کرتے ہیں اور برائی کو برائی اور عیب کو عیب ہی نہیں سمجھتے، ہندوؤں میں تقدیر کی ناخن تدبیر سے عقدہ کشائی ناقابل برداشت زحمت ہے۔

مسٹر راناڈے کہا کرتے تھے کہ اس تعطل دماغی کو دور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کی جگہ روحِ عمل پیدا کرنی چاہئے۔ اس سے جو انقلاب رونما ہوگا وہ رسوم قبیحہ کی رفتہ رفتہ بیخ کنی کردے گا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قوم امراض لاحقہ و عارضی میں مبتلا ہے جو تدبیر و علاج سے رفع دفع کئے جاسکتے ہیں۔ تدبیر و علاج ہمیشہ وقت چاہتے ہیں۔ قومی اصلاح میں بھی وقت لگے گا ہمیں مایوس و بے قرار نہ ہونا چاہئے۔ وہ اس سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ ہندو قوم آج کی مریض نہیں بلکہ اس کا مرض پرانا ہے اور جو زہر اس کے خون میں سرایت کئے ہوئے ہے اُس نے اس کے عضو عضو کو کھوکھلا کر دیا ہے، ایسی حالت میں مریض تنگ مزاج ضدی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ دوا کے پینے سے گریز کرتا بلکہ اپنے

معالج اور تیمار دار کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ چونکہ صاحب دل اور صاحب دماغ تھے وہ سمجھتے تھے کہ مریض سے روٹھ جانا، قطع تعلق کرنا، یا علاج چھوڑ دینا دانش مندی نہیں، معالج کو صبر۔ استقلال ہمت اور خندہ پیشانی سے کام لینا چاہئے۔ ان کی تمام زندگی شاہد ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہی قوم کے ہاتھوں زک پر زک اُٹھائی ہدف طعن ولعن بنے، لوگ بدگمانی سے پیش آئے، لیکن اُن کا قدم جادۂ صبر و استقلال سے کبھی نہ ڈگمگایا۔ اُن کی ہمت کبھی پست نہ ہوئی۔ اُنھوں نے ہر موقع پر مصالحت اور خندہ پیشانی سے کام لیا۔ کیونکہ اُنھیں یقین تھا کہ قوم کے مریض کا مزاج اور برتاؤ جیسا ہے وہ قدرتی اور لازمی ہے۔ یہ کچھ اُن ہی کی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ایسی حالت میں ہر مریض کی یہی روش ہوتی ہے۔ برداشت کرنے اور استقلال اور ہمت سے کام لینے کے سوا چارہ نہیں۔ وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ قوم کو منازل ارتقا طے کرانے اور بام عروج پر پہنچانے کے لئے صدیاں درکار ہیں، اور آیندہ نسلیں ہی اس کی ضامن و کفیل ہو سکتی ہیں۔ ان کی خواہش و تمنا تھی تو یہ کہ وہ ارتقائے قومی کا سنگ بنیاد مستحکم و استوار اساس پر رکھ جائیں۔ ایوان قومی کیسی پختہ بنیادوں پر قائم کیا اور اس طبیب حاذق نے اپنے مریض کے علاج کے لئے کیا کیا تدبیریں کیں، قومی خدمت کرنے والوں کی چشم دوربیں سے پنہاں نہیں۔

فضا میں یہ صدائیں گونج رہی ہیں کہ اُس وقت تک زندگی کے کسی شعبے میں ترقی ممکن نہیں۔ جب تک کہ ہماری قوت عمل کے پاؤں

میں جو بیڑیاں غیروں نے ڈال رکھی ہیں نہ کاٹ دی جائیں۔ لہذا ہماری
توجہ کا مرکز حصول آزادی ہونا چاہئے۔ سیاسی جدوجہد قوم کا
فرض اوّلیں ہے۔ ہمارے حریف۔ مخالف اور ناصح رٹ لگائے ہوئے
ہیں کہ جب تک قوم کی طرز معاشرت نہ بدلے گی قبیح رسم ورواج کی
اصلاح نہ ہوگی عروس آزادی کے روئے تاباں پر سے نقاب نہ
اُٹھے گی۔ بعض کا خیال ہے کہ اشاعت تعلیم ہی مرکز توجہ ہونی چاہیئے
کیونکہ ترقی کا یہی بنیادی اصول ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسئلۂ شکم
پروری کو سب پر فوقیت ہے قوم اور ملک کی اقتصادی اور مالی
حالت نہ سنبھلی تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ مسٹر راناڈے ان آرا سے متفق
نہ تھے اُن کے مسلک کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہم کو ہر قومی شعبے کی
ترقی کی طرف بیک وقت توجہ کرنی چاہئے۔ تقدیم و تاخیر کی اُلجھن میں
پڑنا غلطی ہے۔ اگر آپ اپنا جسم سڈول اور طاقتور بنانا چاہتے ہیں تو
آپ کو اس قسم کی ورزش کرنی چاہیئے کہ جو نہ صرف آپ کے سینہ
اور بازو کو تیار کرے بلکہ آپ کی گردن۔ آپ کی کلائیاں۔ آپ کی
پنڈلیاں سب کو بیک وقت سڈول سانچوں میں ڈھال ڈے۔
ایک اور مثال عرض ہے انسان کی نشو و نما۔ دماغ اور جسم تینوں پر
منحصر ہے۔ اگر جسم کی غور و پرداخت کر کے اس کو طاقتور اور سڈول بنایا
جائے اور دماغ کی تعلیم و تربیت سے غفلت برتی جائے تو وہ ناقص رہ
جائے گا۔ یا اگر دماغ کی نشو و نما مرکز توجہ بنی رہی اور جسم کی طرف سے
غفلت برتی گئی تو صحت خراب ہو جائے گی اور کام چلنا ہی دشوار
ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان کی دماغی اور جسمانی نشو و نما ہو لیکن نازک

اور لطیف حسیات اور جذبات کی نشو و نما نظر انداز کر دی جائے تو بھی انسان کی انسانیت میں بہت بڑی کمی رہ جائے گی اور توازن قائم نہ ہونے پائے گا۔ مسٹر ہوانا ڈے عالم با عمل تھے، اُن کے خیالات کی پرواز اور قوت عمل میں ہم آہنگی تھی اس لئے جو کچھ کہتے تھے کرتے بھی تھے، ان کے خیالات صفحۂ قرطاس ہی پر نہیں بلکہ دنیائے فعل و عمل میں بھی جلوہ آرائی کرتے تھے۔

خیالات و جذبات تھے۔ یہ عقیدہ و ایمان تھا۔ یہ طرز عمل اور مسلک تھا اُس شیدائے وطن اور رہنمائے قوم کا کہ جس نے آج سے ساٹھ ستر برس پہلے ہمارے قومی چمن کی آبیاری کی تھی اور ملک کے ارتقاء و آزادی کا وہ بیج بویا تھا کہ جو پھوٹ اور پھیک کرتا ور درخت بن گیا جس کے پھولوں کی مہک نے رہروان منزلِ آزادی کا مشامِ جان معطر کیا ہے۔ نہ صرف ہم ہی بلکہ آیندہ نسلیں بھی کبھی اس چمن آرائے گلشنِ سیاست و تمدن کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

سرسید احمد خاں

اور

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

آج سے تقریباً سو برس پیشتر جن بزرگوں نے نئے ہندوستان کی بنیادیں ڈالی اور پختہ کی تھیں اُن میں سرسید احمد خاں کا نام نامی بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی یاد کا تازہ کرنا اور اُن کی زندگی کا تذکرہ سُنانا یہاں بے محل نہ ہوگا۔ سرسید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک شریف اور رئیس خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے جد امجد سید دوست محمد پانچ نسل پیشتر شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اُنھوں نے دکن کی مہموں میں خدمات شاہی ادا کیں اور پھر ہرات واپس چلے گئے۔ اُن کے لڑکے سید بُرہان ہرات سے آکر دہلی میں بس گئے (سید ہادی سید دوست محمد کے پوتے تھے) سرسید احمد کے دادا تھے اور دربار شاہی سے اُنھیں جوادالدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ میر تقی سید احمد کے والد فقیر منش آدمی تھے گو دربار شاہی سے اُن کا تعلق قائم تھا اور بادشاہ اُن پر مہربان تھے اُنھوں نے دربار میں کوئی منصب یا خطاب حاصل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میر تقی خواجہ فرید کے داماد تھے۔ خواجہ فر

کے بزرگ کشمیر سے آکر دہلی میں بس گئے تھے اور تجارت کے کاروبار میں نام پیدا کیا تھا۔ خواجہ فرید بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے اور سیاسیات کے معاملات میں اُن کو دخل اور اچھی سمجھ تھی۔ بلکہ بڑی قابلیت رکھتے تھے۔ سر جان مالکم کی سفارت میں جو انگریزی سرکار کی طرف سے تہران بھیجی گئی تھی وہ شامل تھے اور پھر مدت تک آوا میں انگریزی حکومت کی طرف سے ایجنٹ رہے۔ سرسید کے والد میر تقی نے اپنے داماد کے توسط اور شہنشاہ کی مہربانی سے دربار شاہی میں وزیر اعظم کا مرتبہ پایا۔ جہاں تک خاندانی شرافت اور ریاست کا تعلق ہے سید احمد خاں نہایت خوش نصیب تھے اور ددھیال اور ننھیال دونوں اُنھیں اونچے درجے کے ملے تھے۔

سید احمد خاں جس زمانہ میں پیدا ہوئے اور جس ماحول اور فضا میں اُنھوں نے پرورش پائی وہ بھی اپنے انداز کے لحاظ سے عجیب و غریب تھا۔ سلطنت مغلیہ کا دور دورہ ختم ہو رہا تھا اور انگریزی حکومت کی بساط بچھ رہی تھی۔ پُرانی تہذیب کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور بجھنے والا تھا۔ نئے تہذیب و تمدن نے دنیا کے اس خطے کو اپنی جگمگاہٹ سے ابھی روشن نہیں کیا تھا لیکن بصیرت کی نگاہیں اس افق کے دھندلکے میں نئی روشنی کی کرنیں پھوٹتی دیکھنے لگی تھیں۔ گو شبراون اور چلیانوالا کے معرکے ابھی انگریزی فوجوں نے سر نہیں کئے تھے لیکن آخری مرہٹہ لڑائی میں انگریزوں کی فتح نے اُنھیں اس ملک کا حکمران بنا دیا تھا۔ پر جس شخص نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے سے نازک زمانہ میں انگریزی حکومت

کے استحکام کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کیا اور جو بعد میں سلطنت برطانیہ کا ایک رکن اور قوت بازو سمجھا جاتا تھا اس نے چغتائی نسل کے آخری دربار شاہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور پرانی محفل کی شمع کو اپنی آنکھوں سے ٹمٹماتے اور بجھتے دیکھا تھا سلطنت مغلیہ کے پایۂ تخت دہلی نے جہاں سید احمد خاں پیدا ہوئے اور انھوں نے پرورش پائی کی عظمت کے نقش و نگار مدہم پڑتے جاتے بلکہ مٹ رہے تھے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شہر دہلی بھی عجوبۂ روزگار ہے۔ اس کی ہزاروں برس کی زندگی میں کتنے ہی انقلابوں کی آندھیاں اس کے سر سے گزریں جنھوں نے اس کو برباد و تاراج کیا لیکن اس کے اٹل مقدر کو مٹا نہ سکیں۔ حکومتیں بنیں اور بگڑیں تہذیبیں ابھریں اور مٹیں تاریخ ان کی تصویروں اور کرشموں سے بھری پڑی ہے۔ ہندو تہذیب و تمدن کے زمانہ میں یہ پرتھوی راج کی راجدھانی تھا مسلمانوں نے آکر اپنے حملوں سے اسے زیر کیا اور پھر ان کی حکومت کا مرکز رہا۔ شاہجہاں نے اس کو از سر نو سنوارا اور یہ اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور سلطنت مغلیہ کا دارالحکومت قرار پایا قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ نادر شاہ نے حملہ کیا اور برن بولا کر اس کی زمین پر خون کی ندیاں بہائیں۔ بعد میں احمد شاہ ابدالی نے جو کچھ رہا سہا تھا اس کو لوٹ کھسوٹ کر تنگ کیا بالآخر چغتائی نسل کا آخری نام لیوا جو نام کا بادشاہ تھا لیکن بادشاہت جسے چھوڑ کر بہت دور بھاگ گئی تھی انگریزوں کے ہاتھوں مقید ہو کر وطن سے دور غیر ملک میں بے یار و مددگار موت کے گھاٹ اترا۔

اس پُرانے دور کی یادگار میں اس کے نقش و نگار جواب ماند پڑ گئے ہیں اور اُس تہذیب و تمدن کی مٹی مٹائی نشانیاں جواب بھی دیکھنے میں آتی ہیں جب آج بھی ہمارے دلوں میں چٹکیاں لیتی اور طبیعتوں میں گدگدیاں کرتی ہیں تو اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ۱۸۱۷ء میں کہ جب تک شاہی دربار کا ظاہری کرو فر باقی تھا دہلی والوں کے لئے اس کا یقین کرنا کہ ان کی عظمت و عروج کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا کس قدر مشکل ہوگا۔ ظاہرا اُس وقت تک سب کچھ موجود تھا۔ شاہی دربار تھا۔ وزرا و مدبّر بھی تھے گو تدبّر کی جگہ صرف رقابت و چالبازیاں باقی رہ گئی تھیں خسرو اور فیضی کے سے باکمال شعرا تو اب کم تھے لیکن دہلی ابھی غالب۔ ذوق و مومن سے خالی نہ تھی۔ پُرانے ادیب عالم و فاضل اب بھی باقی تھے لیکن کسی نئے خیال نئے فلسفہ نئے اسلوب کی اہلیت اُن میں نہ تھی۔ فوجی افسر و سپاہی بھی تھے لیکن ان کے ہتھیاروں میں زنگ لگا ہوا تھا اور اُن میں کوئی بل بوتا نہ تھا۔ غرضکہ راجہ۔ مہاراجہ۔ بادشاہ۔ بادشاہ کا دربار۔ دیوان عام و دیوان خاص۔ تخت شاہی اور ظاہری کرو فر سب ہی کچھ تھا لیکن اس کی اصلیت کچھ نہ تھی۔ صرف پُرانی عظمت کا خواب یا سایہ باقی رہ گیا تھا لیکن یہی دہلی والوں پر جادو کا اثر رکھتا اور اُن کی طبیعتوں کو مست و مگن کئے ہوئے تھا۔

اس مٹی مٹائی تہذیب کے زمانے اور اس دقیانوسی سوسائٹی میں سید احمد خاں پیدا ہوئے اور اسی فضا میں اُن کی پرورش اور نشو و نما ہوئی اُن کی تعلیم معمولی درجہ کی تھی۔ فارسی خاصی اچھی اور

کچھ عربی بھی پڑھی تھی۔ اپنے دادا کے ساتھ دربار شاہی میں اکثر حاضر ہوتے اور بادشاہ کے کرم و بخشش سے فیض یاب ہوتے جیسا کہ کہا جا چکا ہے سرسید کے باپ فقیر منش آدمی تھے اور بہت عمر تک زندہ بھی نہ رہے۔ اُن کی پرورش و تعلیم ماں کے سایۂ عاطفت اور ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ سید احمد خاں کی ماں بڑے باپ کی بیٹی اور اچھے دل و دماغ کی عورت تھیں۔ بچوں کو تعلیم و تربیت کس طرح دی جاتی ہے اس کا راز اُنھیں معلوم تھا۔ سید احمد خاں اپنی ماں کے فیضانِ تربیت کا ہمیشہ اعتراف کرتے اور اس کے شکر گزار تھے۔ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں اس کی ایک دلچسپ مثال دی ہے۔

"سرسید لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں میری عمر گیارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پُرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو اُنھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا اُسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا، دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ اُنھوں نے کہا۔ دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپائے دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں

تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اُس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کردوں گی۔ میں نے ڈیوڑھی میں جاکر نوکر کے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔"

اُس زمانے کے رئیس زادوں کے عنفوانِ شباب کے مشغلوں میں رقص و سرود کی محفلوں اور مجروں میں شرکت خاص مشغلہ تھا۔ چنانچہ سید احمد خاں بھی اپنے بھائی اور یار دوستوں کے ساتھ تیراکی کے میلوں، باغوں کی سیروں، ہولی اور بسنت کے جلسوں اور مجروں اور شاہ صاحبوں کے عُرسوں میں جایا کرتے اور اُن کا لطف اُٹھاتے تھے۔ ان کا بیان کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں کہ :-

"سرسید کا مذکورۂ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا اگرچہ اُس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ اُن کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لئے ان کی سوسائٹی میں اُن خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں۔ بے فکرا امیرزادے عیاشی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ

سر سید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر
بھی اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے۔
لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے باوجود غایت
دل بستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھیں سر سید
نے جس طرح اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ دراصل
اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن
کی اخلاقی قوت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیئے۔"

جب سید احمد خاں نے ہوش سنبھالا تو سب سے پہلا اہم
واقعہ اُن کی زندگی کا یہ تھا کہ ۱۸۳۷ء میں اُنھوں نے دربار شاہی
سے اپنا پنڈ چھڑا کر انگریزی سرکار کی ملازمت قبول کی۔ اُن کے
تمام اعزا و اقربا اس کے قطعی خلاف تھے لیکن اُنھوں نے ایک نہ
سُنی۔ چند سال کے بعد ۱۸۴۶ء میں وہ منصف کے عہدہ پر مقرر
ہوئے اور ان کا تبادلہ دہلی کا ہو گیا۔ وطن کی محبت اُن کے دل پر
گھر کئے ہوئے تھی۔ یہاں پہنچ کر بڑی تفتیش اور کوشش کے بعد
اُنھوں نے "آثار الصنادید" تصنیف کی۔ نظر ثانی کے بعد اس کا
دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء میں یہ کتاب
فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہو کر فرانس سے شائع ہوئی۔ اسی کی شہرت کے
بدولت سید احمد خاں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو یعنی اعزازی
ممبر منتخب ہوئے۔

۱۸۵۷ء کا غدر بھی سید احمد خاں کی زندگی میں بڑی اہمیت
رکھتا ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ اُن کی اس میں سرکاری خدمات کا

موقع ملا لیکہ خصوصاً اس وجہ سے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے سیاسی نقطۂ نظر سے ان کے دماغ و خیالات کی قطعی کایا پلٹ کر دی۔ اس کا تذکرہ آیندہ چل کر ہو گا۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں سید احمد خاں بجنور میں اپنے عہدہ پر مقرر تھے اُنھوں نے ہر امکانی کوشش یہاں انگریزوں اور اُن کے بال بچّوں کی حفاظت اور جان بچانے کی کی اور اُن کو محفوظ رکھ سکے۔ جب باغی لیڈر محمود خاں کو ہندو چودھریوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو سید احمد خاں نے میرٹھ کے اسپیشل کمشنر کو مفصّل حالات سے مطلع کیا اور اس کی ہدایت کے مطابق بجنور کے ضلع کا انتظام وبندوبست سید احمد خاں کے ذمہ رہا۔ ہندو چودھریوں کی شکست کے بعد سید احمد خاں کو بجنور چھوڑ کر وہاں سے بھاگنا پڑا اور بعد خرابی بسیار جان بچا کر میرٹھ پہنچ گئے۔ انگریزی حکومت کے استحکام اور ملک میں امن و امان قائم ہونے کے بعد سید احمد خاں پھر بجنور پہنچ گئے اور کچھ عرصہ بعد اُن کا تبادلہ مراد آباد کا ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اُن کو غدر کے بعد سے مسلمانوں کی زبوں تر حالت دیکھ کر قومی خدمت کے جذبہ کا احساس ہوا جو اُن کو دن رات بے چین رکھنے لگا۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور اپنی ہمت جفاکشی، ایثار، بے غرضی اور استقلال کے ہتھیاروں سے عمر بھر اپنوں اور غیروں سے لڑائی لڑا کئے کہ جس میں بالآخر اُن ہی کی جیت رہی اور وہ کام کر گئے کہ جو نسلاً بعد نسلاً اُن کے نام کو زندہ رکھے گا۔

مراد آباد پہونچ کر جب سید احمد خاں نے مسلمانوں کی

زبوں تر حالت کے سنبھالنے اور اُن کی اصلاح معاشرت کرنے پر توجہ کی تو پہلی بات اُنھوں نے یہ سوچی کہ غدر کے زمانہ میں اور اس کے بعد جو بدگمانی انگریزی سرکار کو مسلمانوں کی طرف سے ہو گئی تھی اُس کو کسی طرح دور کیا جائے۔ اس غرض سے اُنھوں نے "اسباب بغاوت ہند" کے عنوان سے ایک پمفلٹ لکھا۔ یہ پمفلٹ دور اندیشی کے خیال سے ہندوستان میں عام طور سے شائع نہیں کیا گیا لیکن اُس کا انگریزی ترجمہ مُدبّران برطانیہ اور پارلیمنٹ کے ممبروں میں عام طور سے شائع ہوا اور اُن لوگوں کی نظروں سے گزرا۔ اس میں سر سید احمد خاں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا غدر مسلمانوں کی سازش یا جہاد کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے اسباب بالکل مختلف تھے۔ سب سے بڑی وجہ اُنھوں نے یہ قرار دی کہ حکومت اور عمال حکومت اور رعیت کے درمیان کوئی رابطۂ اتحاد نہ تھا بلکہ بالکل غیریت اور اجنبیت تھی۔ اگر سپریم کونسل میں علاوہ انگریزوں کے ہندستانی بھی موجود ہوتے تو وہ رعیت کے دُکھ درد کو حکومت کے سامنے پیش کر سکتے تھے اور حکومت کی نیت اور مقصد کا صحیح مفہوم رعیت تک پہونچا سکتے تھے۔ چونکہ سرکار نے رعیت سے کوئی واسطہ اور رابطہ نہیں رکھا تو بدگمانی اور غلط فہمیاں پھیلتی گئیں۔ دوئم سرکار کی پالسی محکمۂ مال کے متعلق ٹھیک نہیں تھی۔ مالگزاری نقد ادا کی جاتی تھی اور مالگزاری میں بہ نسبت سابق کے بہت کچھ اضافہ کر دیا گیا تھا تیسری بات جو سید احمد خاں نے اس رسالہ میں کہی تھی یہ تھی کہ انگریزی حکام کا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت خراب

تھا یعنی تنفر اور تحقیر کا سلوک ان کے ساتھ کیا جاتا تھا یہی وجہ بدگمانیاں پھیلانے کی ہوئی جس سے فوج میں سرکار کے خلاف شورش پیدا ہوئی حتیٰ کہ غدر کی نوبت آئی۔ اس پمفلٹ کے مضمون سے جو خاص بات عیاں ہوتی ہے یہ ہے کہ سید احمد خاں نے اس میں صرف مسلمانوں کی طرف سے ہی وکالت نہیں کی تھی بلکہ ہندستان کی تمام رعیت کی نیابت بھی کی تھی اور ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھا تھا کہ جو آیندہ نیشنل کانگریس نے اپنے پروگرام میں شامل کیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے ایک اخبار "وفادار مسلمانانِ ہند" کے نام سے نکالا جس کے صرف چند پرچے ہی شائع ہو سکے۔ اب سید احمد خاں کا مسلک اور نظریہ بدلنے لگا تھا، اور پہلی سی وسعتِ خیال اُن کی پالسی میں قائم نہیں رہی تھی۔ اب وہ صرف مسلمانوں کو ہی وفادار ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اُنھوں نے صرف اُن رسالوں اور اخباروں کے نکالنے پر قناعت نہ کی بلکہ مسلمانوں کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی اور جب اُن کا تبادلہ غازی پور کا ہو گیا تو وہاں پہنچ کر اُنھوں نے وکٹوریہ اسکول اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس میں اُردو میں تراجم شائع ہوتے تھے۔ بعد میں یہ سوسائٹی علی گڑھ منتقل ہو گئی اور وہاں اس کی عمارت کتب خانہ اور ہال سید احمد خاں کی کوششوں سے تعمیر ہوئے اور اچھی اچھی انگریزی کتابوں کے ترجمے شائع کئے گئے۔ اس زمانہ میں سید احمد خاں نے بائبل کی تفسیر بھی لکھی کہ جس سے یہ ثابت کرنا منظور تھا کہ قرآن اور بائبل میں اتنا بُعد نہیں ہے کہ جس قدر عام طور سے بدگمانی ہے اس کی غرض عیسائیوں اور مسلمانوں کو قریب تر کرنے کی تھی۔ ۱۸۶۶ء

ین علی گڑھ میں سید احمد خاں نے ایک مجمع کے روبرو اس بات کی
اپیل کی تھی کہ ایک ایسی ایسوسی ایشن ہندستانیوں کی قائم کی
جائے کہ ہندستانیوں کی شکایات اور مطالبات کو انگریزی پارلیمنٹ
کے روبرو پیش کیا کرے اور اس کی توجہ اُن کی طرف دلایا کرے تقریر
کرتے ہوئے۔ سید احمد خاں نے کہا تھا کہ جب سے ہندستان کی
حکومت کی باگیں براہ راست دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں آئی
ہیں ہمارے معاملات پر پارلیمنٹ میں توجہ بہت کم ہوتی ہے اور ہو
بھی کیسے جب ہم خود اپنے معاملات پر پارلیمنٹ کی توجہ دلانے کی
کوشش نہیں کرتے تو انگریزوں کو کیا پڑی ہے اور ان کو کب اتنی فرصت
ہے کہ ہمارے معاملات کے لئے وقت نکالیں اور مغز کھپائیں۔ اب
وقت آگیا ہے کہ ہم اس کوشش کی جانب خود ہی توجہ کریں۔ یہ خیال
اور خوف بالکل بیجا ہے کہ اگر ہم فریاد اور شکایت کریں گے تو یہاں
کی حکومت یا ضلعوں کے حکام ہم پر عتاب کریں گے۔ یہ محض ہماری
خام خیالی اور بزدلی ہے۔ اس وقت تک یہاں کے باشندوں
کو حکومت کے معاملات میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر حکومت
کی طرف سے کسی معاملہ میں زیادتی ہوتی ہے یا ایسے قانون اور
احکام نازل ہوتے ہیں کہ جن سے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے تو ہم
اندر ہی اندر کڑھتے ہیں۔ حکومت سے بدظن ہوتے ہیں اور ملک
میں بدگمانی پھیلتی ہے۔ یہ ملک اور قوم کے لئے نقصان دہ ہے
اگر ہم کھُلّم کھُلّا اپنی شکائتیں اگر وہ سچی ہیں گورنمنٹ کے کانوں
تک پہنچائیں اور گورنمنٹ کی توجہ انصاف کرنے کی جانب مبذول

کرائیں تو حکومت اور ملک دونوں کے حق میں فائدہ اور بھلائی ہوئی۔ یہ خیالات بہت دور اندیشی کے تھے اور اس پالسی میں بہت وسعت تھی لیکن بعد میں سید احمد خاں کا رویہ اور مسلک سیاسی معاملات میں بالکل بدل گیا تھا۔

۱۸۶۹ء میں سید احمد خاں نے انگلستان کے سفر کا ارادہ کیا۔ بہانا تو اپنے لڑکے سید محمود کی تعلیم کی غرض سے ولایت جانے کا تھا لیکن اصل غرض یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کی طرز تعلیم، طرز معاشرت اور طرز حکومت کا وہاں جاکر تجربہ حاصل کریں اور جس حکومت اور قوم سے اب ہندستان کو واسطہ پڑا تھا اس کے تہذیب و تمدن سے پوری واقفیت حاصل کریں۔ اس وقت تک یعنی جس زمانہ کا یہ ذکر ہے شاذونادر ہی ہندوستانی ولایت گئے تھے ہندستانی مسلمانوں میں غالباً سید احمد خاں پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ ہمت کی اور اس ارادے کے پورا کرنے کے لئے اُنھوں نے کافی مالی نقصان اُٹھایا ان کا قیام ولایت میں سال بھر سے زیادہ رہا۔ وہاں اونچے طبقوں میں اُن کی بڑی آؤبھگت ہوئی۔ اور اُن کو انگریزوں کی طرز معاشرت کے دیکھنے کا اور سمجھنے کا پورا موقع ملا۔ لارڈ لارنس۔ لارڈ اسٹینلی وغیرہ نے اُنھیں دعوتوں میں مدعو کیا اور اپنا مہمان بنایا۔ لارڈ ارگائیل وزیر ہند نے سی، ایس، آئی کا تمغہ برطانوی سرکار کی جانب سے انھیں عطا کیا اور اُن کی تعظیم و تکریم کی لیکن سب سے قیمتی چیز جو اُنھیں انگلستان میں حاصل ہوئی اور جس کو اُنھوں نے پھر عمر بھر دل سے لگا کر رکھا وہ انگریزی طرز تعلیم اور انگریزی طرز معاشرت کا تجربہ

تھا نئی روشنی کی جھلک تھی جس سے اُنہیں بصیرت حاصل ہوئی نئی تہذیب کے کرشمے تھے جنہوں نے ان کی آنکھیں کھولیں اور جن سے ہندستان واپس آکر اُنہوں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اُن کے وہ خط جو اُنہوں نے وہاں کی کیفیت کے لندن سے لکھے تھے اور سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار میں برابر شائع ہوا کرتے تھے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کے دستور سے کس قدر متاثر ہوئے تھے اور اُس کی نسبت اُنہیں اپنے ہم قوموں کی حالت کیسی زبوں اور ابتر معلوم ہوتی تھی جس کا انکشاف اُنہوں نے دل سے نکلتے بولوں اور درد بھرے لہجہ میں کیا ہے۔ یوں تو سید احمد خاں مغربی خیالات اور طرز و وضع کے لحاظ سے پہلے ہی سے قوم میں بدنام تھے ان خطوں کے سخت الفاظ اور تلخ لہجے نے اُن کے خلاف لعن طعن کا طوفان برپا کر دیا اور اُن کو نیچریہ اور ملحد کہا جانے لگا لیکن اس مردِ خدا نے اس سے لاپروا رہ کر اپنا کام جاری رکھا۔ اسی زمانہ میں وہ حضرت پیغمبر محمدؐ کی "سوانح حیات" لکھ رہے تھے اور اس کی نسبت جو غلط فہمیاں اہل یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں اور اسلام کو جس طرح بدنام کیا جا رہا تھا اُس کا دندان شکن جواب دیتے رہے تھے۔ حیات رسولؐ بالخصوص، سر ولیم میور کی تصنیف حیات محمدؐ کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اُس سے یہ ثابت کرنا منظور تھا کہ عقائد اسلام موجودہ رفتار ترقی تہذیب تمدن کے منافی نہیں۔ سید احمد خاں کی تصنیف حیات پیغمبرؐ کے تمام دلائل و مباحث سے اتفاق کرنا ایک بے لاگ مبصر کے لئے مشکل ہوگا لیکن بالعموم اُس کے مفید ہونے سے انکار نہیں کیا

جا سکتا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اُنھوں نے یہ کتاب بہ حیثیت وکیل کے لکھی تھی۔ جج کی حیثیت سے نہیں۔ اس کا منشاء اسلام کی خوبیاں ظاہر کرنے کا تھا اور شبہ نہیں کہ بہت سی غلط فہمیاں اور تاریخی اُلجھنیں جو اسلام کے بارے میں عام طور سے پھیلی ہوئی تھیں وہ اس کتاب کے شائع ہونے سے دور ہو گئیں۔

ولایت سے واپس ہونے کے بعد سید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس رسالہ کی خاص غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں جو نئی روشنی اور مغربی تعلیم کی طرف سے بے اعتنائی پھیلی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے وہ مغربی تعلیم، سائنس اور آرٹ سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اُسے دُور کیا جائے اور اُن کو نئے خیالات اور نئے رجحان سے مانوس کیا جائے۔ تاکہ ان میں آزادیٔ خیال اور آزادیٔ تقریر و تحریر پیدا ہو۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ مسلمان مذہبی عقائد کے پابند رہتے ہوئے بھی نئی روشنی اور نئی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں اور آزادیٔ خیال اُن کو موجودہ تہذیب و ترقی سے قریب تر کر سکتی ہے مگر علماء اسلام کسی قسم کی آزادیٔ خیال یا اصلاح معاشرت کے لئے تیار نہ تھے اور قوم اُن کے شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ سید احمد خاں کی اس دلیری اور کوشش پر جو مخالفت پہلے سے ہو رہی تھی تہذیب الاخلاق کے شائع ہونے سے طوفان بن کر ٹوٹ پڑی۔ ان کی الوالعزمی، بے غرضی اور حُبِّ قومی کی کوششو اور ارادوں کے عوض اُن پر گالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اُن کو کافر و ملحد کہا گیا۔ نہ صرف ہندستان کے علماء نے اُن کے خلاف فتوے جاری کئے بلکہ مکہ معظمہ سے بھی فتوے منگوائے گئے۔ جس قوم

پر سے وہ اپنا دل و دماغ جان و مال قربان کر رہے تھے اُس ہی قوم کے افراد اُن کی جان لینے کی تدابیر سوچ رہے تھے لیکن اس مردِ میدان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی کوششوں اور کام میں برابر منہمک رہے۔ جیسا کہ فکر و تدبر اُن کے دماغ کا جوہر تھا ویسا ہی لڑنا بھی جانتے تھے اور شبہ نہیں کہ یہ لڑائی اُنھوں نے عمر بھر لڑی اور خوب لڑی اور بالآخر فتحیاب ہوئے۔ پچاس برس پیشتر جو لوگ اُنھیں کافر و ملحد کہتے تھے اور اُن سے منحرف تھے آج اُن کے معتقد ہیں اور اُن کو اپنا لیڈر اور بزرگ عظیم مانتے ہیں۔

"تہذیب الاخلاق" کے جاری کرنے کے ساتھ ہی ساتھ سید احمد خاں نے اس کالج کے قائم کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی کہ جو اُن کے نام کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے گا۔ اُنھوں نے ایک کمیٹی اس غرض سے تجویز کی کہ وہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے اسباب پر غور کرے۔ بعد میں یہی کمیٹی کالج کے لئے سرمایہ جمع کرنے کے کام آئی اور یہ طے ہوا کہ کالج علی گڑھ میں قائم ہو۔ جب کالج کے لئے چندہ جمع ہونا شروع ہوا تو جو مخالفت اب تک سید احمد کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی کالج کی طرف منتقل ہو گئی اور یہ فتوے جاری کئے گئے کہ اس کالج کے لئے چندہ دینا گناہ ہے۔ لیکن چندہ جمع ہونا تھا۔ ہوا۔ اور کالج قائم ہونا تھا ہوا۔ اس میں نہ صرف مسلمانوں نے چندہ دیا بلکہ ہندوؤں نے بھی اس کی خاطر خواہ امداد کی۔ گو یہ افسوس کی بات ہے کہ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں اس طرف کوئی اشارہ بھی کنایتاً نہیں کیا ہے۔ جب وائسرائے وقت کی نظ

کالج کی طرف ہوئی تو نظام حیدر آباد اور انگریزی حکومت کی جانب سے خاطر خواہ امداد ملنے لگی اور اس میں سال بسال اضافہ ہوتا گیا۔
۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو کالج کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی گو اسکول کے درجوں میں کام یکم جون سے شروع ہوا۔ اب یعنی ۱۸۷۶ء میں سید احمد خاں سرکاری ملازمت سے عہدہ برآ ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کالج کی ترتیب کے لئے وقف تھا وہ نہ صرف کالج کے بانی اور سرپرست تھے بلکہ وہ اس کے روحِ رواں تھے، جنہوں نے اس میں جان ڈالی، اس کو پالا پوسا اور بڑا کیا۔ اور ان ہی کی اولوالعزم ہستی کا یہ تبرک تھا کہ کالج نے نام پیدا کیا اور جس نے ان کے بعد اب مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ اُن کی ذات سے نہ صرف ایم، اے، او کالج قائم ہوا بلکہ علی گڑھ مسلمانوں کی تمام کوششوں کا مرکز بن گیا کہ جس نے "علی گڑھ تحریک" کو جنم دیا۔

اسی زمانہ میں کہ جب سرسید احمد خاں ایم۔ اے۔ او کالج کے قائم کرنے میں اپنی تمام کوششیں اور وقت صرف کر رہے تھے اُنہوں نے سر ولیم ہنٹر کی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کا جواب شائع کیا۔ سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان اپنے عقیدے کی بنا پر جہاد کرنے پر مجبور ہیں اور وہابیوں کا فرقہ بغاوت اور انقلاب کے معنوں کا مترادف ہے۔ سرسید احمد خاں نے دلائل سے اس کو اپنی کتاب میں غلط ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہابیوں سے اور سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ محض اسلام کی اصلاح کے دعوے دار ہیں اور اُسی اصلی اسلام کو پھر زندہ کرنا

چاہتے ہیں کہ جیسا یہ حضرت رسولؐ کے زمانہ میں تھا۔ اُنہوں نے آخر میں مسلمانوں پر جو غیر وفاداری سرکار اور بغاوت کا الزام لگایا جاتا ہے، اُس کی شدومد سے تردید کی ہے۔

ایم، اے، او کالج کے قائم ہونے کے بعد سے آخر وقت تک سر سید احمد خاں کی بقیہ زندگی کالج کے کاموں اور اس کی ترقی میں گزری کہ جس کی تفصیل یہاں طوالت کا باعث ہو گی۔ وہ چند سال کے لئے وائسرائے کی کونسل کے ممبر بھی نامزد کئے گئے تھے۔ جب انڈین نیشنل کانگریس کا چوتھا اجلاس ۱۸۸۸ء میں الہ آباد میں منعقد ہوا تو اُنہوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ اور وہ مسلمانوں کو بالعموم کانگریس سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ کانگریس کے جواب میں اُنہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس کی ظاہرا غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان کی اشاعت و ترقی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان میں بیداری پیدا کی جائے۔ علاوہ اس غرض کے پورا کرنے کے اس کے سالانہ اجلاس جو سر سید احمد خاں کی زندگی میں بڑی کامیابی اور شان سے ہوا کرتے تھے اور بعد میں بھی ایک عرصہ تک اُن کا انعقاد جاری رہا تمام ہندستان کے مسلمانوں میں یک جہتی اور اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان کانگرس سے علیحدہ رہ سکے۔ اور عرصہ دراز تک صرف انگریزی سرکار کی وفاداری کا راگ ہی الاپتے رہے۔

سر سید احمد خاں کی زندگی کے آخری ایام پریشانی اور کلفت میں گزرے۔ اول تو جب جسٹس سید محمود کو مجبوراً الہ آباد ہائی کورٹ

سے علٰحدہ ہونا پڑا تو اُن کو اس کا سخت صدمہ ہوا اور انگریز اور مسلمانوں کے اتحاد کی جو عمارت اُنہوں نے کھڑی کی تھی وہ متزلزل ہوتی معلوم ہوئی ۔ اسی زمانہ میں کالج کا ایک لاکھ روپیہ ایک کلرک نے غبن کر لیا جس سے کالج کو سخت نقصان ہوا اور سر سید احمد خاں کی پریشانیوں میں اضافہ ۔ ماسوا کچھ اور بھی خانگی پریشانیاں تھیں جنہوں نے سر سید احمد خاں کے رشتۂ حیات کے قطع ہونے میں مدد کی ۔ وہ ۲۷ رمارچ ۱۸۹۸ء میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے اور اپنی قوم کے لئے وہ ورثہ چھوڑ گئے جو ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا۔

اب تک ہم نے اوپر کے صفحوں میں سر سید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور کارناموں کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کے عقیدوں، اصولوں اور پالیسی کا بھی کچھ ذکر کیا جائے کہ جن کی بناء پر سر سید نے اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کی تھی تاکہ ناظرین کو ان کی ذہنیت، شخصیت اور مرتبہ کا اندازہ ہو سکے اور وہ اس اولوالعزم ہستی کے سمجھنے میں کامیاب ہوں ۔ قبل اس کے کہ اس کو بیان کیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اُس شکستہ و زبوں حالت کا نقشہ کہ جو اس وقت سر سید کے نظروں کے سامنے تھا اور جس نے ان کے دل و دماغ کو متاثر کر کے ان کی قوت عمل کو متحرک کیا تھا، سامنے رکھا جائے اور اس کا مختصر بیان ہو ۔ یوں تو مرہٹوں کی طاقت اور اُن کے عروج و اقبال نے بہت پہلے سے سلطنت مغلیہ کے شیرازے کو تتر بتر کر کے اسے پاش پاش کر دیا تھا اور سلطنت کا ڈول کھوکھلا ہو کر رہ گیا تھا لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی

نے انگریزوں کی حکومت کی بساط ہندستان میں بچھانی شروع کی تو
اِن شاطروں کو کم از کم شمالی ہند میں سابقہ مسلمانوں ہی سے پڑا۔ پہلے
نوابان بنگال سے پھر شاہان اودھ سے۔ اور دار السلطنت دہلی
میں چغتائی خاندان کے آخری نام لیواؤں سے کہ جو نام کے
شہنشاہ سہی پر کہلاتے شہنشاہ ہی تھے۔ ملک گیری کی زبردستیوں
اور چیرہ دستیوں میں انگریزوں کا پہلا وار مسلمانوں پر ہی ہوا۔
جس میں شکست کھا کر وہ تباہ و برباد ہوئے۔ چیونٹی بھی جب پاؤں
تلے دبتی ہے تو کاٹتی ضرور ہے۔ مسلمانوں کو تو اپنے عقیدے اور
ایمان پر ناز اور اپنے آبائی کارناموں کی شان کا گھمنڈ تھا جب
وہابیوں نے اُمت کا جھنڈا عرب میں اونچا کیا تو اس کی لہریں سمندر
پار ہند کے ساحل سے ٹکرائیں۔ سید احمد بریلوی نے ۱۸۲۰ء میں حج
سے واپس آکر اس پرچم کو یہاں اُٹھایا اور مذہبی اسلامی جوش
نے جو حرارت اور گرمی پیدا کی تھی اُس نے بنگال کے ننگے بھوکے
کسانوں اور دبی دبائی مسلمان رعیت میں ایسی آگ لگائی کہ فرید پور
ندیا اور ۲۴ پرگنوں سے لے کر اس کے شعلے ایک عرصہ تک پشاور
کے پرے سرحد تک سُلگا کئے۔ انگریزی حکومت نے اسے بزور دبایا
اور ختم کیا۔ نتیجہ مسلمانوں سے بدظنی اور بڑھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں غدر
ہوا تو گو اُس میں ہندو و مسلمان دونوں برابر سے شامل تھے لیکن چونکہ
دہلی کے تخت پر شاہان مغلیہ کا وارث ابھی بیٹھا ہوا تھا مسلمان ہی
زیادہ زد میں آئے اور کمپنی کے تخریبی دور کے علاوہ دولت برطانیہ
کے تعمیری دور میں بھی بہت عرصہ تک کم از کم ایک نسل تک مسلمان

انگریزی سرکار کے مورد عتاب رہے۔ ہندستان میں انگریزی حکومت اور طاقت تجارتی ہتھکنڈوں، سیاسی چالبازیوں اور خود ہندستانیوں کی آپس کی پھوٹ پر قائم ہوئی۔ محض فوجی طاقت پر نہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تخریبی دور میں یہی جادو چلا کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے تعمیری دور میں بھی یہی پالیسی کام کیا کی کہ ہندو مسلمانوں کو لڑاؤ اور حکومت کرو کامل سو برس تک مسلمان حکومت کے مورد عتاب اور اس کی زد میں رہ کر تباہ و برباد ہوئے۔ ۱۸۸۵ء کے بعد حکومت کے اونٹ نے کروٹ بدلی۔ مسلمانوں کے دن پھرے اور ہندوؤں کی شامت آئی۔ لیکن یہ آخری دور ہماری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ ماسوا سرسید کی زندگی اور اُن کے زمانہ سے اس کا برائے نام تعلق ہے لہٰذا یہاں اسی کا تذکرہ کیا جائے گا۔ کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مسلمانوں پر سرکار کا کیسا عتاب تھا اور اس زد میں آکر اُن کی کیا حالت ہوئی علاوہ حکومت کے عتاب اور اُس کی پالیسی کے مسلمان خود بھی اپنی تباہی کے بہت کچھ باعث تھے۔ بدلی ہوئی حالت میں ان ڈوبتے ہوؤں کو اُبھرنے اور سنبھلنے کا راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ نئی روشنی نئی تہذیب اور مغربی تعلیم سے انہیں دشمنی تھی زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز کے معنی انہیں سمجھ لینا نہ آتے تھے۔ ہندوؤں نے سرکار سے التجا کی اور اس کی کوشش کی کہ ہندستان میں انگریزی تعلیم رائج کی جائے۔ مسلمانوں نے عرضیاں بھیجیں اور احتجاج کیا کہ انگریزی تعلیم دینے سے مراد ہمیں عیسائی بنانا ہے۔ سب کچھ تو سرکار نے چھین لیا۔ ہمارا مذہب تو ہمیں بخش دیں۔ پھر اس زمانہ میں مسلمانوں کی مذہبی

و معاشرتی حالت بھی جیساکہ زوال میں ہمیشہ ہوتا ہے، بہت گر گئی تھی۔
.سرکار کی پالسی اور اپنی زمانہ شناسی اور دور اندیشی سے ہندو اُبھرے
تھے۔ مستقل یا دوامی بندوبست اراضی کے سلسلہ میں بنگال کے ہندو
زمیندار مالا مال ہوئے اور ولایتی مال کے زبردستی فروغ دینے میں
ہندوستانی صنعت و حرفت تباہ ہو ئی۔ ڈھاکے کی ململ اور مرشدآباد
کا ریشم جس کا چار دانگ عالم میں چرچا اور شہرہ تھا اب دیکھنے کو نہیں
ملتا تھا۔ لاکھوں کاریگر صنعت کار اب ہل جوتتے اور غلامی کی زندگی
بسر کرتے تھے۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد بکثرت تھی۔ چونکہ مسلمان
انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم سے بے بہرہ تھے اور ہندو پیش پیش
تھے۔ دوسرے درجہ کے سرکاری عہدوں، عدالتوں اور دفتروں سے
بھی مسلمان نکالے گئے اور ہندو بھرے گئے۔

اودھ میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جنہوں نے سرکار سے
وفاداری کا ثبوت دیا تھا وہ چکلے دار اور ٹھیکے دار ۔ تعلقہ دار اور
راجہ بنائے گئے اور سرکار کے حلقہ بگوش ہوئے ان میں بھی
ہندوؤں کی تعداد زیادہ اور مسلمانوں کی کم تھی۔ غدر کے بعد سے فوج
میں سکھ۔ گورکھے اور گڑھوالی بھرے گئے اور مسلمان چھانٹ چھانٹ کر
نکالے گئے۔ تو ظاہر ہے کہ اس سب کا اثر مسلمانوں کی اقتصادی حالت
پر کیا پڑا ہو گا۔ ان کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حالت غدر کے
بعد سے کیا تھی۔ جسٹس شاہ دین مرحوم نے ایک مضمون میں اس کو
بیان کیا ہے۔

"شاہ و فقیر امیر و غریب مرد و عورت ہر ایک اس پُراسرار

دائرہ میں مقید ہے جو کوئی اس کے باہر قدم بڑھاتا ہے وہ مردود ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ اور ہر نقل و حرکت شرعی احکام کی پابند ہے۔ نہ صرف متقی و پرہیز گار کے لئے بلکہ تمام اُن جذبات کے اظہار کے لئے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں سوائے مقررہ رسوم کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ انسانی زندگی کے اہم سے اہم معاملے میں آپ کو زبان کھولنے کا حکم نہیں جو کچھ کہنا ہے یا کرنا ہے آپ صرف مولوی یا مُلّا کی زبان سے کہہ سُن سکتے ہیں وہی اپنی زبان سے آپ کے لئے دُعا مانگ سکتا ہے یا کلمۂ خیر کہہ سکتا ہے اور وہ بھی اُس زبان میں کہ جس کو نہ خود آپ سمجھتے ہیں نہ وہ سمجھتا ہے۔ اللہ کے نام و کلام کے وہ آپ کو ایسے معنی سمجھاتا ہے اور آپ کو اُنہیں یقین کرنا اور اُنہیں قبول کرنا قطعی لازمی ہے کہ جو خدا کی قدرت اور خدا کی مخلوق سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں۔ ہر امر میں آپ پر وہی کرنا واجب ہے کہ جو کسی زمانۂ سلف میں عرب کے مسلمان کیا کرتے تھے۔ گویا درمیان کی تیرہ صدیاں جو اولادِ آدم کے سر سے گزر گئیں وہ کوئی معنی و حقیقت نہیں رکھتیں۔ اُن تمام باتوں میں بھی کہ جن کا تعلق صفائی یا حفظانِ صحت سے ہے یا جو آپ کے نجی کے شوق و آرام سے تعلق رکھتی ہیں حتیٰ کہ کھانے پینے اور اُٹھنے بیٹھنے اور سونے کی خفیف سے خفیف باتوں میں شرعی پابندیاں لازم ہیں جو پُرانی حدیثوں میں رقم ہیں کہ جن کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ ان میں کسی حالت اور کسی طور سے غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ کوئی ذاتی رائے کسی معاملہ میں قائم کرنے کی اجازت نہیں اور شرعی احکام سے اختلاف تو بمنزلۂ کفر ہے

دنیا بدلتی جاتی ہے ہم کو روزانہ نئی نئی باتوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن چونکہ قرآن شریف اور حدیثوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں، تب بھی ہم کو وہی کرنا پڑتا ہے جو مولوی یا ملا ہدایت کرے خواہ وہ کیسی ہی بے معنی بات کہے، قصہ مختصر اسلامی عقائد کہ جن کی گرفت زندگی کے تمام شعبوں اور مسئلوں پر سخت ہے ایک شکنجے کی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں کہ جن کے باہر نہ آپ جا سکتے یا نہ اُن کو توڑ سکتے ہیں۔ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں، یا تو جو کچھ شرع اور حدیث میں ہے اسے من وعن قبول کرو ورنہ مرتد و کافر ہو۔"

قصہ مختصر جن مسلمانوں کی قوم نے یہاں آکر اور رہ کر اس ملک پر آٹھ سو برس شان سے حکومت کی تھی ایک نئی تہذیب اور نئے تمدن کو رواج دیا تھا جس نے اکبر اعظم اور شاہجہاں کے سے شہنشاہ پیدا کئے تھے کہ جن کی دلاوری اور عظمت کی ایک دنیا قائل تھی جو اپنے تفکر و تدبر کے لحاظ سے اپنے وقت میں دنیا بھر میں فوقیت رکھتے تھے جس نے فیضی اور ابو الفضل کے سے صاحب کمال پیدا کئے کہ جن کے نام صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تاریخ کے کارناموں میں روشن اور چمکتے نظر آتے ہیں۔ اُسی آل تیمور کا آخری تاجدار آج غیروں کے ہاتھ کا کھلونا بنا ہوا غزل گوئی سے اپنی طبیعت بہلاتا تھا اور اراکین سلطنت اور روساء قوم عیش و عشرت کی رنگ رلیوں میں تباہ ہو رہے تھے اور نواب بے ملک کہلاتے تھے جس قوم کے دماغ اور ہاتھوں نے تاج محل کے خواب و خیال کو سنگ مرمر میں نگینے جڑ کر آرٹ کا ایسا مجسمہ تیار کیا کہ جس کی مثال صدیاں گزرنے پر

آج بھی دوسری نظر نہیں آتی اور جن ہاتھوں نے ڈھاکہ کی ململ اور مرشد آباد کے ریشم، ٹانڈے کی جامدانی اور لکھنؤ کی چکن کی دستکاری کو ایسا فروغ دیا کہ سات سمندر پار تک اُس کا چلن اور چرچا ہوا جن میٹھی مٹائی نشانیوں کو دیکھ کر آج بھی بے ساختہ طبیعت چاہتی ہے کہ بنانے والے کے ہاتھوں کو چوم لے۔ اُن کی اولاد بیکس و بے بس گلی کوچوں میں آوارہ پھرتی یا دُھنیا جلاہے کہلاتی تھی۔ قوم میں یا مولوی اور ملّا رہ گئے تھے کہ جو مسجدوں میں اذان کہتے اور قرآن خوانی کرتے۔ دنیا تو بگڑ گئی تھی اب عاقبت کی خیر مناتے تھے یا اگر طبیعتوں میں کچھ زندہ دلی کی تڑپ باقی رہ گئی تھی تو ضلع جگت یا رسمی شاعری کی تُک بندی میں صرف ہوتی تھی۔ اس سے بھی گزر کر پتنگ بازی اور بٹیر بازی یا بازاری عیش میں بزرگوں کی رہی سہی دولت اُڑائی جاتی تھی۔ غرضیکہ مسلمانوں میں غدر کے بعد سے سوائے میاں پن کے کچھ باقی نہ رہا تھا۔ یہ نقشہ تھا مسلمانوں کی زبوں تر حالت کا کہ جو سر سید احمد خاں کی آنکھوں تلے پھرتا تھا۔

نہ خود مسلمانوں سے نہ اُن کے ہموطنوں سے اُن کی یہ حالت چھپی ہوئی تھی۔ راز طشت از بام تھا۔ لیکن کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ مسلمان اپنی گزشتہ شان و عظمت کے خوش کُن راگوں سے طبیعت بہلاتے۔ اپنی موجودہ بیکسی اور ابتری کا رونا روتے، تن بہ تقدیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھتے، دیکھتے تھے لیکن کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ سرسید احمد مسلمانوں میں پہلے شخص تھے جن کی بصیرت افروز نگاہ نے یہ بربادی دیکھی اور جن کے حساس دل نے یہ کڑھن محسوس کی۔ اُنھوں نے دیکھا اور سمجھا

کہ مسلمانوں کی بادشاہت ان کی شان و رعب داب اب ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا اور اُن کی خوش حالی رخصت ہو گئی۔ پدرم سلطان بود پرناز کئے بیٹھے رہنے سے اب کام نہیں چلے گا۔ اُن کو یقین تھا کہ انگریزی عملداری اور تسلط پورا ہو چکا۔ اب انگریزوں کی حکومت ہندستان سے کسی طرح ہٹائی نہیں جا سکتی اُنھوں نے یہ بھی سمجھا کہ پُرانے تہذیب و تمدن کے دن پُرانے عہد کے ساتھ بیت گئے۔ نئی حکومت میں نیا تہذیب و تمدن ہی رائج ہو گا۔ اگر ہم اپنی خیر چاہتے ہیں تو اس حکومت سے نباہ کرنا ہے اور نئی روشنی، نئی تہذیب و تمدن اور نئی تعلیم ہی کو سر آنکھوں سے لگانا اور اس سے کام لینا ہے۔ اگر زمانہ ہمارا ساز گار نہیں ہوتا تو ہم کو خود زمانہ سے ساز باز کرنا ہے اُنھوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور سمجھا۔ چونکہ اُن کا دماغ روشن اور دل درد مند تھا چونکہ اُن کی قوت عمل اور ہمت جوان تھی اُنھوں نے اس کا بیڑا اُٹھایا کہ مسلمانوں کی حالت سنبھالیں گے اور گو پہلی سی شان و شوکت، حکومت و ثروت نہ بھی حاصل ہو۔ ایسی فضا پیدا کر کے چھوڑیں گے کہ ہندستان کے مسلمان اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ مہذب انسان کی زندگی بسر کر سکیں۔ چونکہ اُن کا عقیدہ و ایمان پختہ اور سچائی و ایمان داری اُن کی زندگی کا خمیر تھی۔ اُنھوں نے اپنا تن من دھن سب مسلمانوں پر سے نچھاور کر کے جو سوچا اور کہا تھا کر کے دکھا دیا۔ اُن کے مسلک کی بنا ردو ہی اصولوں کے تحت ہوئی تھی۔ اول تو مسلمانوں پر سرکار نے غیر وفاداری کے الزام سے جو بدظنی۔ بے اعتنائی۔ نفرت و حقارت انگریزوں میں ان کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی کسی طرح سے

اُسے دور کیا جائے۔ اسی کے لئے اُنہوں نے "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کی۔ تفسیر قرآن لکھی اور سر ولیم میور اور سر ولیم ہنٹر کے رسالوں اور کتابوں کا شافی جواب دیا۔ دوسرے خود مسلمانوں میں جو مغائرت۔ بدظنی بلکہ بغض نئی روشنی۔ نئی تہذیب اور نئی تعلیم کی طرف سے ذہن نشین تھا اُس کو دور کیا اور مٹایا اس لئے اُنہوں نے بائبل کی تفسیر لکھی۔ "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور بالآخر ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد ڈالی اور ولایت جا کر نئی تہذیب و نئی تعلیم کی مثال اپنی ذات سے قائم کی۔ اُن کے ہمقوموں نے اُنہیں بدنام کیا۔ مطعون کیا۔ گالیاں دیں۔ اُن پر کفر کے فتوے صادر کئے۔ اور اُن کا لقب نیچر رکھا حتیٰ کہ اُن کو آزار پہنچانے اور اُن کی جان کے خواہاں ہونے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن اس مرد خدا پر اس طعن و تشنیع کفر کے فتووں اور جان کے خطروں نے کوئی اثر نہ کیا اور سید احمد اُس جادۂ مستقیم سے کہ جو اُنہوں نے اپنی قوم کی خاطر اول روز سے اختیار کیا تھا لمحہ بھر کے لئے بھی تا آخر زندگی نہ ہٹے۔

مولانا حالی نے حیات جاوید میں یہ دکھانے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سر سید نے اپنی زندگی میں جو کارہائے عظیم نمایاں کئے خواہ وہ تعلیمی ہوں معاشرتی، اصلاحی یا سیاسی وہ سب ان کے مذہبیت اور دینی جوش کے ماتحت ہوئے یعنی اس اولوالعزم ہستی کی قوت عمل کو محرک کرنے والا جو جذبہ تھا وہ اُن کی مذہبیت تھی اور عقائد دین کی پیروی یعنی پہلے وہ سچے اور پکے مسلمان تھے اور بعد میں پھر کچھ اور۔ مجھے اس رائے سے قطعی اختلاف ہے۔ شبہ نہیں کہ سر سید بنیادی عقائد اسلام

پرانیاں رکھتے تھے اور خدا ترس مسلمان تھے لیکن اُن کی عظمت کا راز اُن کے
مفکرّ اور مدبّر (Thinking States Man) ہونے میں
پنہاں تھا اُن کی قوت عمل کا متحرک کرنے والا جذبہ سیاسی تھا نہ کہ مذہبی
و روحانی حضرت رسولؐ کے زمانہ سے اب تک عقائدِ اسلام کی حالت
تیرہ صدی میں برابر تنزل پذیرہی ہوتی گئی اس معنی میں کہ دینی روحانیت
کم ہوتی گئی اور محض رسوم کی پابندی بڑھتی گئی۔ سرسید کے زمانہ سے پہلے
ادوار کے زمانہ میں یہی نقشہ سامنے تھا لیکن سرسید کو جس بات نے متاثر
کیا وہ مسلمانوں کی دنیوی اور مادی ابتری و بربادی تھی۔ ان کی نظروں
کے سامنے سلطنت مغلیہ کی عظمت و شان کا نقشہ تھا اور پھر غدر کے
بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی تصویر۔ سرسید احمد خاں نے دینی عقائد
میں کوئی اصلاح پیش کی نہ انھوں نے اپنی کوئی اُمت قائم کی نہ امام
مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا۔ نہ کسی نے اس عظمت کا اعتراف کیا وہ تو
مسلمانوں کو قعرِ ذلت سے اُبھار کر زمانہ حال کا ترقی پسند اور مہذب
انسان بنانا چاہتے تھے اسی کے لئے اُنھوں نے اپنی تمام تر کوشش
صرف کی اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی
معاشرت مذہبی رسومات کے ساتھ کچھ اس طرح گتھی ہوتی ہے کہ جب
بھی آپ کسی اصلاح کی کوشش کریں تو پہلے قرآن وحدیث اور ویا
شاستر سے آپ کو ٹکر لینی پڑتی ہے۔ یہی رشی راناڈے کو کرنا پڑا
یہی سرسید کو۔ اس سے جو نتیجہ مولانا حالی نے نکالا ہے وہ صحیح نہیں
سرسید احمد خاں کی اُس پالیسی پر کہ جو اُنھوں نے ہندستان
کی سیاسیات میں برتی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کوتاہ اندیشی

اور تنگدلی پر مبنی تھی یعنی سر سید احمد خاں نے ہی اُس مغائرت اور علیحدگی کا بیج ہندستان کی سیاسی فضا میں بویا تھا کہ جس سے مسلم لیگ کا پودا اُگا۔ اور جو بعد میں تناور درخت ہو کر ملک کے ٹکڑے ہونے کا باعث ہوا۔ اور جس کی وجہ سے اس ملک کی لاکھوں مخلوق تباہ و برباد ہوئی یہ اعتراض ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ ہم یہاں ہندو مسلم مسئلہ کی رد و قدح نہیں کر رہے ہیں اور ان بعد کے واقعات کا سر سید احمد خاں کی زندگی و حالات سے دور کا تعلق ہے اور وہ بھی زیادہ نہیں اس لئے ان کے تفصیلی بیان کا نہ یہاں موقع ہے نہ محل۔ ہم کو تو یہاں سر سید احمد خاں کی زندگی، اُن کی ذہنیت اور شخصیت کے سمجھنے کی کوشش کرنی ہے اس لئے اسی سلسلے میں چند باتوں کا دھیان ہمیں رکھنا ضروری ہے۔

جس وقت سید احمد خاں نے ہوش سنبھالا اور پبلک لائف کے میدان میں قدم رکھا اُس کو تین نسلوں سے زیادہ یعنی تقریباً نوے سال ہوئے اس وقت تک متحدہ ہندستانی قومیت کا خواب معدودے چند اولوالعزم ہستیوں مثلاً دادا بھائی نوروجی اور راناڈے کے دماغوں میں ایک دل خوش کن خیال کی طرح منڈلایا کرتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد بھی اس وقت نہیں پڑی تھی۔ جب ۱۸۸۵ء میں کانگرس کی بنیاد پڑی اور اُس کے اجلاس ہونے شروع ہوئے تو اُس کا مطالبہ اس سے زیادہ نہ تھا کہ ہندستانیوں کو بھی مثل انگریزوں کے حکومت کے بڑے بڑے عہدے ملنے چاہئیں۔ اور حکومت میں نیابت کا دستور شروع ہونا چاہیئے۔ سر سید احمد خاں کے مرنے کے وقت

سال بعد آنجہانی گوکھلے نے حکومت خود مختاری زیر سایۂ برطانیہ کا معیا
ملک اور حکومت کے سامنے پیش کیا تھا سوراج کا لفظ دادا بھائی
نوروجی نے ۱۹۰۶ء میں اپنے صدارتی ایڈریس میں پہلی مرتبہ استعمال کی
اس وقت تک مکمل آزادی کا خواب سوائے چند جوشیلے اور دیوانے
نوجوانوں کے کسی کے دماغ میں نہیں آیا تھا۔ مکمل آزادی کا جوش ا
ولولہ سید احمد خاں کی وفات کے کامل ایک نسل بعد مہاتما گاندھی
اس ملک میں پیدا کیا۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ ۱۹۴۲ء کے ہنگامۂ انق
کے بعد بھی کتنے شخص تھے جو یقینی طور سے باور کرتے تھے کہ انگریز ہندستا
کی حکومت اور اپنا قبضہ اس پر سے چھوڑ کر اس طرح سے ۱۹۴۷ء میں
یہاں سے چلے جائیں گے۔ تو پھر اگر ایسے زمانہ میں سید احمد خاں یہ با
کرتے تھے کہ جہاں تک اُن کی نظر جاتی تھی انگریزوں کا تسلط
ہندستان پر ہمیشہ رہے گا اور اُنہیں ملک میں دو ہی قوتیں دکھا
دیتی تھیں یعنی ہندو اور مسلمان اور متحدہ ہندستانی قومیت کے خیا
کو وہ محض خواب پریشاں خیال کرتے تھے تو اس میں زیادہ تعجب
کی بات نہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے اور وہ
کہ شروع شروع میں سید احمد خاں نے جب اپنا رسالہ "اسباب بغاوت"
لکھا اور اُس کے کچھ اور عرصہ بعد تک کی اُن کی تحریروں اور تقریروں
سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی نیابت ا
وکالت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے لیکن جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤ
کی طرف سے اُردو کے خلاف جو شمالی ہند کی زبان تھی ہندی زبا

اور ناگری رسم الخط کے جاری کرنے کا مطالبہ پیش ہوا اور اس کے
متعلق ایجی ٹیشن شروع ہوا اور بعد میں ۱۸۷۵ء میں آریہ سماج قائم
ہوئی کہ جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ اور گنجائش ہی نہ تھی جس
کی غرض پراچین آریہ سبھیتا کا واپس بلانا تھا تو سید احمد خاں کا ماتھا
ٹھنکا اور ہندوؤں کے خلاف ان میں بدظنی پیدا ہوئی یہ دونوں
تحریکیں سید احمد خاں کی سیاسی پالسی پر ضرور اثر ڈالنے میں کامیاب
ہوئیں یہ صحیح ہے کہ آج جو آزاد ہندستان کی مکمل تصویر ہماری آنکھوں
کے سامنے موجود ہے اس میں آریہ سماج اور ہندی مناقشے کی وہ
اہمیت نہیں گو سنسکرت آمیز ہندی کے جاری کرنے کا جو جنون
آج بھی ہمارے لیڈروں پر سوار ہے وہ کم وحشت انگیز نہیں لیکن
یہ مسلم لیگ کے گزشتہ رویّہ کا جواب اور غالباً عارضی اثر ہے
تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آزاد ہندستان کی یہ تصویر سید
احمد خاں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور ان کے دماغ نے جو اثر
اس وقت قبول کیا وہ الٹا ہی پڑا۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں
کی تعلیمی اور معاشرتی حالت کے سنبھالنے کا جو کام اٹھایا تھا ان کو
قومی تحریک سے علٰحدہ رکھنے کی جو پالسی اُنھوں نے اختیار کی تھی
اور انگریزوں اور حکومت وقت کی خوشنودی اور مصالحت کا
جو رویّہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اُس میں اُنہیں اپنی زندگی ہی میں
کافی کامیابی ہوئی تھی اور اس وجہ سے ان کو اپنی پالسی اور رویّہ
کا صحیح اور درست ہونے کا کامل یقین ہو گیا تھا اُن کو اس سے
ہٹنے یا اس سے بدلنے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن میری ذاتی رائے

یہ ہے کہ انھوں نے قومی تحریک اور کانگریس سے علحدہ رہنے اور مسلمانوں کو علحدہ رکھنے کی جو کوشش کی تھی اور جس میں انہیں بہت بڑی حد تک کامیابی ہوئی تھی اس سے تجاوز کرکے وہ نیشنل کانگریس کی علانیہ اور شدید مخالفت پر آمادہ نہ ہوتے اگر اس میں پرنسپل بک کی ریشہ دوانیاں اور سر آکلینڈ کالون کا دباؤ شامل نہ ہوتا۔ یہ محض میرا وہم نہیں بلکہ آیندہ کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مسلم لیگ کا قیام کہ جو ملک کی تقسیم کا باعث ہوا اور اس مسلم ڈیپوٹیشن کی نوعیت کہ جس نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا سب لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے ایما، ان کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ڈنلپ اسمتھ کے اشارے اور مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی کوششوں کا نتیجہ تھا بلکہ پرنسپل آرچ بولڈ کے ایک خط سے جواب شائع ہو چکا ہے ثابت ہوتا ہے کہ آغا خاں والے ڈیپوٹیشن کا ایڈریس غالباً خود مسٹر آرچ بولڈ کا ترتیب دیا ہوا اور مسٹر ڈنلپ اسمتھ کے مشورے سے لکھا گیا تھا۔ ان تمام کارروائیوں میں انگریزی حکومت کی پالیسی کا ہاتھ نمایاں صاف دکھائی دیتا ہے۔ میرا منشا یہ کہنے کا نہیں کہ سر سید نے کانگریس کی مخالفت اپنی رائے کے خلاف کی بلکہ یہ کہ اس شدید مخالفت کی نوبت نہ آتی اگر مسٹر بک اور سر آکلینڈ کی ریشہ دوانیاں اس میں شامل نہ ہوتیں۔

ہندستان کی سیاسیات میں سر سید احمد خاں کی کوتاہ بینی اور تنگ دلی کی پالیسی کے بارے میں جو کچھ بھی رائے قائم کی جائے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری دو نسل کی جنگ۔

آزادی اور قومی تحریک میں جو حصہ یہاں کے مسلمانوں نے لیا اور
جس طرح سے ہزاروں نے اپنے جان و مال پر کھیل کر ساتھ دیا
جن میں خان عبدالغفار خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سی برگزیدہ
شخصیتیں شامل تھیں اور ملک کی تقسیم کے بعد بھی جو آج مسلمانوں کی
ایک کثیر مخلوق ہماری شریک کار ہے جن میں سینکڑوں نہیں بلکہ
ہزاروں ترقی پسند اور دور موجودہ کے مہذب مسلمان شامل ہیں۔
یہ سب ضیا، نتیجہ ہے اُسی نئی تعلیم، نئی تہذیب، اور نئی روشنی کی
جھلک کا جس کا چراغ سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے کمال
اولوالعزمی کے ساتھ روشن کیا تھا اور اُن کے ہموطنوں کو اس لئے
اُن کی ذات پر ناز کا موقع ہے یہی امر اس پر بھی دلالت کرتا ہے
کہ سر سید احمد خاں کا نام نامی بڑے آدمیوں میں شمار کئے جانے کا
مستحق ہے۔ سوامی دیانند سرستی نے جو تماشہ شیوراتری کی رات
شیوجی کے مندر میں دیکھا تھا وہ لاکھوں نے اُن سے پیشتر بھی دیکھا
تھا اور بعد میں بھی، لیکن سوامی دیانند نے اس تماشہ کو دیکھ کر جو کچھ سمجھا
اور جس طرح اس کو نڈر ہو کر بیان کیا اور جو کچھ کہا اس کو اپنی زندگی
میں کرکے دکھایا۔ اسی طرح سر سید احمد خاں کے پیشتر بھی اور بعد
میں بھی مسلمانوں کی تباہ حالی کا منظر تمام مخلوق کے آگے طشت از بام
تھا لیکن لوگ تن بہ تقدیر بیٹھے اس کا صرف رونا رویا کرتے تھے۔
سر سید احمد خاں نے اس کو بصیرت کی نگاہوں سے دیکھا اور حساس
دل سے محسوس کیا جس پر وہ یقین کرتے تھے اس کو نڈر ہو کر کہا اور
جو کچھ کہا تھا اُس کو کرکے دکھایا۔ یہی بڑے آدمی کی علامتیں ہیں۔

ایک اور علامت بھی بڑے آدمی کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی مقناطیسی کشش سے دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سرسید کے رفیق کاروں میں نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ مولانا حالیؔ۔ مولانا شبلیؔ اور مولانا نذیر احمد کی سی شخصیتیں تھیں کہ جنہوں نے سرسید کی زندگی میں اور اُن کے بعد بھی اُن کے مشن کی تکمیل کی۔ اس لحاظ سے سرسید احمد خاں کا شمار ہندستان کی اُن خال خال اولوالعزم ہستیوں میں ہونا چاہیے کہ جیسے راجہ رام موہن رائے اور سوامی دیانند سرستی کہ جن کی ذات پر ہندستانی جس قدر بھی ناز کریں۔ بجا ہے۔

گنگا پرشاد ورما[1]

اور

نیا لکھنؤ

مشاہیر لکھنؤ میں گنگا پرشاد ورما کا نام نامی نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ نئے لکھنؤ نے ان کی ذات سے جنم پایا اس لئے نئے لکھنؤ کی زندگی کے دور کی کہانی گنگا پرشاد ورما کی زندگی کی کہانی ہے۔ اس لئے پہلے لکھنؤ کیا اور کیسا تھا آج کل کی نئی نسل کو اس کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔ نوابی دور کی تہذیب و شائستگی۔ رقص و سرود کی رعنائیاں اور جلوہ آرائیاں۔ مشاعرے اور مجلسیں تعزیہ داری مرثیہ گوئی اور سوز خوانی مٹی مٹائی تہذیب کے تکلفات زندگی کی کچھ نشانیاں۔ جیسے بالائی و شیرمال بیگماتی گلوریاں زردہ و قوام ملیح آبادی سفیدہ اور سیدپور کے خربوزے۔ دسہری آم۔ لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں یعنی یہاں کی ککڑیاں۔ لکھنؤ کا چکن اور ٹانڈے کی جامدانی ان چیزوں کی دور دور مانگ اور شہر شہر چرچا تھا پتنگ بازی۔ بٹیر بازی۔ جگت۔ ضلع اور فقرے بازی۔ نوابوں اور وثیقہ داروں کے شغل اور ریاست کے چونچلے تھے۔ انھیں رنگ رلیوں نے شام اودھ کو شہرت دی اور لکھنؤ کے چوک کا دور دور

---

[1] یہ مضمون لکھنؤ کے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے ۱۶ر اپریل ۵۰ء کو نشر کیا گیا اور ۲۴ر اپریل ۵۰ء کے قومی آواز میں شائع ہوا۔

شہر ہوا۔ شہری زندگی افیون کی پینک میں نیم باز آنکھوں سے اپنی حیرانی اور بے کسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ امین آباد کی حیثیت اس وقت تک ایک قصباتی محلے کی تھی۔ کچھ پرانی حویلیاں۔ ٹوٹے پھوٹے مقبرے۔ پرانی وضع کے چھوٹے بڑے مکان۔ تنگ تاریک گلیاں اور گندے نالے نالیاں۔ سڑک پر چھوٹی چھوٹی بساتیوں پنساریوں اور حلوائیوں کی دکانیں جن میں مٹی کے دیوے اور ٹین کی کپّیاں جلائی جاتی تھیں۔ ان کے پیچھے جہاں آج پارک ہیں کچھ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اور کھیت تھے۔ گلیوں میں ڈولیاں اور فنسیں اور سڑکوں پر یکّے اور پالکی گاڑیاں چلتی تھیں۔ یہ پچاس برس پہلے کا لکھنؤ تھا۔

جب گنگا پرشاد ورما نے لکھنؤ کی شہری زندگی میں قدم جمائے تو یہاں پبلک لائف کی ابتدا تھی۔ اس دردمند دل اور روشن دماغ نے پبلک لائف کے اس پودے کو اپنی ریاضت و محنت سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ آج لکھنؤ میں جو چوڑی پختہ سڑکیں ہیں کہ جن پر ہمارے موٹر اور بسیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ محلہ محلہ پارک ہیں کہ جہاں کی تازہ ہوا میں گنجان آبادی کے رہنے والے تنگ تاریک گھروں سے نکل کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ بڑی بڑی شاندار عمارتیں کہ جن میں ہمارے یہاں کے بینک۔ ہوٹل اور کارخانے کھلے ہوئے ہیں خاص کر امین آباد پارک اور امین الدولہ پارک کا گلزار خطہ۔ یہ سب گنگا پرشاد ورما کے دماغ کا کھینچا ہوا نقشہ تھا کہ جس کی تکمیل بہت کچھ تو ان کے زمانہ میں انھوں نے خود کی یا ان کے مرنے کے بعد اسی طرح ترتیب پائی۔

سونڈھرسٹ مارکٹ، میرس مارکٹ، قیصرباغ سرکس۔ شہر میں
بجلی کی روشنی اور (Flushing Drainage)
کا انتظام یہ سب اسی اسکیم کے نقشے کے مطابق عمل میں آیا جو بابو
گنگا پرشاد ورما نے بحیثیت وائس چیرمین میونسپل بورڈ سوچی اور
مرتب کی تھی۔ اُنھوں نے نہ صرف لکھنؤ کی صورت اور ہئیت بدل
دی بلکہ یہاں کی شہری زندگی میں وہ تازہ روح پھونکی کہ اس نیم مردہ
قالب میں جان پڑ گئی شہری زندگی کا کوئی پہلو یا صیغہ ایسا نہ تھا جو
ان کی توجہ میں نہ آیا ہو۔ امین آباد ہائی اسکول، کالی چرن ہائی اسکول
چھیدی لال کا دھرم شالہ، ہندو گرلس ہائی اسکول جو اب مہیلا
ودیالہ کالج کہلاتا ہے اور بھی بہت سے انسٹی ٹیوشن یا تو براہ راست
ان کی کوشش سے قائم ہوئے یا ان کی تحریک اور مدد سے اُن
کے ساتھیوں اور رفیقوں نے ان کا بوجھ سنبھالا۔ ان کا ارادہ
امین الدولہ پارک میں ایک پبلک ہال اور لائبریری قائم کرنے کا
بھی تھا۔ اُنھوں نے اس کے لئے زمین خرید لی تھی اور عمارت کا نقشہ
بھی ایک نامی آرکیٹکٹ (Architect) سے تیار کرایا تھا۔
عمارت کا سنگ بنیاد بھی اُنھوں نے پنڈت مدن موہن مالویہ جی
کے ہاتھوں اسی جگہ نصب کرایا تھا کہ جہاں اب گنگا پرشاد ورما میموریل ہال
اور قائم ہے مگر۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ البتہ یہ غنیمت
ہے کہ ان کے رفیقوں اور پس ماندگان نے ان کی یادگار قائم کر کے
ان کی خواہش پوری کردی۔ لکھنؤ کی پیپلز ایسوسی ایشن جس کو اس
زمانہ کی سٹی کانگرس کمیٹی سمجھنا چاہئے اُنھیں کی قائم کی ہوئی تھی اور

وہی اس کے صدر تھے اور بھی بہت سے انسٹی ٹیوشن ان کی توجہ کے مرہون منت تھے اور کسی نہ کسی حیثیت سے ان سے ان کا تعلق تھا۔ رائے سری رام بہادر سی، آئی، ای پبلک لائف میں بابو گنگا پرشاد کے رقیب شمار کئے جاتے تھے۔ کئی معرکے ہوئے الکشن میں برابر بابو گنگا پرشاد کی جیت رہی۔ میونسپل بورڈ اور لیجسلیٹو کونسل دونوں میں بابو گنگا پرشاد نے رائے سری رام بہادر کی جگہ لی۔ صوبہ کے کانگرسی حلقوں میں اس زمانہ میں پنڈت مدن موہن مالویہ جی کانگرس کے لیڈر مانے جاتے تھے۔ اول نمبر مالوی جی کا تھا اور دوسرا بابو گنگا پرشاد کا۔ پنڈت موتی لال نہرو اس وقت تک پیشۂ وکالت کی مصروفیتوں میں تمام وقت صرف کرتے تھے۔ الہ آباد ہائی کورٹ کی بار کے لیڈر تھے۔ کبھی کبھی کانگرس کے جلسوں میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ سر تیج بہادر سپرو کا شمار اس وقت تک پایہ کے لیڈروں میں نہیں ہوا تھا۔ البتہ وکالت میں ان کا نام چمکنے لگا تھا۔ اس طرح کانگرس کی باگ ڈور مالوی جی اور بابو گنگا پرشاد ورما کے ہی ہاتھوں میں تھی۔

جس شخص نے دو معمولی اخباروں کو چلا کر شہر میں رسوخ پیدا کیا اور میونسپلٹی میں جا کر نئے لکھنؤ کو چمکایا اس زمانہ کی کونسل میں اپنے لئے جگہ نکالی اور کانگرس کی لیڈری کی باگ اپنے ہاتھوں میں سنبھالی۔ اس کی شخصیت دل چسپ ہونی چاہیئے۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ گنگا پرشاد ورما کی شخصیت قطعی دل چسپ نہ تھی نہ ان میں دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے کی کشش مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہستی عجیب غریب ضرور تھی۔ چھ فٹ لانبا قد۔ لحیم و شحیم جسم۔ بڑے ڈیل ڈول

کے آدمی تھے۔ چہرہ رعب دار۔ اس پر سپید گھنی داڑھی۔ کھلا ہوا گندمی رنگ۔ موٹے کپڑے کی قمیص اور ڈھیلے پائنچے کا پاجامہ اور ایک قسم کی شیروانی اچکن پہنتے اور سر پر فیلٹ کیپ دیتے تھے۔ تعلیم غالباً ایف اے تک کالج میں پائی تھی۔ گریجویٹ یقیناً نہ تھے۔ معمولی دماغ اور ذہن پایا تھا۔ علمی قابلیت بھی معمولی تھی۔ معمولی اُردو لکھ اور بول لیتے تھے۔ انگریزی لکھنے کی مشق بھی اچھی ہو گئی تھی مگر بولنے کا ربط نہ تھا کونسل میں لکھ کر تقریر پڑھتے تھے اور اس طرح پڑھتے تھے کہ جیسے مدرسوں میں لڑکے آموختہ پڑھتے ہیں۔ خط اُردو اور انگریزی دونوں میں ایسا شکستہ تھا کہ سوائے ان کے کاتبوں اور کمپوزیٹروں کے دوسرے مشکل سے پڑھ سکتے تھے۔ چونکہ میں نے دو برس اخبار ہندستانی میں ان کے ساتھ کام کیا تھا مجھ کو بھی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پڑھنے کا کچھ ربط ہو گیا تھا۔

ان کی ظاہری وضع قطع میں نہ کسی قسم کی نفاست تھی نہ نمائش۔ ظاہرہ کلچر سے بے بہرہ معلوم ہوتے تھے۔ ناول پڑھنے کو تضیع اوقات اور تھیٹر۔ مشاعرے یا اور کسی ایسی ہی قسم کی سیر و تفریح کو بیکاری کا مشغلہ سمجھتے تھے۔ میں نے انھیں ایک ہی مرتبہ تھیٹر جاتے دیکھا۔ جب پنڈت بشن نرائن در اجلاس کانگرس کے صدر کی حیثیت سے کلکتہ گئے تھے۔ تو وہ ایک شب اور دوسرے ساتھیوں کے علاوہ بابو گنگا پرشاد ورما کو بھی زبردستی گرانڈ اوپرا میں مرچنٹ آف وینس دیکھنے کے لئے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ورما صاحب نے واقعی کھیل کو کیا سمجھا اور اس سے کیا لطف اُٹھایا یہ معلوم نہیں۔ گنگا پرشاد ورما کی ظاہری وضع قطع تو آریہ سماجی بھائیوں کی طرح نہایت سیدھی سادھی تھی

لیکن انہوں نے دماغ نہایت روشن اور سلجھا ہوا پایا تھا۔ مزاج میں بُردباری مصالحت ۔ آشتی اور امن پسندی تھی۔ عملی سیاسیات کے سمجھنے اور برتنے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ پہلو میں دل اور دل میں قوم کا درد رکھتے تھے۔ جذباتی اظہار سے عاری تھے۔ عملی کام کے جوش کی کوئی حد نہ تھی قومی خدمت کے جذبہ کا جوش ہی اُن کی ریاضت وعبادت تھی اور اس میں نفس کشی اور انہماک اُن کی عادت و خصلت اُن کی زندگی کا روزمرہ اُن کی شخصیت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

پو پھٹتے پھٹتے بستر سے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ چند لمحے ہری اوم کا ورد کرتے اور شاید گایتری کا منتر بھی پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی پوجا پاٹ یا ریت رسم سے اُنہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ دن نکلنے سے پیشتر کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے۔ نوکر ایک مرادآبادی قلعی کے گلاس میں جو ان کے ڈیل ڈول سے مناسبت رکھتا تھا، دودھ یا لسی لا کر دیتا تھا اسے ختم کر کے موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر ٹہلنے نکل جاتے۔ سول لائنس کی طرف تین چار میل کا چکر روز لگاتے۔ واپسی پر میونسپلٹی کے کام کے اگر موقع دیکھتے ہوتے تو اُنہیں دیکھتے ہوئے یا کسی کمیٹی یا سب کمیٹی کی میٹنگ ہوتی تو اُسے نبٹاتے ہوئے ۸ ½ یا ۹ بجے تک واپس آتے۔ کمرے کی برابر والی چھت پر آرام کرسی پر دراز ہو کر صبح کی ڈاک دیکھتے اور پڑھتے۔ اخباروں کے لئے کاتبوں اور کمپوزیٹروں کو کام بتاتے۔ ایک بنگالی بابو اخبار ایڈووکیٹ کے سب اڈیٹر تھے اُنہیں بھی بلا کر ہدائتیں دیتے۔ اس عرصہ میں اگر کوئی ملنے والا آگیا تو اُس سے بھی باتیں کرتے جاتے۔ گیارہ بجے اُٹھ کر غسل کرتے اور آدھ گھنٹے

کے لئے زنانخانہ میں جا کر کھانا کھاتے جو بہت سادہ ہوتا تھا۔ پھر ۱۲ بجے دن سے شام کے ۶ بجے تک قمیص پائجامہ پہنے میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے رہتے۔ میونسپلٹی کی فائلوں کا دیکھنا اور نپٹانا۔ شہر کے امپرووMنٹ کے قصے قضیوں کا طے کرنا اخبار کے لئے ایڈیٹوریل لکھنا۔ کونسل کے لئے سوالات کا بھیجنا اور تقریر تیار کرنا۔ چھاپے خانے والوں اور دفتر کے اہلکاروں سے نبٹنا اور حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنا۔ غرضکہ کامل چھ گھنٹے ان کاموں میں صرف ہوتے تھے۔ بیچ میں صرف دو بجے ایک گلاس پانی پیا کرتے تھے۔ ان کی نشست کا کمرہ خاصہ بڑا تھا اور چھت کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ لکڑی کے شیشے دار دروازے تھے۔ اور چاروں طرف ٹین کے سائبان مئی جون کے مہینوں میں لو کے جھونکے اور دھوپ کی تپش کمرے کو جھلساتی رہتی تھی۔ ایک بوڑھا پنکھے والا اونگھ اونگھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچتا تھا۔ لیکن ان کو نہ لو اور تپش سے پریشان ہوتے دیکھا نہ پنکھے والے کی شکایت کرتے۔ غالباً ان کا دماغ اور دھیان کام میں اس قدر منہمک ہوتا تھا کہ انہیں کسی تکلیف کا حس بھی نہیں ہوتا تھا۔ شام کے ۶ بجے پیپلز ایسوسی ایشن جاتے وہاں پالٹکس پر گفتگو رہتی۔ کبھی کبھی کمیٹی کے جلسے بھی ہوتے۔

وہاں سے اُٹھ کر اور فٹن پر بیٹھ کر بہرا خوری کو نکل جاتے۔ یہی اُن کی تفریح تھی۔ اور یہی اُن کا شغل۔ واپسی پر کھانا کھا کر پھر لیمپ کے سامنے بیٹھتے پانیر اور لیڈر پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگتے اور دس بجے سے پہلے ہی بستر پر جا کر سو جاتے۔ میں نے انہیں کبھی کوئی سیر و تفریح کرتے یا کھیل کے کام میں مشغول نہیں دیکھا۔ گھر بار کی دیکھ بھال ان کے چھوٹے

بھلائی کے پیر دھتی اور ان کی ذات قومی خدمت کے لئے وقف۔
ہمارے من مانے ہیرو یا وہ بڑے بڑے لیڈر کہ جو ہمیں اپنے آدرشوں سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں جن کی ہماری نگاہوں میں بڑی قدرو منزلت ہوتی ہے اور ہم ہر دم جن کا دم بھرا کرتے ہیں۔ جب ہم سے قریب تر ہوتے ہیں جب ہمیں اُن سے سابقہ پڑتا ہے اور اُنہیں برتنا پڑتا ہے تو روزمرہ کا تجربہ ہے کہ اُن کی شخصیت پھر اتنی جاذب نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری نگاہوں میں ان کی قدرو منزلت گھٹنے لگتی ہے اور ان کی قلعی کھلنے لگتی ہے۔ چاندی سونے کی طرح یہ ملمع بھی ماند پڑنے لگتا ہے لیکن ایسی ہستیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو دور سے ہمیں اپنی طرف راغب نہیں کرتیں۔ ان میں ہمارے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی لیکن جب ہمیں ان سے سابقہ پڑتا ہے اُنہیں برتنے کے موقعے ملتے ہیں تو ہماری نگاہوں میں اُن کی قدرو منزلت پیدا ہو جاتی ہے وہ ہمیں عزیز معلوم ہونے لگتی ہیں حتیٰ کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ ہمارے دلوں میں اپنا گھر بنا لیتی ہیں۔ گنگا پرشاد ورما کی ہستی بھی ایسی ہی ہستی تھی۔ پودا ابھی پوری طرح پھلا پھولا نہ تھا عمر صرف پچاس کی تھی کہ خزاں موت کے روپ میں آئی اور اسے برباد کر گئی۔ لکھنؤ والوں نے اس موت پر ماتم بپا کیا جلسے میں ہزاروں کا اژدحام تھا۔ ایک خلقت ان کے نام اور کام کی یاد میں آنسو بہاتی تھی، چک بست نوحہ خواں ہوئے۔ کیا خوب (اور کتنا سچ) کہا ہے کہ ؎

روشنی جس سے تھی ہر سو وہ ستارہ ڈوبا
مٹ گئی شام اودھ قوم کا تارہ ڈوبا

یہ دنیا کیوں دیوانی ہو رہی ہے؟ [۱]

آج جو ہنگامہ دنیا میں برپا ہے۔ لوگوں کے سروں پر جو جنون سوار ہے اور کشت و خون کا بازار گرم ہے تو سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا کو ہوا کیا ہے۔ یہ کیوں دیوانی ہو رہی ہے؟ اس کا جواب نہ مختصر ہے نہ آسان۔ ریڈیو کے بازیگر کہتے ہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر کے دکھلاؤ اور شرط یہ ہے کہ پندرہ منٹ میں ظاہر ہے کہ بات ان ہونی ہے۔ ہو نہیں سکتی۔ مگر جب غرض محض دل بہلانے سے ہے تو میں بھی چلو بھر پانی کوزے میں ڈال کر چھینٹے دئے دیتا ہوں۔ دل لگی ہو جائے گی۔ اگر مایوس ہو کر آپ خفا بھی ہوں گے تو مجھے شکایت نہ ہوگی۔ ممکن ہے کہ ان چھینٹوں سے دماغ چوکنا ہو جائے اور آپ اس گتھی کے سلجھانے میں لگ جائیں تو ایک پنتھ اور دو کاج والی مثل ہوگی۔ دل بھی بہل جائے گا اور کام بھی بن جائے گا۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو سدا سے ہوتا چلا آیا ہے۔ زمانہ برابر کروٹیں بدلتا ہی رہا ہے۔ حکومتیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ تہذیبیں ابھرتی ہیں اور مٹتی ہیں۔ کل تک جو ستارے نظر سے اوجھل تھے آج چمک رہے ہیں اور جو کل تک چمکتے تھے آج ماند پڑے ہیں۔ قدرت کے یہ سب کھیل تماشے ہزاروں برس سے ہو رہے ہیں اور نہ معلوم کب تک ہوتے رہیں گے۔ اس بھید کی تھاہ ابھی تک کسی کو نہیں ملی، لیکن دماغ والے لوگوں اور

[۱] یہ مضمون ۵؍ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا۔

باریک بین نگاہوں نے اس بات کا پتہ ضرور چلایا ہے کہ زمانۂ جاہلیت اور پیدائش کے اول روز سے لے کر تہذیب کے اس دور اور آج تک انسان گرتا پڑتا۔ چلتا اور سنبھلتا آہستہ آہستہ برابر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ اور کل کا یہ بن مانس آج انسانیت کا جامہ پہن کر اب خدائی کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔ کائنات قدرت کی لا محدود وسعت اور اس کی ڈراؤنی اور غارتگر طاقت کے آگے جو اٹل اور امر ہے اس بے بساط ہستی کا جو آج ہے اور کل نہیں اس طرح مقابلے کے لئے کھڑا ہو جانا ظاہرا مسخرے پن کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ اس پہلی نافرمانی کے جوش نے جس کے الزام میں بابا آدم جنت سے نکلے اور دنیا کے بسانے پر مجبور ہوئے اور جو ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو کر نسلاً بعد نسلاً تازہ ہوتا رہا ہے۔ بڑے بڑے کارنمایاں کئے ہیں۔ موجودہ تہذیب و تمدن کا یہ چمتکار جو دنیا کی آنکھوں کو آج چوندھیا رہا ہے آخر کوئی معجزہ یا جادوگری تو ہے نہیں۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت اور اصلیت ہے کہ جس سے ہم اور آپ روز دو چار ہوتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انسانی عقل و دماغ ہی کی مجموعی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ہزاروں برس ہوئے کہ انسان نے اپنی عقل و دماغ کے بل بوتے سے اس عمارت کی بنیاد ڈالی تھی۔ صدیوں کی کاوشوں کے بعد اس نے بتدریج اس کی ایک ایک منزل اٹھائی حتیٰ کہ آج آسمان سے باتیں کرنے والی یہ عمارت ہم کو حیرت میں ڈال رہی ہے۔ سائنس کی کرشمہ سازی اور جلوہ گری نے پچھلے سو دو سو برس میں اس کو اور چار چاند لگائے

ہیں۔ اس کے مفصل بیان کی نہ ضرورت ہے نہ یہاں گنجائش۔ کیا یہ
کوئی چھوٹی سی بات ہے کہ لکھنؤ میں بیٹھا ہوا میں آپ سے باتیں کر رہا
ہوں اور آپ سینکڑوں میل کے فاصلہ پر میری آواز سُن رہے ہیں؟
اب تک کہا جاتا تھا کہ صرف زندگی اور موت کا مسئلہ ہی انسانی
قابو کے باہر ہے ورنہ یہ خاک کا پُتلا سچ مُچ خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا۔
سائنس والے اب دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مردہ قالب میں بھی جان ڈال
سکتے ہیں اور مردے کو ازسرِ نو جلا کر انسان کو امر بنا سکتے ہیں البتہ یہ اُلجھن
اُن کو ضرور ہے اور اس کا جواب ان کے پاس بھی نہیں کہ یہ مٹ جانے
والی ہستی جب اس وقت یہ ستم ڈھا رہی ہے تو امر اور اٹل ہو کر کیسی
کچھ قیامت نہ برپا کرے گی۔ مختصراً غرض کہنے کی یہ ہے کہ موجودہ دورِ تہذیب و
تمدن میں انسانی عقل و دماغ نے جو اوجِ کمال آج حاصل کیا ہے وہ
پہلے کبھی نہ دیکھا گیا نہ سُنا گیا تو پھر کیا بات ہے کہ با وصف اس سب
کے انسان آج بھی اپنی حیوانیت حرص و ہوس، بغض و حسد، بے رحمی و
خونخواری اور جنون سے مجبور ہو کر وہ قیامت خیز ہنگامہ برپا کئے ہوئے
ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس پیمانے پر اس کی مثال ملنی مشکل ہے؟
بات یہ ہے کہ حضرت انسان بھی ایک چیز ہیں۔ عقل۔ دلیل اور منطق کا
جادو ان پر چلتا ہے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ ان کے حیات و
جذبات کو اس سے ٹھیس نہیں لگتی۔ اپنی ازلی عریانی کو انہوں نے
تہذیب و شائستگی کے جامے سے ڈھانپ ضرور لیا ہے اور دیکھنے میں
خاصے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن برتنے سے یہ قلعی کھُل جاتی ہے
اور حرص و ہوس۔ خودی اور حیوانیت کا ازلی جوش صاف جھلکنے لگتا ہے۔

تہذیب و تمدن کی مختلف منزلیں طے کر کے انسان نے انسانیت کا درجہ اس معنی میں حاصل کر لیا ہے کہ اس کا دماغ تعلیم و تربیت کی روشنی کا اثر قبول کرتا ہے وہ اپنے دماغ کی قوت سے آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے اس کے تخیل کی بلند پروازی اس کو ساتویں آسمان سے بھی پرے پہنچا دیتی ہے اور اس کی عقل و دانش کے کرشمے بعض اوقات ہم کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں لیکن چونکہ ابھی تک حسیات و جذبات میں لطافت و پاکیزگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے اور اخلاق و روحانیت کا وہ عنصر جسے انسانیت کہتے ہیں بہت کمیاب ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نانک دکھیا سب سنسار اچھا ہے یا بُرا اس سے بحث نہیں اصلیت یہ ہے کہ خودی و حرص انسان کی ازلی سرشت ہے۔ دنیا میں آکر اپنے قدم جمانا، گھر بار بسانا، ملکیت اور دولت پیدا کرنا، مرتبہ اور اختیار حاصل کرنا انسان کی ایسی سرشت ہے جو عارضی حوادث کا اثر نہیں بلکہ اس کے رگ و ریشہ اور خون و پوست میں سرایت کئے ہوئے ہے پیمبران دین اور مصلحان قوم نے فقر و فاقہ کا وعظ دیا۔ ارتقا تہذیب و تمدن کے دور نے شائستگی کے ساتھ ہی ساتھ سادگی کی زندگی کا معیار پیش کیا۔ تعلیم و تربیت نے انسان میں صلاحیت کا مادہ پیدا کیا اور دنیا نے پچھلے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس کے زمانہ میں ترقی کی کئی منزلیں طے کیں لیکن انسان ابھی تک اپنی ازلی سرشت کو بھولا نہیں ہے۔ روزمرہ تو وہ انسانیت کے جامے میں نظر آتا ہے لیکن جب ازلی جوش حیوانیت کا دورہ آپڑتا ہے تو پھر وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اُس وقت انسان و حیوان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے

کہ آدمی میں انسانیت کا نشو و نما ابھی صرف ادھورا ہوا ہے۔ عقل و دماغ نے تو اوج کمال کا درجہ حاصل کر لیا ہے لیکن دل میں درد کی کیفیت سے جو لطافت و پاکیزگی جذبات میں پیدا ہوتی ہے وہ ٹھٹھر کر رہ گئی ہے۔ اپنے جذبات و حسیات پر انسان کو وہ قدرت و قابو ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے کہ جس کی اس دور تہذیب میں اُس سے توقع کی جاتی تھی ہمیں اپنے دونوں قدم زمین پر جمائے کھڑے رہنے اور سامنے دیکھنے کی عادت ابھی نہیں پڑی ہے۔ ہماری ہیئت بالکل اُس شخص کی سی ہے کہ جو ایک ٹانگ پر کھڑا آسمان کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہو اور ہوا میں جھونکے کھا رہا ہو۔ مختصراً ہمارے تہذیب و تمدن میں چمک اور دمک تو کافی ہے لیکن توازن جسے انگریزی میں (Balance) کہتے ہیں اور جس سے پائداری حاصل ہوتی ہے اور عز و شان میں اضافہ ہوتا ہے قریب قریب غائب یا بالکل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے جو آج دُنیا دیوانی ہو رہی ہے۔ نئی تہذیب کی اس کیفیت سے جو لوگ بیزار ہیں اور جنھوں نے روشن دماغ اور درد مند دل پایا ہے وہ اپنے اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق دنیا کی اس دیوانگی کے چارہ ساز ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کے بندوں نے جب خدائی کو بھلا دیا اور انسانیت روحانیت کے اصولوں اور عقیدوں سے مُنہ موڑ کر کفر و الحاد کے رنگ میں ڈوب گئے تو نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ خیال سچائی سے خالی نہیں۔ ایک حد تک صحیح ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر مذہبی جوش اور مذہبی تعلیم کو از سر نو تازہ کیا جائے۔ اگر کفر و الحاد کی جگہ مذہب

پھڑے سے تو دنیا جہنم نہیں جنت ہو جائے گی۔ کون جانتا ہے۔ ممکن ہے۔ لیکن دنیا کی تاریخ سے جو تجربہ ہم کو حاصل ہوا ہے وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی پچھلی دو ہزار برس کی زندگی میں ہمارا تہذیب تمدن صدیوں تک مذہبیت کے رنگ میں کامل طور سے ڈوبا رہا۔ مذہب ہی کا دور دورہ اور مذہب ہی حکومت رہی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صلیبی جنگ کی خونریزیاں، ریفرمیشن کے زمانہ میں سینٹ بارتھولومیو والے دن کا قتل عام اور لارڈ شیل کی معرکہ آرائیاں، انکیوزیشن (مذہبی محاسبے) کے مظالم اور آج خود ہمارے ملک میں ہندو مسلم فسادات، مذہبی جوش اور مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ یہ بحث دوراز کار ہے کہ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

مان لیا کہ مذہب کے اصولوں اور عقیدوں کا قصور نہیں بلکہ اُس زمین کا قصور ہے کہ جس میں یہ بیج بویا گیا تھا۔ نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یعنی محض مذہبی جوش، مذہبی تعلیم اور مذہبی ذہنیت سے ہمارے تہذیب و تمدن میں جس بات کی کمی ہے پوری نہیں ہوتی اسی سے ملتا جلتا عقیدہ وہ ہے کہ جسے پرانے زمانے کے ہندو "اہنسا پرمو دھرمہ" کے منتر سے یاد کیا کرتے تھے اور جس نے آج مہاتما کی اصطلاح میں (Truth & nonviolence) کے نام سے رواج پایا ہے۔ یہ عقیدہ اور ایمان کم از کم ہندوؤں میں بہت پرانا ہے۔ تمام قوم نے اسی عقیدے اور ایمان میں نشو و نما پائی ہے۔ یہ ہمارے رگ و خون میں اس طرح پیوست ہو گیا ہے کہ آج

یہ ہماری فطرت میں شامل ہے کون سمجھ دار شخص ایسا ہے جو اپنے
اصول و عقیدہ کے بہترین ہونے سے انکار کر سکے۔ یہ ثابت کرنا
کہ کوئی اور فلسفہ یا معیار بہ حیثیت فلسفہ و معیار کے اس پر فضیلت
لے جا سکتا ہے آسان کام نہیں اگر کسی اصول و عقیدہ کی پیروی
انسان کو فرشتہ یا کم از کم فرشتہ سیرت بنا سکتی ہے تو بلا شبہ
یہی اصول و عقیدہ اس معجزے کو کر کے دکھا سکتا ہے۔ پُرانے زمانے
میں مہاتما گوتم بدھ، حضرت عیسیٰ مسیح اور موجودہ زمانے میں ٹالسٹائے
اور مہاتما گاندھی کی ہستیاں اس کا ثبوت ہیں۔ اس سے کوئی سمجھ دار
آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ اور باتیں بھی سوچنے
کی ہیں۔ اصول و فلسفہ انسانی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے ہے
یا انسان اصول و فلسفہ کی پیروی کے لئے پیدا کیا گیا ہے ہم انسانوں
کی دنیا بسایا چاہتے ہیں یا فرشتوں کی؟ دنیا کی کروڑوں، اربوں
بلکہ سنکھوں کی آبادی نے پچھلے دو تین ہزار برس کی زندگی میں
کتنے فرشتے یا فرشتہ سیرت انسان پیدا کئے؟ دو ہزار برس ہوئے
حضرت عیسیٰ مسیح نے تلقین کی کہ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی طمانچہ
مارے تو تم دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دو آج مسیح کے نام لیوا
کروڑوں کی تعداد میں ہیں لیکن کرتے بالکل اس کے برخلاف ہیں شاید
حوادث روزگار (Truth & nonviolence) کی
اس تلقین کے لئے موافق نہ تھے۔ یورپ اور امریکہ کی زمین اس بیج کے
لئے بنجر ثابت ہوئی۔ مسیح نے جو کچھ کہا اکثر عیسائیوں نے اس کان
سُنا اور اُس کان نکال دیا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس اصول و

عقیدہ کی اشاعت کے لئے کافی موقع نہ ملا۔ لیکن جہاں تک کہ "اہنسا پرمو دھرمہ" کے اصول و عقیدہ اور ہندو قوم اور آریہ ورت کا تعلق ہے یہ نہیں کہا جا سکتا۔ پراچین آریہ ورت کا تہذیب و تمدن تو روحانیت کے رنگ میں شرابور تھا۔ "اہنسا پرمو دھرمہ" تو گویا ہر ہندو بچے کی گھٹی میں گھلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ اصول و عقیدہ ہمارے رگ و ریشے میں پیوست ہو چکا ہے۔ گوشت کھانا ہمارے یہاں اگر سب میں بڑا نہیں تو کم از کم بہت بڑا پاپ ہے۔ کروروں ہندو گوشت کھانے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ گائے کی عظمت ایسی ہے کہ ہندو اس کے لئے جان دینے سے دریغ نہیں کرتا۔ حد ہو گئی کہ سانپوں کو دودھ پلاتے ہیں، ناگ پنچمی کے دن کو تہوار کا مرتبہ حاصل ہے۔ ہمارے لئے اعلیٰ خیالی اور سادگی وضع یا (Plain living & High Thinking) محض زبانی داخلہ نہیں۔ مدراس میں قابل سے قابل واجب تعظیم بزرگوں کو بیس پچیس برس سے زیادہ نہیں ہوئے کہ اپنی آنکھوں سے ننگے سر اور ننگے پاؤں ایک دھوتی تمام بدن پر لپیٹے ہوئے سر بازار گزرتے دیکھا اور ان کے تمام رہن سہن اور روزانہ زندگی کو ایسی ہی سادگی کا نمونہ پایا۔ ہم نے تو دُنیا سے کبھی دل لگایا ہی نہیں اور اس کو محض فریب، مایا یا چلتی پھرتی دھوپ چھاؤں سمجھا کئے۔ کہا جاتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کو بھول گئے۔ یہاں تو ہم دنیا والے دنیا میں رہ کر دنیا کو ہی بھول گئے۔ ہم نے تو "اہنسا پرمو دھرمہ" کی ایسی لگن لگائی کہ مردانگی کے جوہر، قوم کا وقار اور آزادی کی نعمت تک اس دھن پر سے نثار کر دی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ ایک ہزار برس سے

جن حالوں جیتے ہیں ظاہر ہے نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں بے حیائی کے زندگی کے دن تیر کرتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ نئی تہذیب ہم کو شیطان بنا کر چھوڑے گی تو پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری پرانی تہذیب نے جُگ اسی کوشش میں بتائے کہ کسی طرح انسان کو فرشتہ بنا کے چھوڑے۔ درحالیکہ دُنیا کو ایسی تہذیب و تمدن کی ضرورت ہے کہ جو آدمی کو انسانیت کا سبق دے اور انسان بنا سکے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے کہ انسان دل، دماغ اور جسم تینوں سے مل کر بنا ہے اور اس کے صحیح ہونے میں شک کی گنجائش بھی نہیں تو دنیا میں وہی تہذیب و تمدن صحیح معنوں میں پھل پھول سکتا ہے اور ہم کو اسی کی ضرورت ہے کہ جو انسان کی جسمانی، دماغی اور روحانی یا جذباتی نشو و نما بحیثیت مجموعی بدرجۂ کامل کر سکے۔ پُرانی تہذیب کا پلڑا ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ نئے تمدن کا پلڑا دوسری طرف جھک رہا ہے۔ توازن نہ پُرانی تہذیب میں تھا نہ نئے تمدن میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی تہذیب ناکام رہی اور مٹ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نئے تمدن نے دنیا کو دیوانہ کر رکھا ہے۔ ہمارے تہذیب و تمدن کے دونوں پلڑوں میں توازن (Balance) کس طرح اور کب تک قائم ہو سکے گا۔ کون جانتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے۔ فیض قدرت سے آپ کو دل و دماغ کی نعمت ملی ہے۔ سوچئے سمجھئے اور جو کچھ سمجھ میں آئے اُس پر عمل کیجئے۔

انجمن کی نئی کتابیں

پرچھائیں آصف علی صاحب گورنر اڑیسہ کے قلم کا ایک ادبی شاہکار، فلسفۂ حیات اور اُس کے حقائق شاعرانہ تخئیل کے پردے میں۔
اعلیٰ قسم کے کاغذ پر بہترین ٹائپ کی طباعت، قیمت چار روپے

یادگارِ حالی بیگم صالحہ عابد حسین کی مرتب کی ہوئی سوانح عمری جس میں حالی کی سیرت اور ان کی شاعری کے بہت دلچسپ پہلو واضح کئے گئے ہیں۔
قیمت چار روپے چار آنے

حیاتِ اجمل مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی وہ سوانح عمری جس کا عرصہ سے انتظار تھا اب تیار ہوگئی ہے۔ اس کو قاضی عبدالغفار صاحب نے مرتب کیا ہے۔ تقریباً چھ سو صفحات میں حکیم صاحب کی سیاسی اور اخلاقی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مرحوم ہندوستان کے ان چند بڑے قومی لیڈروں میں سے ایک تھے جنھوں نے آزادیٔ ہند کا نقشہ بنایا تھا اور اپنا سب کچھ اسی مقصد پر قربان کر دیا تھا۔

حیاتِ اجمل صرف حکیم صاحب کی سوانح ہی نہیں ہے، بلکہ اس کتاب میں تقریباً بیس سال کی قومی جد و جہد کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ اس زمانے کے ماحول کی صحیح تصویر میں حکیم صاحب کی عظیم الشان شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ
قیمت آٹھ روپے آٹھ آنے